

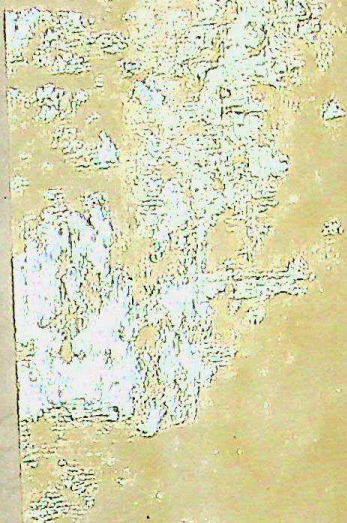
واجدی شاہ



سید حسن رضا ادیب

Channel

ناشہ
آل انڈیا میراکاڈمی
کلکتہ



جذبی

CC-O. In Public Domain. Digitized by eGangotri Trust

12/5/91

تاجید اعلیٰ شاہ

لے رکن - سید محمد مراد حسن ریجیو اعلیٰ

طراشاک - آملہ انڈیا میڈل سکاڈمی . لے رکن

کیست - 80/-

سُلطانِ عَالَم
واجِد علی شاہ
(ایک تاریخی مرقع)

سید مسعود حسن ضوی ادیب

== ناشر ==

آل انڈیا میراکاڈمی لکھنؤ

Channel eGangotri Urdu

یکے انہ مطبوعہ آں انڈیا میرا کا ڈھی لکھنؤ

جملہ حقوق (مع ترجمہ) بحق ناشر محفوظ ہیں

کتاب : سلطان عالم داجد علی شاہ
مصنف : سید سعید حسن رضوی ادیب
ناشر : آل انڈیا میرا کا ڈھی، لکھنؤ

پہلی اشاعت ۱۹۷۷ء ایک ہزار

قیمت : ۷۵

Revised Price
Rs. 40/-
KITABNAGAR

طباعت : نامی پریس، لکھنؤ
سرودق : نظام بین

تقسیم کار : کتاب نگر، دین دیال روڈ، لکھنؤ ۲۲۶۰۰۳

سُلطان عالم و اجد علی شاہ

فہرست

پیش نامہ: مقبول احمد لاری ۱۷ دیباچہ: مصنف ۱۹

پہلا حصہ

ابتدائی حالات طبعی خصوصیات ادبی خدمات

۶۵	مزار جب علی بیگ شہزاد کا بیان	۲۷	ولادت سے دلی عہدی تک
۶۵	مولوی عبدالحلیم شہزاد کا بیان	۲۷	واجد علی شاہ کی شادی
۷۲	واجد علی شاہ اور موسیقی کا شوق	۲۹	تخت نشینی
۷۳	بادشاہ کی بے تقصی	۳۰	پہلا شاہی فرمان
۷۴	مولانا شہر لکھنوی کا بیان	۳۱	امور سلطنت میں مصروفیت
۷۴	شہزاد کا دوسرا بیان	۳۳	دادرسی کا نیا طریقہ
۷۵	عہد و اجد علی کے ہندو منصب دار	۳۳	واجد علی شاہ کی فوجی سرگرمیاں
۷۷	بادشاہ کی علمی استعداد	۳۵	رہائے
۷۹	راجا درگا پر شاد مند مولوی کا بیان	۳۵	نجیبوں کی بٹالینیں
۸۲	واجد علی شاہ اور شاہی کتب خانہ	۳۵	تنگوں کی بٹالینیں
۸۷	سلیمان جاہ نصیر الدین حیدر کی ہمر	۳۵	توب خانے
۸۷	حمز علی شاہ کی ہمر	۳۹	شہر کی تزئین
۸۷	واجد علی شاہ کی ہمر	۴۰	بادشاہ کے طویل بیماری
۸۷	واجد علی شاہ کی ہمر	۴۳	دعا گوئی
۸۸	بادشاہ کا تصنیف تالیف میں انہماک	۴۴	شاہ جن کا تفسیر
۹۵	ایک شیعہ کا اذالہ	۴۹	بادشاہ کے صورت اور سیرت
۹۷	شاعری اور شاعرانہ کی قدر دانی	۶۰	بادشاہ کے صاحب
۱۰۵	شاہی محل میں شاعرے	۶۵	صغیر بگڑی کا بیان

۱۵۰	عشق نامہ	۱۰۹	شعرا کی قدردانی انتزاع سلطنت کے بعد
۱۵۵	بحر ہدایت		ٹیپا برج میں بادشاہ کے رباری شعراء
۱۵۶	مباحثہ بین النفس والبعقل	۱۱۴	ادب شعرو سخن کے صحبیتیں
۱۵۹	صحیفہ سلطانیہ	۱۱۴	فتح الدولہ برقی
۱۶۰	ریاض القلوب	۱۱۵	ہفتاب الدولہ درخشاں
۱۶۱	صوت المبارک	۱۱۹	مرزا مسینا عیش
۱۶۳	بنی	۱۲۰	مرزا امداد علی یاد
۱۶۵	نابو	۱۲۱	منظر علی بہتر
۱۶۶	دلہن	۱۲۱	گلشن الدولہ مرزا علی بہار
۱۶۷	چینل نازنین	۱۲۲	مالک الدولہ صولت
۱۶۸	رسالہ موسیقی	۱۲۶	حامد اللہ برتبر
۱۶۸	گلرستہ عاشقان	۱۲۶	صادق علی مالک
۱۶۹	دیوان دوم	۱۲۷	مرزا اہمان قدر نیر
۱۷۰	دیوان ثالث	۱۲۸	مرزا آسمان جاہ انجم
۱۷۰	نظم نامور	۱۲۸	حامد علی مرزا کوکب ولی عہد
۱۷۱	دیوان بے نام (سخن اشرف)	۱۲۹	تذکرہ شعرا بادشاہ کے قلم سے
۱۷۲	قمر مضمون	۱۳۳	بادشاہ کے چند منتخب اشعار
۱۷۳	مالک اختر	۱۳۵	بادشاہ کے کتابوں کے ستیری حاء
۱۷۷	تصائد مبارک	۱۳۵	دستور داعبدی
۱۷۷	دیوان مبارک اول	۱۳۶	جواب ادب بلوہک
۱۷۸	مجموعہ مبارک سہیہ شیوع فیض	۱۴۰	ارشاد خاقانی
۱۸۱	مجموعہ منظومات اختر	۱۴۲	جوہر عرض ۱
۱۸۱	مجموعہ رباعیات اشعار متفرق وغیرہ	۱۴۲	جوہر عرض ۲
۱۸۱	سزن اختر	۱۴۴	نصارحہ اختر
۱۸۳	نہات القلوب	۱۴۵	مجاہدہ اختر
۱۸۵	ہسبت حیدری	۱۴۵	مجموعہ داعبدی سلطانی
۱۸۸	ہسبت حیدری طبع دوم	۱۴۵	رسالہ داعبدی سلطانی
۱۹۰	منوی عشق نامہ	۱۴۸	ملاذ الکلمات

۲۲۱	تاریخ غزوالہ	۱۹۳	ثنوی خاقان سردر
۲۲۲	تاریخ مشغلہ	۱۹۴	ثنوی بحر مختلف
۲۲۲	خطوط داجد علی شاہ بنام نواب اہکیم (تاریخ)	۱۹۵	ثنوی بے نام
۲۲۲	مذہب (۹)	۱۹۵	تین روہانی مثنویات
۲۲۳	گلدستہ محبت	۲۰۰	افانہ عشق
۲۲۳	اشعار التذاریع	۲۰۲	دریائے عشق
۲۲۴	ہیکات اودھ کے نامہ نویسی	۲۰۴	دریائے عشق (دوسرا ایڈیشن)
۲۲۶	خطوں کا طرز نگارش	۲۰۶	بحر الفت
۲۳۱	بادشاہ کی بعض کتابوں کی شرحیں	۲۰۸	ہوشیوں کے مجموعے
۲۳۱	مواہب سبحانیہ فی شرح صحیفہ سلطانیہ	۲۰۸	توشہ آخرت
۲۳۱	شرح مباحثہ بین النفس والعقل	۲۱۰	ریاض العقبی
۲۳۱	شرح جوہر عروض	۲۱۰	مقتل معتبر
۲۳۱	شرح مضامین اختصری	۲۱۰	مجموعہ مرانی
۲۳۱	نغمہ قدسی (شرح صوت المبارک)	۲۱۰	مجموعہ مرانی (مطبوعہ مطبع سلطانی)
۲۳۱	روز تہذیبات (شرح ہدایت السلطان)	۲۱۰	دفتر غم و بحرالم
۲۳۲	شرح ارشاد السلطان	۲۱۱	مرثیہ ("روشنی شہ دیں...")
۲۳۳	بعض کتابیں جو بادشاہ کے لیے یا ان کے حکم سے لکھی گئیں	۲۱۱	مرثیہ نو ("مردش غیب نے...")
۲۳۳	ردفہ الصفا (ترجمہ اردو)	۲۱۱	دفتر پریشان
۲۳۳	مفید الاذہان	۲۱۲	ایمان
۲۳۳	اشراق اختصری	۲۱۲	ایمان (طبع دوم)
۲۳۴	مفاتیح خاقانی	۲۱۳	خطوط کے مجموعے
۲۳۴	ہدیہ حسینیہ ترجمہ نمازیومیہ	۲۱۴	تاریخ مجبشیدی
۲۳۴	کوکب الدری فی بیان آیتہ الکوسی	۲۱۵	تاریخ ممتاز
۲۳۵	ترجمہ کتاب جان برنگی از کمال الدین حیدر	۲۱۶	تاریخ نادر
۲۳۵	ثنوی ممتاز	۲۱۸	تاریخ نادر (قلی)
۲۳۶	سرور سلطانی	۲۱۹	تاریخ فراق
۲۳۶	چشمہ حیات	۲۲۰	تاریخ بدر

۲۳۹	مطلع العلوم و مجمع الفنون	۲۳۷	صحت نامہ واجد علی شاہ
۲۳۹	ماہیت الفا	۲۳۷	تاج فراست
۲۴۰	تذکرہ آفتاب عالم تاب	۲۳۷	فیوض جلیلیہ سلطان عالم
۲۴۱	ضمیمہ : نظم طباطبائی اور داجد علی شاہ	۲۳۷	کتابیہ جو خلافت واقعہ بادشاہ سے
۲۴۲	بقلم ابوالخیر نودودی	۲۳۹	منسوب کردی گئی

== دوسرا حصہ ==

مظلومی معزولی جلا وطنی

۳۰۵	بادشاہ کی وفات	۲۴۷	ایٹ انڈیا کمپنی اور دہلی ریاستوں کا اتحاد
۳۰۸	بادشاہ کی تہنیت و تکفین	۲۵۵	ستیمین کا دورہ اودھ
۳۱۱	ٹیا برج کی تباہی	۲۶۳	بادشاہ کی معزولی اور اودھ کا الحاق
	ضمیمہ ۳۱۶	۲۷۰	بادشاہ کا سفر کلکتہ
۳۱۷	ضمیمہ الف : داجد علی شاہ کی تاریخ ولادت	۲۷۸	وزیر عظم نواب علی نقی خان بہادر
۳۲۰	ضمیمہ ب : دستورات واحدی ۶۶ دستور	۲۸۲	برہمچس قدر کی بادشاہی
۳۲۳	ضمیمہ ج : داجد علی شاہ اور گورنر جنرل کی ملاقات	۲۸۵	بادشاہ ٹیا برج میں
	ضمیمہ د : ایکٹ ۷۷-۱۸۶۷ء "ایکٹ بہ مراد"	۲۸۹	نیکو کشہ کا سفر انگلستان
۳۲۷	ہنگوشت منزل ذاتی شاہ اودھ کے	۲۹۱	بادشاہ قید فرنگ میں
	ضمیمہ ۵ : انگریزوں کی زیادتیاں، نا انصافیاں	۲۹۳	بادشاہ کے حفظ مراتب کے لیے قانون
۳۳۰	اور وعدہ خلافیاں، بادشاہ کے قلم سے	۲۹۵	ٹیا برج میں شاہی مدرسے
۷	ماخذوں کی فہرست	۲۹۷	ٹیا برج کا جالور خانہ
	ماقم یک شہر آرزو : از مقبول احمد لاری، صدر	۳۰۰	بادشاہ کی مالی پریشانیاں
۳۳۲	آل انڈیا میسر کا ڈھٹی	۳۰۲	ٹیا برج میں آتش زدگی

سُلطانِ عالمہ کا جَدِ علی شہادۂ ماخوذوں کی فہرست

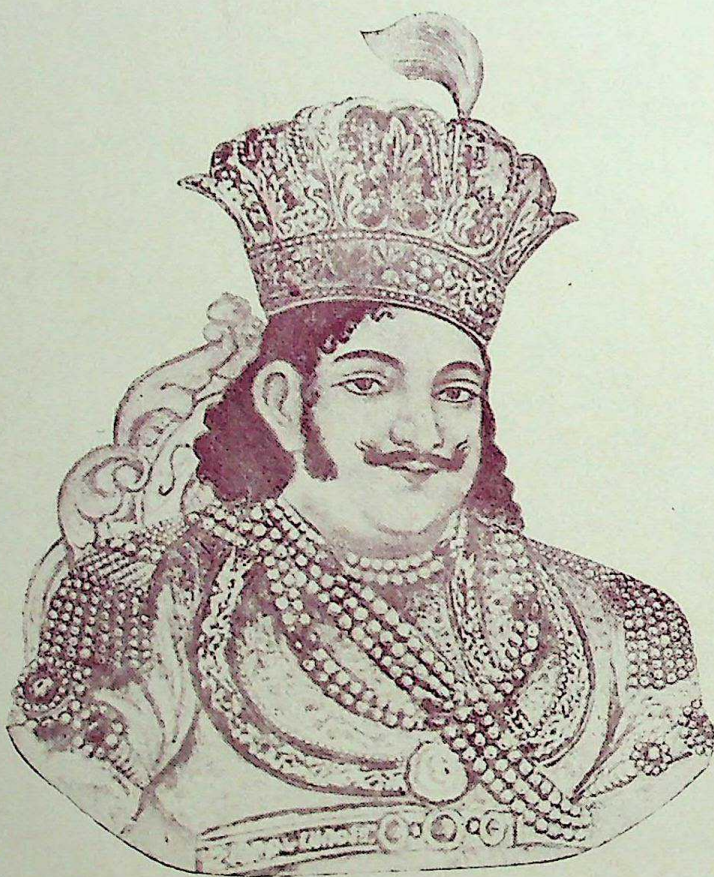
- ۱۔ آخری تاجدار اودھ : محمد تقی احمد - ناشر : دانش محل، کھنؤ ۱۹۳۵ء
- ۲۔ آفتاب اودھ : مرزا محمد تقی - مخطوطہ کھنؤ پونی ڈسٹی میگورالائبریری
- ۳۔ احسن التواریخ : منشی رام سہاے تنہا - مطبع تمنائی، کھنؤ ۱۸۷۶ء
- ۴۔ ادب کا مقصد : ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی - ناشر : ہندوستان کتاب گھر، کھنؤ ۱۹۵۶ء
- ۵۔ ادبی مخطوط غالب : مرتبہ مرزا محمد عسکری - نظامی پریس، کھنؤ ۱۹۲۹ء
- ۶۔ ادشاد خان خانہ : ذاجد علی شاہ اختر - مطبع سلطان، کھنؤ ۱۹۶۹ء
- ۷۔ اسٹیٹسمین (اخبار) کلکتہ : مورخہ ۲۲ مئی ۱۸۸۶ء
- ۸۔ اسٹیٹسمین (اخبار) : کلکتہ، مورخہ ۲۲ ستمبر ۱۸۸۷ء
- ۹۔ اسرارِ واجدی : دبیر الاناناشی محمد ظہیر الدین خاں بیگماتی - مخطوطہ کھنؤ پونی ڈسٹی میگورالائبریری (تصنیف ۷۸-۱۲۶۶ھ)
- ۱۰۔ اشراقِ اختیاری : رفعت الدولہ، رفیع الملک، کاتب الملوک، منشی سید محمد شفیع الرضوی - مطبع سلطان کلکتہ ۱۲۹۲ھ/۱۸۷۵ء
- ۱۱۔ اعمال نامہ : سر سید رفقا علی
- ۱۲۔ افسر التواریخ : (مخطوط) مرتبہ ذاجد علی شاہ اختر، ۱۲۷۵ھ - مخطوطہ ادیب
- ۱۳۔ الماس درخشاں : (دیوان مرزا حاتم علی بیگ تھر) - مطبع الہی، آگرہ ۱۸۹۵ء
- ۱۴۔ انتخاب اردو معلی : مرتبہ حسرت موہانی، اردو پریس، علی گڑھ
- ۱۵۔ انشائے راحت و رفح : منشی کبج بہاری لال آفتم - مطبع حسینی اشاعشری، کھنؤ ۱۲۸۷ھ
- ۱۶۔ انشائے سرور : مرزا حبیب علی بیگ سرور - مطبع نول کشور، کان پور
- ۱۷۔ انگلشیہ میوے (اخبار) : (بالواسطہ)
- ۱۸۔ اودھ، اٹس پرنسپل اٹس گورنمنٹ وندیکٹڈ : مولوی سید الدین کاکوروی، سفیر اودھ - مطبع لندن، ۱۸۵۷ء
- ۱۹۔ اودھ اخبار کھنؤ : مورخہ ۲۲ جنوری ۱۸۶۲ء
- ۲۰۔ " " " : مورخہ ۳ اپریل ۱۸۶۲ء

- ۱- اودھ اخبار : مورخہ، سنہ ۱۸۶۲ء
- ۲- اودھ اخبار : مورخہ ۴ جون ۱۸۶۲ء
- ۳- اودھ انڈر راجد علی شاہ : جی۔ ڈی۔ بھنگاگرہ - بھارتیہ و دیپاکاشن، دارالاسی ۱۹۶۸ء
- ۴- اودھ دلوک :
- ۵- اودھ پنشن پیورس :
- ۶- ایٹین ففٹی سیون : سریندر ناتھ سین - سرسوت پریس، کلکتہ ۱۹۵۷ء
- ۷- اے جرنل فقہ ودی کنگڈم آف اودھ : کرنل سلیم - لندن ۱۸۵۸ء
- ۸- ایکٹ ۱۸۷۲ء ڈایکٹ بہراؤچنداشت منزل ذاتی شاہ اودھ کے ")
- ۹- ایکٹ ۱۹۰۷ء
- ۱۰- اے کیٹلاگ آف دی عربک، پرشیاہ اینڈ ہندوستانی مینیوسکرپٹس آف دی لائبریری آف دی کنگ آف اودھ : مرتبہ اے۔ اشپرنگ - (جلداول) پیپٹ مشن پریس کلکتہ ۱۸۵۴ء
- ۱۱- ایمان : (سلام، رباعیاں وغیرہ) واجد علی شاہ اختر طبع اول - مطبع سلطان، کلکتہ ۱۲۸۸ھ
- ۱۲- ایمان : واجد علی شاہ اختر طبع دوم بہ اضافہ مطبع سلطان، کلکتہ ۱۳۰۱ھ
- ۱۳- بحرہدایت : واجد علی شاہ اختر - مطبع سلطان، کلکتہ
- ۱۴- برٹش ایگریوشن آف اودھ : صفی احمد - ۱۹۶۴ء
- ۱۵- بردز آف ویو آف انڈیا : سراسکن پیری (بالواسطہ)
- ۱۶- بنی : واجد علی شاہ اختر - مطبع سلطان، کلکتہ ۱۲۹۴ھ (تصنیف ۱۲۹۲ھ)
- ۱۷- بوستان اودھ : راجا درگا پرشاد تھرستولی - مطبع دبیر احمدی، لکھنؤ ۱۸۹۲ء
- ۱۸- بیاض سلامہاد و فوجیات : واجد علی شاہ اختر
- ۱۹- بیاض عشاق : (دیوان بادشاہ محل عالم) مطبعہ کلکتہ ۱۲۸۴ھ
- ۲۰- " " " " " " مطبع ناجی، لکھنؤ
- ۲۱- " " " " " " مطبع قمر بند، لکھنؤ
- ۲۲- بیاض یاد : شیخ امداد علی یاد، شاعر گروہ سمید (قلمی) ذخیرہ ادیب
- ۲۳- بیگمات اودھ کے خطوط : مرتبہ مفتی انتظام اللہ شاہانی، فاروقی پریس دہلی
- ۲۴- پرستان خیال : (پردہ اول صبح خندان، ترجمہ ہونان خیال) سید فرزانہ حمید مصطفیٰ بگرامی
- ۲۵- پوری خاندان : (ترجمہ عشق نامہ واجد علی شاہ) تحسین سردری - ناشر : مکتبہ نیازی، کراچی ۱۹۵۸ء
- ۲۶- " " " " " " کتاب کار بیگمات، رام پور ۱۹۶۵ء
- ۲۷- تاج فراست : از مصنف کتاب گرام (بالواسطہ)

- ۱۰- دستور واجدی: واجد علی شاہ اختر
 ۱۰۱- دفتر پیشانی: واجد علی شاہ اختر (بالواسطہ)
 ۱۰۲- دفتر غفر و جلالہ: واجد علی شاہ اختر مطبع دہلی احمدی، کھنڈ
 ۱۰۳- دہلی: واجد علی شاہ اختر مطبع سلطانی، کلکتہ ۱۲۹۰
 ۱۰۴- دہلی اردو اخبار: مورخہ ۲ راکت ۱۸۵۷ء
 ۱۰۵- دہلی جلسہ: (مرانی واجد علی شاہ اختر) کتابت محرم ۱۲۸۳ھ
 ۱۰۶- " " " " " " ۱۲۸۹ھ
 ۱۰۷- " " " " " " کتابت رمضان ۱۲۸۹ھ
 ۱۰۸- " " " " " " ذیحجہ ۱۲۹۳ھ
 ۱۰۹- دیوان بے نامہ: (سخن اشرف) واجد علی شاہ اختر
 ۱۱۰- دیوانہ ثالث: واجد علی شاہ اختر
 ۱۱۱- دیوان دوم: واجد علی شاہ اختر
 ۱۱۲- دیوان دوم دخت: نواب سید محمد خاں رند۔ مطبع مصطفائی مکان پور ۱۲۶۷ (۹)
 ۱۱۳- دیوانہ شہید: محمد بخش شہید کھنڈی (قلی)
 ۱۱۴- دیوان قبول: مقبول الدولہ کپتان جہری علی خاں قبول
 ۱۱۵- دیوان مبادک اول: واجد علی شاہ اختر ۱۲۷۸ھ
 ۱۱۶- ڈکیتی ان اکلس: پیر آو۔ ڈبلو۔ برڈ۔ مطبعہ لیورپول پریس، الہ آباد ۱۹۲۴ء
 ۱۱۷- دیوانہ ڈی چار جزا گینسٹ دی کنگ آف اود: (انگریزی ترجمہ جواب دہ بلیک)
 واجد علی شاہ اختر
 ۱۱۸- رسالہ موسیقی: واجد علی شاہ اختر (بالواسطہ)
 ۱۱۹- رسالہ واجد، سلطانیہ: (اردو ترجمہ مجموعہ واجد سلطانیہ) واجد علی شاہ اختر
 ۱۲۰- رفات بدر (تاریخ بدر) مطبوعہ قاسم پریس، حیدر آباد ۱۳۲۲ھ
 ۱۲۱- رموز و تہذیب: (شرح ہدایت السلطان واجد علی شاہ) امیر مینائی مطبع سلطانی، کھنڈ
 ۱۲۲- روضۃ الصفا: (ترجمہ اردو) ناصر ۱۲۷۰ھ (بالواسطہ)
 ۱۲۳- ریاض العقبی: واجد علی شاہ اختر۔ مطبع سلطانی، کلکتہ ۱۳۰۰ھ
 ۱۲۴- ریاض القلوب: واجد علی شاہ اختر۔ مطبع سلطانی، کلکتہ ۱۳۰۶ھ
 ۱۲۵- زبدۃ الکواکب: ہمارا جاجے گوپال ناقت محظوظ کھنڈی دہلی دہلی لائبریری
 ۱۲۶- سرور سلطانی: رجب علی بیگ سرور (بہ فرمائش واجد علی شاہ) مطبع سلطانی

- ۲۳۷۔ ملک اختر: واجد علی شاہ اختر۔ مطبع سلطانی، کلکتہ ۱۲۹۶ھ
- ۲۳۸۔ منتخب تفتیح الاخبار: راجا کنن لال اشکی۔ مطبع حاجی ولی محمد، لکھنؤ ۱۲۶۷ھ
- ۲۳۹۔ ناجو: واجد علی شاہ اختر۔ مطبع سلطانی، کلکتہ ۱۲۸۶ھ
- ۲۴۰۔ نادوات الثاقب: ہمارا جیسے گویاں ثاقب۔ مخطوطہ
- ۲۴۱۔ مضامین اختر: واجد علی شاہ اختر۔ مطبع ذول کشور، لکھنؤ ۱۲۷۵ھ
- ۲۴۲۔ نظم نامور: واجد علی شاہ اختر۔ مطبع سلطانی، کلکتہ ۱۲۸۷ھ
- ۲۴۳۔ نعمہ قدسی: (شرح صورت المہابک واجد علی شاہ) امیر نیانی
- ۲۴۴۔ نقوش: (جلد) لاہور۔ صنیمہ شخصیات نمبر
- ۲۴۵۔ نوٹس آف انڈین آفیس: سر فریڈرک جان شور (بالواسطہ)
- ۲۴۶۔ میادود: (ماہنامہ) لکھنؤ۔ اگست ۱۹۷۰ء
- ۲۴۷۔ نیپرنگ قات معروف بہ غزالہ ماہ دو: (ڈراما مبنی بر شہزادی دریاے تعشق واجد علی شاہ)
- ۲۴۸۔ نجمی محمد الف خاں جناب رام پوری مطبع گلزار محمدی، لکھنؤ ۱۹۰۰ء
- ۲۴۹۔ واجد علی شاہ اودان کا عہد: رئیس احمد جعفری۔ علمی پرنٹنگ پریس، لاہور ۱۹۵۸ء
- ۲۵۰۔ وزیر نامہ: وزیر السلطان نواب سید محمد امیر علی خاں مطبع نظامی، کانپور ۱۲۹۱ھ
- ۲۵۱۔ ہدیہ محسنیہ ترجمہ نازیومیہ: (بفرایش واجد علی شاہ) ذخیرہ مطبوعین آباد کلکتہ
- ۲۵۲۔ ہسٹری آف انڈیا: جے۔ سی۔ ارشمن۔ لندن ۱۸۷۷ء
- ۲۵۳۔ ہماری زبان: (ہفتہ وار) علی گڑھ۔ یکم دسمبر ۱۹۶۶ء
- ۲۵۴۔ یاد ایاہ: عبدالرزاق کان پوری
- ۲۵۵۔ یاد دہ کی بدلت: خوش بلیغ آبادی

سُلْطَانِ عَالَمِ
وَاجِدِ عَلی شَاہ



آگ تھے ابتداءے عشق میں ہم

واجہ علی شاہ اختر



آب جو ہیں خاک انتہا ہے یہ

آیام اسیری کی ایک نمایاں تصویر

پیش نامہ

سلطان عالم واجد علی شاہ ! اُرُدو کے مشہور بزرگ ادیب جناب سید محمد حسن ضوی ادیب کی تصنیف اور ان کی برسوں کی محنتوں کا ثمرہ ہے۔ اس کتاب کی اشاعت کا پروگرام میرا کاٹھی نے برسوں پہلے بنایا تھا، لیکن مختلف اسباب کی بنا پر اس کی تکمیل اب جا کر ہوئی ہے۔ مجھے پوری امید ہے کہ دیر آید درست آید، کے مصداق یہ کتاب قارئین کی دل چسپی اور معلومات میں غیر معمولی اضافے کا باعث ہوگی۔

واجد علی شاہ اختر سلطنت اودھ کے آسمان کا آخری ستارہ تھے جو غلامی کے ان سیاہ بادلوں میں غروب ہوا جسے غیلمچی استعماریت پسند اپنے ہمراہ لائے تھے اور جس نے تقریباً ایک صدی تک پورے ہندوستان کو تاریکی میں مقید رکھا۔

زیر نظر کتاب میں واجد علی شاہ اختر ایک مہرہ کے تصور اور تصویر کی صورت میں چلتے پھرتے ہوئے محسوس ہوں گے اور سید محمد حسن ضوی صاحب کے موقلم نے ان کی شخصیت میں ایسا وقار اور اتنی آب و تاب پیدا کر دی ہے کہ منظر کے ساتھ میں منظر تک رنگین اور دل کش ہو گیا ہے۔

سلطنت اودھ اور اس کے فرماں رواؤں کے بارے میں جتنا بھی تاریخی مواد ملتا ہے وہ ناکافی ہے۔ اس میں تناسب و توازن کی کمی اس بات کی غماز ہے کہ مورخوں نے اس کی جانب بے اتفاقی اور جانب داری سے بلند ہو کر دیکھنے کی رحمت گوارہ نہیں کی ہے۔ اس سلسلے میں جتنی بھی تاریخی کتابیں اور یادداشتیں منظر عام پر آ سکی ہیں ان پر یک طرفہ جائزے کا میلان کا فرمانظر آتا ہے۔ اس کی بڑی وجہ اس مذہبی اور سیاسی آویزش میں پوشیدہ ہے جو سلطنت اودھ کے قیام سے انجام تک موجود ادو ذہن و قلم پر چا دی رہی ہے۔ دربار دہلی کے ساتھ رقابتوں کی موجودگی، اختلاف عقاید کے عناصر کا عمل اور انگریزی

سیاست کی وہ حکمت عملی جو اختلافات کو ہوا دینے اور آدیزش کو تیز کرنے کے مقصد پر مبنی تھی اس حکمت عملی نے جو خمیر اوپر نظر تیار کر دیا تھا اس میں تدوین تاریخ کا وہ کام جو عام حالات میں بھی بڑا نازک اور بہت آزمائش بھرا جاتا ہے، ظاہر ہے کہ بہت آسان نہیں رہ گیا تھا۔ اس لیے جب ہم دیکھتے ہیں کہ اس موضوع پر علمی اور تاریخی انداز سے مرتب شدہ سنجیدہ سے سنجیدہ تحریریں بھی کہیں نہ کہیں انصاف اور غیر جانبداری کا دامن اپنے ہاتھ سے چھوڑ دیتی ہیں تو مذکورہ حقائق کی روشنی میں اس پر تعجب اور متحیر ہونے کی زیادہ ضرورت دکھائی نہیں دیتی۔ مجھے اس پر اصرار نہیں کہ میرا یہ خیال ناقابل تردید حقائق اور بحث و اختلاف کی گنجائش سے پاک کسی آخری نظریے کی حیثیت رکھتا ہے۔ نہ میرا منشا یہ ہے کہ کوئی نظریاتی بحث چھیڑی جائے۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اودھ کے فرماں روا اور واجد علی شاہ کی سیرت اور شخصیت کے منفی پہلوؤں پر بہت لوگوں نے خامہ فرسائی کی ہے۔ خصوصاً انگریزوں نے اپنی مصلحت کی بنا پر ان کے خلاف ایسی رنگ آمیز داستانیں مورخوں کے لیے درختے میں چھوڑی ہیں جن سے تحقیق، تادیل، تحریف، تعریف، جوتو غرض کہ طرح کا کام لیا جاسکتا ہے، پروفیسر مسعود حسن جنوی ادیب کی تصنیف مورخانہ دانش کے بوقلموں اظہار کی حامل ہے۔ اس میں عقیدت و محبت کے ساتھ تحقیقی نقطہ نظر کی آمیزش بھی ہے اور علم و فراست کی حامل نکتہ آفرینی بھی۔ مسعود حسن صاحب نے اپنی ساری عمر ادب و شعر کے سمندر میں شندوری کرتے گزاری ہے اور واجد علی شاہ اختر کے نام سے موسوم اس انجی کتاب کو ایک ایسے جڑ شہوار سے تشبیہ دی جاسکتی ہے جسے مسعود صاحب اپنی آخری عمر کی خواہی میں اس سمندر کی تہ سے نکال لائے ہیں اور جسے ان کے تجربے محنت اور کمال کا پتھر بھی کہا جاسکتا ہے۔

مجھے قوی امید ہے کہ یہ کتاب عوام و خواص کے حلقے میں وہ مقبولیت حاصل کرے گی جو بہت کم کتابوں کو میسر آتی ہے۔

مقبول احمد لاری

دیباچہ

انگریز اپنی اسحاق کی پالیسی کے ماتحت ہندوستان کی چھوٹی بڑی ریاستوں کو اپنی سلطنت میں شامل کر کے تقریباً سارے ملک پر قبضہ کر چکے تھے۔ اب سب سے بڑی ریاست اودھ پر قبضہ کرنے کی فکر تھی۔ اس مقصد کو سامنے رکھ کر انگریزوں نے اودھ کے آخری شریف انفس ہر دل عزیز بادشاہ سلطان عالم واجد علی شاہ کے خلاف پردیگٹ کی ایسی کامیاب مہم چلائی کہ ان کا نام عیاشی، فطی، قص و موسیقی کی علامت بن گیا۔ واجد علی شاہ نے ہندوستان کی ثقافتی زندگی، موسیقی، قص اور ادکاری کی اصلاح و ترقی کے لیے جو خدمتیں انجام دیں وہ بھی ان کی عیش کوشی قرار دے دی گئیں۔ راقم الحروف بادشاہ کی زندگی کے اس پہلو کو تحقیق و تفصیل کے ساتھ دو کتابوں میں پیش کر چکا ہے، جن کے نام ہیں لکھنؤ کا شاہی اسٹیج اور لکھنؤ کا خواجہ اسٹیج۔ کھٹک قص کی بین الاقوامی شہرت کی رفاصہ انا شرما جو پچھلے دس برسوں میں غیر ممالک میں قص کے مظاہرے کرتی رہی ہیں اور قص کے فن پر لکھ رہی ہیں۔ ان کا ایک مضمون قومی آواز کے جمہوریہ نمبر کے صفحے میں ۲۶ جنوری ۱۹۷۳ء کو شائع ہوا ہے اس میں وہ کہتی ہیں :

عام طور پر جاگیر دار اپنی نفسانی خواہشات کو پورا کرنے کے لیے رفاصاؤں کو رکھتے تھے لیکن ان میں ایک شخصیت ایسی بھی تھی جو حقیقتاً آرٹ کی سچائی تھی اور جس نے کھٹک کی پاکیزگی برقرار رکھنے میں پورا تعاون کیا وہ تھے واجد علی شاہ، شاعر حکمران اور اودھ کے آخری نواب وہ خود بھی اعلیٰ موسیقار اور رفاص تھے بعد میں لکھنؤ

گھرانے کے موجب شری ٹھا کر پرشاد کے شاگرد بن گئے۔ ٹھا کر پرشاد کے دولہے کے کالکا پرشاد اور بندادین سہمہ گیر شہرت کے مالک ہیں۔ واجد علی شاہ کی سرپرستی کی وجہ سے ان دونوں نامور بہتوں نے کھٹک کی کلاسیکی روایات کو برقرار رکھا۔

واجد علی شاہ سلطنت اودھ کے خاتمے کے ذمہ دار سمجھے گئے ہیں۔ راقم نے مدت دراز کی تلاش و تحقیق کے بعد واجد علی شاہ کے صحیح حالات اور سلطنت کے تدریجی زوال کے حقیقی اسباب پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

مسئل پر وینکٹ پٹے کے اثر سے جو خیالات دلوں میں پیٹھ گئے ہیں ان کو دل سے نکالنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ ہر غلط خیال کو رد کر کے صحیح خیال کو دل نشین کرنے کے لیے ایک ایک دعوے کے کئی کئی گواہ پیش کرنا پڑے ہیں۔ اس بنا پر اکثر بیانات میں تکرار نظر آئے گی۔ مگر یہ تکرار ناگزیر تھی۔ اگر ہر دعوے کے ثبوت میں صرف ایک بیان پیش کیا جاتا تو وہ ایک انفرادی رائے قرار دے کر نظر انداز کیا جاسکتا تھا۔

بیشتر کتابوں میں بادشاہ کے حالات انگریزوں کے بیانات سے لیے گئے ہیں، جو بادشاہ کے کھلے ہوئے مخالف تھے۔ اس کتاب میں ہندوستانیوں کے بیانات سے بہت کچھ لیا گیا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ خود ان کی رعایا ان کے اہل ملک ان کو کیا سمجھتے تھے۔ جو بیانات پیش کیے گئے ہیں وہ ایسے لوگوں کے ہیں جو بادشاہ کے ہم عصر یا قریب العہد تھے، لیکن جو نہ شاہی منصب دار تھے نہ وظیفہ خواہ اور جنہوں نے بادشاہ کی معزولی اور جلاوطنی کے بعد کوئی کتاب لکھی یا کوئی رائے ظاہر کی ہے یعنی جن کے لیے بادشاہ کی خوشامد میں غلط بیانی کرنے سے کوئی فائدہ متصور نہ تھا۔

انگریز واجد علی شاہ کے حالات اس رنگ میں پیش کرتے ہیں کہ ان کی حکومت اودھ والوں کے لیے ایک مصیبت تھی۔ انگریزوں نے انھیں معزول کر کے اودھ کے لوگوں کو اس مصیبت سے نجات دی۔ پیش نظر کتاب سے واضح ہو گا کہ اس بادشاہ کو اپنی رعایا میں کتنی ہر دل عزیزی بلکہ محبوبیت تھی۔ واجد علی شاہ کی معزولی کے وقت اور جلاوطنی

کے بعد تک انگریزی فوجیں کثیر تعداد میں لکھنؤ اور اطراف لکھنؤ میں پھیلی ہوئی تھیں۔ اور دھ کی رعایا نے اپنے معزول بادشاہ کی سلطنت کو برقرار رکھنے کے لیے وفاداری کے جوش میں ان فوجوں سے بے خوف اور عواقب سے بے پروا ہو کر جہاں بازی اور سر فروشی کا جو مظاہرہ کیا تاریخ میں اس کی نظیر نامشکل ہے۔

انگریز بادشاہ کی معزولی اور اور دھ کے الحاق کو حق بجانب قرار دینے کے لیے طرح طرح کی تدبیریں کرتے رہے۔ لیکن بادشاہ اپنی ہوش مندی اور بر محل اقدامات سے ان کی ہر تدبیر کو ناکام بناتے رہے۔ آخر کار انگریزوں نے اپنی طاقت کے بل پر اور دھ پر غاصبانہ قبضہ کر لیا اور تاریخ کی عدالت میں ناقابل معافی مجرم قرار پا گئے۔ واجد علی شاہ کی نجی زندگی اس کتاب کا موضوع ہے۔ بادشاہ نے انتظام مملکت میں جو اصلاحیں کیں، رعایا کی فلاح و بہبود اور ملک کی سرسبز نی خوش حالی کے لیے جو جو کام انجام دیے ان کا ذکر اس کتاب کے حدود سے باہر ہے۔ کتاب کے دو حصے ہیں۔ پہلے حصے میں بادشاہ کے ابتدائی حالات، طبعی خصوصیات اور ادبی خدمات کا بیان ہے اور دوسرے حصے میں بادشاہ کی منطوی، معزولی اور جلالطی کی داستان ہے۔

کتاب میں کوئی بات بغیر مستند حوالوں کے نہیں کہی گئی ہے۔ اس قید نے مصنف کے کام کو بہت دشوار اور دیر طلب بنا دیا۔ تاریخ نگار اکثر کسی مقصد کو پیش نظر رکھ کر واقعات میں رنگ آمیزی اور قطع و برید کر دیتا ہے۔ اس بنا پر راقم نے تاریخی ماخذوں سے زیادہ ان غیر تاریخی ماخذوں پر اعتماد کیا ہے، جن میں واقعات کا بے غرض اور بے لوث بیان ملتا ہے اور خود بادشاہ کے بیانات کثرت سے پیش کیے ہیں۔ یہاں صرف ایک عینی شاہد کا مختصر بیان پیش کیا جاتا ہے۔ رجب علی بیگ سردار بادشاہ کی ہجرت کے بعد لکھنؤ اور اہل لکھنؤ کی حالت یوں بیان کرتے ہیں :

”بارہ سے بہتر سن ہجری اور ہینا شعبان کا ہے، جمع پریشانیوں

کے سامان کا ہے۔ یعنی سریر آرائے اریکھ سلطنت حامل رنج سفر
غربت بغزم لندن ہے، شہر میں چھوٹا بڑا منیلائے مصیبت تخیث مشق
بور و سخن ہے۔ اس گلزار ہمیشہ بہار میں بہن و دے کا سامان ہے،
ایرا آباد ملک سنان ویران ہے۔ دیکھنے والوں کا جگر خون ہوتا ہے،
دشت برستی ہے، جنون ہوتا ہے “

آخر میں عصر حاضر کے عظیم شاعر جوش ملیح آبادی کا ایک بیان پیش کیا
جاتا ہے جس سے معلوم ہوگا کہ واجد علی شاہ کی معزولی اور جلا وطنی کے مدتوں بعد تک
اددھ کے لوگ اپنے محبوب بادشاہ کو یاد کر کے روتے رہے ہیں۔ جوش لکھتے ہیں ان
کے بچپن تک برسات کے موسم میں اددھ کی تصباتی عورتیں واجد علی شاہ کی یاد میں درد
کر یہ گیت گاتی تھیں۔

ہائے ترے بنا برکھانا سہائے
اے نورے کلکھے کے جوتیا اللہ تمھیں لائے
ہائے اللہ تمھیں لائے۔

اس گیت اور اس کے سننے والوں پر اس کا شدید اثر بیان کر کے پوچھتے
ہیں ”کیا انسانی تاریخ پیش کر سکتی ہے حضرت جان عالم کا سا کوئی محبوب بادشاہ
جس پر پون صدی تک اس قدر آنسو بہائے گئے“ پھر بادشاہ کو خطاب کر کے
کہتے ہیں ”اے جان عالم! فرنگی نے آپ کو تباہ بھی کیا اور بدنام بھی۔ آپ جتنے
اچھے تھے اتنے ہی بڑے بنائے گئے۔ آسمان راحت بود گر خون بہا درد بر زمیں۔ اے
میرے فرض شناس، جفاکش عدالت پناہ اور فقیر منش بادشاہ! اے میرے
شرافت سنج، ہنرور، نکتہ رس، علم نواز اور ادب پرست شاعر! اور اے میرے

صبح کے سپاہی دھڑ دھڑ! اور اے میرے شام کے موسیقار، فن کار مالک! آپ کے سپہ سالار اور گورنر فقیر محمد خاں گویا کایہ پر پوتا جوش ملیح آبادی آپ کے آستان عالی پر سر رکھ رہا ہے۔ اس بندہ دو گاہ کا ناچیز سلام قبول فرمائیے اے فرشتہ خصلت، مظلوم آقا! شاملں چہ عجب گریب نواز نگہ داران!

یہ ہیں وہ جذبات عقیدت و احترام جو دشاعر انقلاب، کو چار پشتوں سے دراشت میں ملے ہیں۔

راقم الحروف کی عمر اب اسی برس کی ہے۔ اپنے لڑکپن میں میں نے اپنے بہت سے سن رسیدہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو دیکھا ہے جن کی آنکھوں میں داہر علی شاہ کے ذکر پر آنسو بھرتے تھے۔

شیخ سعد حسن رضوی

۱۱۱ یادوں کی بڑی شہیر حسن خاں جوش ملیح آبادی ص ۸۱-۸۲

سُلْطَانِ عَالَمِ وَاجِدِ عَلِي شَاه

— پِلا حصّہ —

ابتدائی حالات - طبعی خصوصیات - ادبی خدمات

سلطان عالم واجد علی شاہ

ولادت سے ولی عہدی تک

منگل کے دن ۱۰ رذیٰ قعدہ ۱۲۳۷ھ مطابق ۲۲ جولائی ۱۸۲۲ء کو بادشاہ
(غازی الدین حیدر) سے عرض کیا گیا کہ آج نجم الدولہ مرزا واجد علی خاں بہادر خلیفہ نواب
نصیر الدولہ بہادر کے یہاں ایک فرزند از جنم پیدا ہوا ہے اور اس مولود مسعود کا اسم مبارک
مرزا واجد علی بہادر رکھا گیا ہے۔ یہی بچہ تقریباً پچیس برس کے بعد اودھ کا بادشاہ
ہو کر سلطان عالم واجد علی شاہ کے نام سے مشہور ہوا۔ واجد علی شاہ اودھ کے آخری
تاج دار تھے اور تاریخ ہند میں وہ اور بہادر شاہ ظفر آخری دو شخص تھے جو بادشاہ کے
لقب سے یاد کیے جاتے ہیں۔

واجد علی شاہ کی شادی

پندرہ برس کی عمر میں واجد علی شاہ کی پہلی شادی ہوئی۔ ماہیچہ کی رسم ۱۵
شعبان ۱۲۵۳ھ کو ادا کی گئی اور اس کے دو مہینے بعد ملکہ محزرہ عظمیٰ عالم آرا بیگم نواب
بادشاہ محل عرف خاص محل کے ساتھ شادی ہوئی تھی ان کا پشت نامہ یہ ہے: بنت نواب
علی خاں بہادر خلیفہ اشرف الدولہ احمد علی خاں بہادر ابن دکیل السلطنت مدار المہام
نواب مدار الدولہ مختار الملک سید یوسف علی خاں بہادر مصمام جنگ۔ دوسری شادی

۱۔ واجد علی شاہ کی تاریخ ولادت میں بہت اختلاف ہے۔ دیکھیے کتاب کا ضمیمہ الف۔

۲۔ سلطان المتواریخ قلمی ص ۳۸۲ ۳۔ عشق نامہ فارسی قلمی ص ۸۷-۹

بادشاہی کے زمانے میں ۴ شعبان ۱۲۶۷ھ مطابق ۵ رجب ۱۸۵۱ء کو حضور عالیہ
ملکہ اودھ اختر محل نواب رونی آرا بیگم کے ساتھ ہوئی۔ ان کا شجرہ یہ ہے: بنت حضور عالم
مدار الدولہ نواب سید علی نقی خاں بہادر خلیفہ نواب محمد علی خاں بہادر پیر ثانی وکیل السلطنت
مذکور علیہ اس طرح واجد علی شاہ کی دونوں بیاتہ بیویاں وکیل السلطنت سید یوسف علی خاں
کی پرپوتیاں اور رشتے میں چچا زاد بہنیں تھیں۔

واجد علی شاہ کی پیدائش کے وقت اودھ میں غازی الدین حیدر کی حکومت تھی جو
ان کے دادا نصیر الدولہ مرزا محمد علی خاں کے بڑے بھائی تھے۔ غازی الدین حیدر کے بعد
ان کے فرزند نصیر الدین حیدر تخت نشین ہوئے اور کوئی دس برس سلطنت کر کے ۳ ربیع الثانی
۱۲۵۳ھ (۷ جولائی ۱۸۳۷ء) کو دنیا سے کوچ کر گئے۔ ان کے بعد ان کے بیٹے مرزا فرید
بخت عرف متاجان کو انگریزوں نے نصیر الدین حیدر کا بیٹا تسلیم نہیں کیا اور تخت نشینی ہی کے
دن ان کو معزول کر کے مرحوم بادشاہ کے بوڑھے چچا واجد علی شاہ کے دادا، نصیر الدولہ
محمد علی شاہ کو تخت پر بٹھایا۔ انھوں نے اپنے فرزند ثریا جاہ مرزا امجد علی خاں کو اپنا ولی عہد
مقرر کیا۔

محمد علی شاہ نے اپنے پوتے مرزا واجد علی خاں کو لڑکپن میں پہلے ناظم الدولہ خورشید
خطاب دیا تھا۔ بادشاہ ہونے کے بعد انھوں نے ہر ادنیٰ و اعلیٰ کا معقول شاہرہ کر دیا، لیکن
واجد علی شاہ کی کوئی تنخواہ مقرر نہیں کی۔ ان کے والد ثریا جاہ نے پانچ سو روپے ماہوار ان
کے لیے اور چار سو روپے ماہوار ان کے محل کے لیے مقرر کر کے ان کی اشک ثونی کر دی تھی
محمد علی شاہ پانچ برس سلطنت کر کے ۵ ربیع الثانی ۱۲۵۸ھ (۱۶ جولائی ۱۸۴۲ء) کو
انتقال کر گئے اور ان کے بیٹے ثریا جاہ امجد علی شاہ ان کے جانشین ہوئے انھوں نے اپنے بیٹے
بیٹے مصطفیٰ علی حیدر کو نااہل سمجھ کر اپنے دوسرے بیٹے ناظم الدولہ خورشید مرزا واجد علی

کو اپنا ولی عہد مقرر کر کے ابو المنصور سکندر جاہ سلیمان ششم صاحب عالم بہادر خطاب دیا۔
اور قلم دان کی خدمت ان کے سپرد کر دی۔ واجد علی شاہ نے ششوی عشق نامہ میں اس کا ذکر کیا ہے :

پدر کی نیابت تھی مجھ کو سپرد : قلم دان کی خدمت تھی مجھ کو سپرد
وہ روزانہ صبح کو تین گھنٹے داد خواہوں کی عرضیاں اور عرض داشتیں پڑھنے، شاہی احکام نافذ
کرنے، شہر و دیار کے پرچہ ہمارے اخبار سننے اور غلے اور دیگر اجناس و اشیا کا نرخ معلوم کرنے
میں صرف کرتے تھے۔

ولی عہدی کے زمانے میں واجد علی شاہ کی تنخواہ کیا تھی، یہ تو معلوم نہیں، لیکن کچھ
ایسے قریبے موجود ہیں جن سے ان کی آمدنی کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ ان کے والد امجد علی شاہ
کی تنخواہ زمانہ ولی عہدی میں پچیس ہزار روپے ماہوار تھی ان کے پیش دست شرف اللہ محمد زبیر
خاں کی دس ہزار روپے ماہوار تھی۔ ان کے دادا محمد علی شاہ کے وزیر روشن الدولہ کی تنخواہ
پچیس ہزار روپے ماہوار اور یافت کے دو سے ذریعے اور اہل و عیال کا وثیقہ ملا کر پندرہ لاکھ
روپے سالانہ کی آمدنی تھی یہ امجد علی شاہ کے وزیر کی آمدنی بھی ایسی ہی کچھ ہوگی۔ اور ظاہر ہے
کہ ولی عہد سلطنت کی حیثیت وزیر سے کسی طرح کم نہیں ہو سکتی۔

تخت نشینی

امجد علی شاہ کی وفات کے بعد ۲۶ صفر ۱۲۶۳ھ (۱۳ فروری ۱۸۴۷ء) کو واجد علی شاہ
تخت نشین ہوئے اور ابو المنصور سکندر جاہ بادشاہ عادل فیض نماں سلطان عالم محمد واجد علی شاہ
کا لقب اختیار کیا۔ اس وقت ان کی عمر شمسِ حساب سے چوبیس برس ساڑھے چھ مہینے کی
اور قمری حساب سے پچیس برس ساڑھے تین مہینے کی تھی۔ واجد علی شاہ تخت گاہ میں داخل

۱۔ وزیرِ قائمہ ص ۹۹ ۲۔ عشق نامہ فارسی (قلمی) ص ۳۵ تذکر شاہی ص ۴۰
سوانح عمری مولفہ حکیم محمد کاظم ص ۲۰ ۳۔ فیصل التوایخ جلد اول ص ۲۶۶ ۴۔ سلیم کی سفیر نامہ اردو
جلد دوم ص ۱۸۲-۱۸۳ ۵۔ اودھ کا شاہی تخت لال بارہ دی میں رہتا تھا۔

ہوئے۔ ہمارا جہاں بال کرشن نے فرمان جلوس کا مسودہ بڑے صاحب کو سنایا یعنی "مابدولت
واقبال نے یہ اعانت دامداد آنریبل سرکار کمپنی انگریز بہادر وراثت آبائی پر تخت سلطنت
کے جلوس کیا" محمدالدولہ کشتی میں تاج شاہی لائے۔ بڑے صاحب نے اپنے ہاتھ سے
تاج فرق مبارک پر رکھ کر بہ زبان انگریزی فرمایا کہ اب داجد علی شاہ اودھ کے بادشاہ
ہوئے بعد اس کے بادشاہ نے شامیانے کے نیچے تخت شاہی پر جلوس فرمایا۔ ہمارا جہا
جے گوپال ثاقب نے سکے کہا :

سکہ زدر برسیم و ذرا از فضل و تائید الہ
ظلی حق و احد علی سلطان عالم بادشاہ

دوسرے دن صبح کو جشن جلوس منعقد ہوا اور جملہ اراکین سلطنت خلعت ہائے فائزہ سے

سرفراز ہوئے یہ

پہلا شاہی فرمان

جب کوئی بادشاہ تخت پر بیٹھتا تھا تو ایک فرمان کے ذریعے سے تمام شاہی
ملازموں کو برطرف کر کے اپنے حکم سے ان کو یا ان کی جگہ دوسروں کو نوکر رکھتا تھا لیکن اس
انسانیت دوست رعایا پرور بادشاہ نے سب پہلا کام یہ کیا کہ اس دستور کے خلاف
تمام سرکاری ملازموں کی بطرفی کے بجائے ان کی بجالی کا فرمان جاری کیا یہ

فرمان بنام عمال ممالک اودھ

”فرمان قضا جریان شرف صدر حمی یاد کہ دل جمعی و اطمینان تمام عہدہ
مفوضہ خود مامور بودہ و قیقہ از قایل خرم دہو شکاری نامری و جملہ دگر وارد
واحیدے از فادہ پیشگان و متمدان را سر برداشتن نہ دہد مال واجب سرکار

لہ اودھ کے انگریز ریڈیٹنٹ بڑے صاحب کہلاتے تھے۔ یہ قیصر التواریخ ص ۳-۲

یہ نادرات ثاقب (قلمی) ۵۵ ۵۶ اسرار واجدی (قلمی) ص ۶۷

احسن التواریخ کے مصنف نے امور مملکت میں بادشاہ کی مصروفیت، اپنے منشیانہ انداز میں یوں بیان کی ہے۔

”بادشاہ بقیل قواعد الدلت طلوع صبح سے آدھی رات تک ایک دم استراحت نہیں فرماتے، اور بہ بلا خطہ عرضداشت ساکلمان اہل معاملات مرفوعات ارباب حاجات، و قرطیس و قایع بلا و قریات اور بہ سماعت روداد زبانی عرض بیگیان و خواہش مندان بحضور خاص بے تعرض و تعلق متوسطان، و اہل اسے احکام و داد وہی مستغنیان و تعزیر جفا پیشگان و تنقیح مقدمات ملکی و مالی و تقرر وظائف ادائی و اعلیٰ مصروف رہتے ... اکثر مقدمات بہ تجویز خاص بادشاہ تصفیہ ہوتے ہیں“

جلوس کے چند ماہ بعد امین الدولہ وزیر موقوف کیے گئے، اور ۲۲ رجب ۱۲۶۳ھ (۵ اگست ۱۸۴۷ء) کو انیس پارچے کا خلعت وزارت اور خطاب نواب علی نقی خاں کو ملا۔ رزیدنٹ اس عزل و نصب سے متفق نہ تھا، مگر بادشاہ نے اپنا حکم واپس نہیں لیا۔ رزیدنٹ نے اس کی رپورٹ صدر میں کر دی۔ جواب آیا کہ یہ امر خائگی ہے۔ بادشاہ کی خوشی پر موقوف ہے۔ شاہی سفیر کے تقرر کا مسئلہ پیش ہوا تو نواب علی نقی خاں نے انتخار الدولہ ہمارا بیہ رام بہادر کا نام تجویز کیا۔ رزیدنٹ سے استمراج کیا گیا تو اس نے کہا ایسا شخص ہونا چاہیے جو صاحبان انگریز سے معاشرت و معاملات کی قابلیت رکھتا ہو۔ ہمارا راج بال کرشن دیوان اور راجا کنڈن لال بہادر میمنشی نے چند نام تجویز کیے اور راجا کنڈن لال کے صہرا سے محمد خاں کا نام بھی فہرست میں شامل کر لیا گیا۔ رزیدنٹ نے حالات دریافت کرنے کے بعد محمد خاں کا نام منظور کیا۔

۱۔ احسن التواریخ ص ۲۲-۲۳ ۲۔ قصی التواریخ جلد دوم ص ۱۷ ۳۔ اودھ کا ایک سفیر

لکھنے میں رہتا تھا کہ قصی التواریخ جلد دوم ص ۱۷

دادری کا نیا طریقہ

سلطنت کی ابتدا میں بادشاہ خود امیر سلطنت کی طرف متوجہ ہوئے۔ مظلوموں کی دادری کے لیے چاندی کے دو قفل صندوق جن پر شاہ سلطانی عدل نوشیہ والی کے الفاظ کندہ تھے بادشاہ کی سواری کے ساتھ چلتے تھے تاکہ ہر شخص اپنی عرضی بے روک ٹوک ان میں ڈال دے۔ بادشاہ ان صندوقوں کو خود کھولتے تھے اور عرضیوں پر مناسب احکام صادر فرماتے تھے جن کی فوراً تعمیل کی جاتی تھی۔ کسی عینے یہ سلسلہ جاری رہا، پھر ختم کر دیا گیا۔ اس کا خاص سبب یہ ہوا کہ دادخواہوں کی عرضیوں سے بددیانت اہل کاروں اور خائن مصاحبوں کی قلعہ کشی تھی۔ اس لیے انھوں نے ان صندوقوں میں ایسی فتنہ انگیز تحریریں ڈلوانا شروع کیں جو نوان بادشاہ کے خلاف مزاج ہوتی تھیں۔

واجہ علی شاہ کی فوجی سرگرمیاں

واجہ علی شاہ کو فوج کی ترتیب و تنظیم کا بہت شوق تھا۔ وہ اپنی دلی جہد کی حالت یوں بیان کرتے ہیں:

”میری طبیعت فرقتہ سپاہ سے بہت مائل اور اس کی نگہداشت کی طرف بہت متوجہ تھی۔ لیکن آمدنی کی کمی، خرچ کی زیادتی اور والد کی نفرت کی وجہ سے اس کی فوجت کہاں آسکتی تھی۔ ناچار تیس عورتیں چوکی اور پہرے کے لیے ملازم رکھی تھیں اور ان کو روزانہ فارسی زبان میں قواعد سکھاتا تھا۔ چند روز کے عرصے میں وہ قواعد میں ایسی مشاق اور پوشش یاد ہو گئیں کہ انگریزی قواعد میری نظر میں نہ سماتی تھی اور ان میں سے ہر ایک اسلحہ کی صفائی اور شفا فی وغیرہ میں انگریزی فوج کیلئے باعث رشک تھی۔

پچاس ترک سوار مرد بھی میں نے ملازم رکھے اور ان کو بھی فارسی زبان میں ایسی تعلیم دی کہ فرنگی فوج کے لیے باعث رشک ہو گئے! دلوں دلوں فرسوں

کی افسری کے لیے حاجی محمد شریف کو جہاں باز سرکار مرزا دلی عہدہ باد
کرنیل حاجی شریف علی خاں، خطاب دے کر مقرر اور ممتاز فرمایا۔ کرنیل
مذکور نے قواعد میں اتنی سعی و کوشش کی کہ قواعد کے گھوڑے مثل آہنی دیوار کے
معلوم ہوتے تھے۔ وہ کسی سپاہی سے ایک حربہ رشوت نہیں لیتا تھا اور
اس کا حکم فوج پر ایسا تھا کہ کیا مجال جو قواعد کے میدان میں کوئی کسی سے
بات کر سکے ۱۶

انتزع سلطنت کے بعد جب لکھنؤ میں غدر ہو گیا تو ۱۶ نومبر ۱۸۵۷ء کو انگریزوں
نے سکندر باغ پر حملہ کر کے وہاں کی حفاظت کرنے والے دو ہزار سپاہیوں کو جو آخردم تک
پامردی سے لڑتے رہے، توپوں سے اڑا دیا۔ سکندر باغ کی لوٹ میں لاکھوں روپے کا زہن جو
ادربیش قیمت سامان انگریزوں کے ہاتھ لگا۔ جو دولت مند بیگمیں وہاں مقیم تھیں وہ ایک رات
میں فقیریاں بنا دی گئیں۔ مگر ان سے کم تر درجہ کی عورتوں نے شہر کے تحفظ میں اپنی جانیں
دے دیں یہ لفٹنٹ کرنل گورڈن الیگزینڈر نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ سکندر باغ کے
مقتولین میں کچھ قوی پہلے حبشین تھیں جو جنگلی بلیوں کی طرح لڑی تھیں اور جب تک
وہ ہلاک نہ ہو گئیں یہ شبہ بھی نہیں ہوا کہ وہ عورتیں تھیں یہ سار جنت فوریس محل ایک
عورت کا ذکر کرتا ہے جو سکندر باغ کے صحن میں پیل کے ایک بڑے درخت پر بھی ہوئی
کئی انگریزی فوجیوں کو اپنی گولیوں کا نشانہ بنا چکی تھی اور آخر کار خود بھی گولی سے
ہلاک ہوئی ۱۷

کچھ عجب نہیں کہ یہ وہی عورتیں ہوں جن کو بادشاہ نے دلی عہدی کے زمانے
میں فوجی تربیت دے کر انگریزی فوج کے لیے باعث رشک بنا دیا تھا۔

۱۷ عشق نامہ فارسی ص ۸۸-۸۹ ۱۸ اٹھارہ سو ستاون - سریندر ناتھ سین - سری سوتی

بادشاہ ہونے کے بعد سب سے پہلے فوج کی درستی کی طرف توجہ کی۔ لوگ رشوت دے کر فوج میں ملازمت حاصل کر لیا کرتے تھے۔ بادشاہ نے تخت نشینی کے پہلے ہی سال ۱۸۲۷ء کے آخر میں سخت احکام نافذ کیے کہ اگر کسی فوجی افسر نے یا دفتر نشینی گری کے کسی اہل کار نے ایک حبس بھی رشوت میں لیا تو اس کو ایسی سخت سزا دی جائے گی جس سے دوسروں کو عبرت ہو۔ اسی سال فوجیوں کو جدید آلات اور عمدہ وردیاں دی گئیں۔

بادشاہ نے کئی نئی پلٹین اور رسالے بھرتی کیے۔ جلوس کے تیسرے سال ۱۲۶۵ھ میں جو شاہی رسالے اور بٹالینیں وغیرہ تھیں ان کے نام یہ ہیں۔

رسالے: سلطانی، غازی، منصوری، غضنفری، اسدی، دکھنی، بانکا، ترچھا، حسینی، حیدری، بادشاہی، خاقانی، خسروی اور رسالہ بیگمہ۔

نجیبوں کی بٹالینیں: داؤدی، عباسی، جعفری، ذوالفقار، شمشیر، حام، رفعت ظفر، عنایت، کاظمی، قیسری، فتح جنگ، علی خول، صفدری، عسکری، جوار، فتح عیش، پھری، فقور، سادنت، بھمار۔

تیلنگوں کی بٹالینیں: خاص دل، گھنگھور، جاں نثار، فتح مبارک، سردی، جاں باز، اکبری، سکندری، خاقانی، سلیمانی، جہاں شاہ، گللابی، ظفر مبارک۔

توپ خانے: توپ خانہ خسروی، توپ خانہ کلاں، توپ خانہ بارخ، برادون، توپ خانہ قصر سلیمان، توپ خانہ بالک گنج، توپ خانہ عنایتی، توپ خانہ جہاز سلطانی اور ایک توپ خانہ جس کے سیر آتش میر ہدی قبول تھے تفصیلات بالاتر ذکر شاہی سے ماخوذ ہیں۔ اسی کتاب میں فوج کے مختلف منصوبوں پر فائز آٹا سنی افسروں کے نام بھی دیے ہوئے ہیں۔ جو طوالت کی وجہ سے نظر انداز کیے گئے۔

وَدِوِیَ کَامَمَ کے مصنف نے واجد علی شاہ کی فوجی سرگرمیوں کا آنکھوں دیکھا حال

جو فارسی شرفِ نظم میں تفصیلات اور تمثیلات کے ساتھ بہت طول دے کہ بیان کیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ قدیم فوجوں کی ترتیب و تنظیم کے بعد کئی نئی فوجوں کا اضافہ کیا اور ان کے نام زبانِ اردو میں بانٹا کر چھا، گھنگھوڑ، اختری، نادری وغیرہ رکھے۔ ان کی تعلیم کے لیے قواعد کے الفاظ و احکام فارسی میں خود اختراع کیے۔ سپاہیوں کے لیے رنگ رنگ کی مانات اور منجمل کی دردیاں بنوائیں۔ ان کے ساز و سلاح آئینوں کی طرح چمکتے تھے۔ زورنگار رنگین علموں سے میدانِ کارگل زار چربہ ہار معلوم ہوتا تھا۔ خود بدولتِ ناز صبح پڑھ کے جنگی لباس پہن کے گھوڑے پر سوار ہونے کے فوج کا معاشرہ فرماتے اور سپاہیوں کو قواعد دیتے تھے۔ آفتاب کی تپش اور میدان کے گرد و غبار میں تین تین چار چار گھنٹے مردانہ سرگرمیوں میں عرق ریزی کرتے تھے اور تنگ آزمائی، نیزہ بازی، شمشیر زنی اور گولہ اندازی کی ورزشیں ملاحظہ فرماتے تھے۔ جن فوجیوں کا کام امتحان کی کسوٹی پر پورا اترتا تھا ان کو شاہانہ انعامات اور مناسب القاب و خطاب سے نوازتے تھے۔

آفتاب اودھ کا مصنف عہدِ واجدہ میں لکھنؤ میں موجود تھا۔ وہ بادشاہ کی معزولی کے بعد لکھنؤ آیا ہے :

”حضرت بادشاہ کے مزاج میں شوق ایجاد ہمارے تازہ بہت تھا جیسے کہ پوشاک و لباس و عمارات اور ان کی آراستگی میں ایسے عمدہ ایجاد کیے کہ دیکھنے سے تعلق رکھتے تھے، دیسے ہی ترتیب و رنج بھی بہ آئین تازہ ہوتی تھی یعنی قواعد و رسم زبان فارسی میں ایجاد ہوئے ترچھے اور ہائے دو رسالے ترک سواروں کے اور اختصری اور نادر دہلیٹین تیلنگوں کی بموجب ہدایت اور تعلیم خاص بادشاہ کے اسی قانون کے موافق کام کرتی تھیں۔ خود بدولت ہر روز قواعد کا کام لیتے تھے اور بول چال سکھاتے تھے۔“

فوجی قواعد کی چند ناریسی اصطلاحیں یہ تھیں راست رو، دست چپ بگر، پس لیا۔ ایک واقعہ حال مصنف جس کی کتاب کا نام معلوم نہیں ہو سکا اس کا بیان ہے :

”جو سپاہ حاکم رکاب رہتی تھی اس کو نیزہ بازی، تنگ اندازی، آتش خانہ اور صفوں کی آراستگی کے قواعد سکھانے میں بذات خود متوجہ رہے اور شدید گرمی اور انتہائی سردی میں دود پر کھڑے رہ کر بیاہر دوزخ بکس کے لفظوں سے جدید طریقے سے تربیت کی ہے۔ اور خود بھی نفس نفیس فنون سپاہی یعنی شہسوار، چوگان بازی، تلوار، بندوق، تیر اور نیزے کے کام میں یکتائے روزگار ہیں“

واجد علی شاہ کی فوجی سرگرمیوں کے بارے میں ایک اہم بیان اور پیش کیا جاتا ہے۔

”جب امجد علی شاہ بادشاہ لکھنؤ نے ۱۸۴۷ء میں انتقال کیا تو

واجد علی شاہ ان کے جانشین ہوئے، جو فوج کی تنظیم میں ہمہ تن مہمک ہو گئے۔ احکام صادر کیے گئے کہ نماز صبح کے بعد ۵ بجے لکھنؤ کی تمام رجنٹوں کو روزانہ پریڈ کرنا ہوگی۔ بادشاہ کا معمول تھا کہ وہ جنرل کی دردی میں فوج کو روزانہ چار پارچ گھنٹے قواعد کو داتے تھے۔ مزید برآں انھوں نے یہ حکم صادر کیا کہ اگر سلطنت کی ضرورتوں کے علاوہ وہ پریڈ میں غیر حاضر ہوں تو ان پر دو ہزار روپے جرمانہ کر کے فوج میں تقسیم کر دیے جائیں اور اگر کوئی رجنٹ پریڈ میں وقت پر نہ پہنچے تو اس پر بھی اتنی ہی رقم جرمانہ کی جائے۔ پیادوں کے دودستوں اور سواروں کے ایک رسالے کو مزید سزا کے طور پر دن بھر سرج رہنا پڑا۔

”بادشاہ کے اس اہمک سے بدگمانی پیدا ہوئی۔ انگریز رجنٹ نے فوج ہٹا کرنے میں اتنی جاں فشانی کرنے کا سبب دریافت کیا اور یہ تجویز

پیش کی کہ اگر بادشاہ کو اپنے ملک کے تحفظ کے لیے فوج کی ضرورت ہے تو ان کو

انگریز سپاہی رکھنا چاہیے، جن کی تنخواہ اودھ کے محاصل سے دی جائے گی۔

فوجی اصلاحات کے معاملے میں بادشاہ کی پرورش سرگرمی نہ ریڈیڈنٹ کو پسند تھی۔
انگریزی حکومت ہند کو حکومت ہند کے سکرٹری برائے امور خارجہ نے ریڈیڈنٹ کو ہدایت
کی کہ وہ بادشاہ کے ذہن نشین کر دے کہ وہ فوجی مصارف جو مالیات کو تباہ کر رہے ہیں ان
میں تخفیف کرنا کتنا ضروری ہے۔ اس کے کچھ دن بعد گورنر جنرل نے بادشاہ کو لکھا کہ اودھ میں
اتنی بڑی فوج رکھنا اس لئے کہ معاہدے کی صریح خلاف ورزی ہے۔ اس کے مطابق ضرر
چار ہٹالین، پیادے، ایک ہٹالین نجیب اور میواتی، تین سو گولنداز اور نصاب تعداد میں
پولیس رکھی جاسکتی ہے۔ مگر کہا جاتا ہے کہ اب اودھ میں چار سو تو ہیں، پانچ ہزار تو کچھ چار ہزار
سوار اور چوبیس ہزار پیادے ہیں۔

بادشاہ چار سو سواروں کا ایک حفاظتی دستہ مقرر کرنے کا انتظام کر رہے تھے تو
ریڈیڈنٹ نے ایک سخت نوٹ لکھا کہ مجھے ایسے بہت اکیڈ کہنا پڑتا ہے کہ اپنی فوج میں اصلے
کا خیال ترک کر دیجیے کیوں کہ اس سے آپ کے مالیات میں دشواری ہو رہی ہے۔

بادشاہ ریڈیڈنٹ اور حکومت ہند کو ناراض نہیں کرنا چاہتے تھے۔ انھوں نے فوجی
سرگرمیاں ترک کر دیں، حالانکہ سرکش تعلقہ داروں اور زمین داروں کو قابو میں رکھنے کے لیے
وہ ضروری تھیں۔ مال گزاری کے باقی دار زمین داروں نے ناجائز فائدہ اٹھانا شروع کیا۔
اور حکومت اودھ کے خلاف سرکشی برآمد ہو گئی۔ جو انگریزی امدادی فوج اودھ میں رہتی
تھی وہ ان کے خلاف استعمال نہیں کی جاسکتی تھی۔

۱. C. I. Metcalfe : two Native Narratives
of the mutiny in Delhi

۲. بھٹناگر ص ۲۳

۳. بھٹناگر ص ۲۴

تمام بڑے زمیں داروں کے قلعے تھے، توپوں سے لیں اور سپاہی تھے جن کے ذریعے سے وہ مال گزاری وصول کرتے تھے، آپس میں لڑتے تھے، کسانوں کو لوٹتے تھے اور حکومت سے مقابلہ کرتے تھے۔ انگریزوں نے بادشاہ کو فوجی طاقت بڑھانے سے روک دیا۔ نتیجہ یہی ہو سکتا تھا کہ ملک میں لاقانونیت پھیل جاسے۔ اب حکومت اودھ کو باقاعدہ انگریزی فوج کی مدد لینا پڑتی تھی، جس سے حکومت کی بدترجی ہوتی تھی۔ اور انگریزوں کی دھاک بٹھیتی تھی۔ اور یہی انگریزوں کا منشا تھا۔

انگریز اودھ پر قبضہ کرنے کی فکر میں تھے۔ وہ اودھ کی فوجی طاقت بڑھتے ہوئے کیوں کر دیکھ سکتے تھے۔ مورخین کا اس پر اتفاق ہے کہ رزیدنٹ کی مخالفت کے باعث واجد علی شاہ کو فوجی سرگرمیاں ترک کرنا پڑیں۔ آفتاب اودھ کے مصنف کا بیان ہے:

”ایک روز نواب علی نقی خاں بہادر وزیر اعظم نے عرض کیا کہ قبلہ عالم یہ آراستگی فوج خلاف مزاج صاحب رزیدنٹ بہادر کے ہوتی ہے چونکہ ہر طرح اطاعت سرکار انگریزی ملحوظ خاطر شاہی تھی، لہذا اس روز سے بالکل اس طرف سے کنارہ کیا“

احسن التواضع، نادالالعصر اور بعض دوسری تاریخیں بھی اسی مضمون کو دہراتی ہیں۔

شہر کی تزئین

واجد علی شاہ نے فوج کی ترتیب کے ساتھ شہر کی تزئین کی طرف بھی خاص توجہ کی۔ متعدد عالی شان عمارتیں بنوائیں وسیع اور پر فضا باغ لگوائے جیسے حضرت باغ، مہندو باغ، سکندر باغ، بناہی باغ اور سب سے بڑھ کر قصیر باغ جس کی تعمیر میں آٹھ لاکھ روپیہ صرف ہوا۔ اس زمانے میں صرف درختوں کے مجموعے کو باغ نہیں کہتے تھے۔ بلند چار دیواری، شان دار پھاٹک، چند عمارتیں اور ان کے درمیان میں ایک نہر یا نہریں باغ کے لوازم تھے۔ سب سے پہلے جو عمارت بادشاہ نے بنوائی وہ اپنے والد مرحوم امجد علی شاہ کا مقبرہ امام باڑہ بسطین آباد ہے جس پر دس لاکھ روپیہ صرف ہوا۔

عہد واجہدی میں لکھنؤ کی عمارتوں کے بارے میں مصنف احسن التواریخ لکھتا ہے:

”مقتل و محاذی کوٹھی دل کش ایک مکان جہاں فرمایا اور آگے
اس کے ایک میدان واسطے ہمارے قواعد حرب کے درست ہوا اور یہیں
دولت خانہ ایک عمارت نام در بہ بادشاہ منزل۔ اور ایک راستہ بہت
صاف دریا کی طرف نکالا جس پر سرشام سے دور وہ قندیلوں اور بلوریں
کنوئوں کی روشنی ہوتی تھی۔ صاحبان انگریز بہادر اس پر فضا جگہ کو
پسند کر کے ہر روز آمد و رفت رکھتے تھے۔ اور عمارت متعلقہ قیصر باغ جس
زمین پر واقع ہے بہ رضا مندی رعایا بہ صرف کثیر خرید کی گئی اور شہل برہنہ
انواع آراستہ و ترتیب ہوا۔ الغرض اس عہد میں اکثر عمارت سلطانی
اہل کاران و رعایا کی قابل دید تھیں جن کا نمونہ کوٹھی قیصرینہ و قیصر باغ و
معشوق منزل جو آج تک کسی قدر باقی ہے۔۔۔ اس کے دیکھنے سے
معلوم ہوتا ہے کہ مکانات حکومت ریسان ملک آدھ قابل دید تھے۔
اس عہد میں دایبندگان سلطنت نے بھی اکثر عمارت تیار کرائیں۔“

بادشاہ کے حکم سے جلوس کے پہلے سال دیانت الدولہ معتمد علی خاں ناظر نے ایک
ویسٹ سرک بنوائی۔ اس کے لیے جو قطعہ تاریخ کہا گیا ہے اس کے آخری دو شعر یہ ہیں۔

وہ ہے زر سرک سے سکندر باغ بہت ہم جانب دیگر از مکان خسرو
پرسید زلف تھے چو رقم سالش گفت از سر ادج کجکشان خسرو

۱۲۶۱ھ

بادشاہ کی طویل بیماری

بادشاہی کو دوسرا سال تھا، بادشاہ امور سلطنت انجام دینے میں بہت تنہا
مصرف تھے کہ تھجیر قلبی و دماغی کا مرض لاحق ہو گیا۔ بادشاہ کے پھپھا اقتدار الدولہ لکھتے
ہیں :-

”حضرت سلطان عالم بہادر کو آنجنے کا مرض شروع ہوا اور طبع مبارک نہایت ناساز ہوئی۔ ایک دن تو ۲۶۲ھ (۱۸۴۸ء) میں ایسا حال ہوا کہ دروازے دولت خانے کے بند ہو گئے تھے اور کسی کو یقین نہ تھا کہ حضرت جاں بڑ ہوں گے۔ انھیں دنوں میں سلیم صاحب بہادر نے حسب ہوا کے تشریف لائے۔“

لفٹننٹ کرنل سلیم ۱۱ جنوری ۱۸۴۹ء کو اودھ کا ریٹرنٹ مقرر ہوا۔ اس وقت بادشاہ بہت بیمار تھے۔ سلیم گورنر جنرل کے سکریٹری ایلٹ کو اور خود گورنر جنرل لاڈلہوڑی کو اپنے خطوں میں بادشاہ کی بیماری کا جو حال لکھا کرتا تھا وہ مختصر تاریخ وار راج کیا جاتا ہے :-

۳۱ جنوری ۱۸۴۹ء (۶ ربیع الاول ۱۲۶۵ھ) بنام ایلٹ
بادشاہ اب بھی بہت بیمار ہیں، مگر کسی خطرے کا اندیشہ نہیں ہے۔

۲ مارچ ۱۸۴۹ء (۲۵ ربیع الثانی ۱۲۶۵ھ) بنام ایلٹ۔
بادشاہ ویسے ہی ہیں جیسے میرے پچھلا خط لکھنے کے وقت تھے۔ اس خط میں بادشاہ کے انتقال کے سلسلے میں گورنر جنرل کی خواہش معلوم کرنے کا اور انتقال کے بعد کے انتظامات کا بھی ذکر ہے۔

۳ مارچ ۱۸۴۹ء (۲۸ ربیع الثانی ۱۲۶۵ھ) بنام ایلٹ۔
بادشاہ کی حالت بدتر نہیں بلکہ بہتر بتائی جاتی ہے، مگر گرمی کے موسم کو بڑاشت کرنا مشکل ہے۔ اس خط میں بھی بادشاہ کے انتقال کے بعد کے انتظامات کا بھی ذکر ہے۔

۸ مئی ۱۸۴۹ء (۱۵ جمادی الثانی ۱۲۶۵ھ) بنام لاڈلہوڑی
جسمانی طور پر بادشاہ توقع سے زیادہ تندرست ہیں۔ اعلیٰ حضرت کو حقائق

ہے اور وہ اکثر بے اصل دہموں میں پڑ جاتے ہیں۔

۱۸ جون ۱۸۲۹ء (۲۷ رجب ۱۲۶۵ھ) بنام ایلٹ

بادشاہ حسانی طور پر تندرست ہیں۔

۲۶ ستمبر ۱۸۲۹ء (۱۸ اشوال ۱۲۶۵ھ) بنام لارڈ ڈلہوزی

بادشاہ کو جسمانی تکلیف نہیں ہے، مگر خفقان ہے اور خاموشی اور افسردگی کے طویل دورے پڑ جاتے ہیں۔ اسی خط میں یہ بھی لکھا ہے کہ بادشاہ ان دنوں نثر کی ایک ضخیم تاریخ کو جو حیدری کہلاتی ہے نظم کرنے میں مصروف ہیں۔ حیدری سے سلیم کی مراد حملہ حیدری ہے جو نثر کی کتاب نہیں، فارسی کی مثنوی ہے اور بادشاہ نے اس کا آزاد ترجمہ ہیبت حیدری کے نام سے کیا ہے۔ اس مثنوی کے سبب تالیف کے ذیل میں وہ اپنی بیماری کا ذکر یوں کرتے ہیں:

ہوئی جب یہ تالیف لے سکے سیخ	تو ہجرت سے تھ بارہ ہوشیت پرخ
طبیعت مرئی تھی نہایت علیل	نکلتنی نہ تھی بطن کی کچھ سبیل
طبیعت کا بے رنگ سامان تھا	کہ آنکھوں میں صحرانگلتان تھا
نہ کچھ لطف باقی ترانے میں تھا	نہ نغمہ سراؤں کے گانے میں تھا
نہ کچھ ملک کی فکر نہ مال کی	نہ تھی کچھ خبر اپنے احوال کی
اسی طرح جب کٹ گئے ہفت ماہ	طبیعت بھی کچھ بوجھلی رو بہ راہ
لگانا تھا میں نظم میں اپنا دل	کہ یہ ہو نہ جاے کہیں مضحل

۱۲۶۵ء کا تقریباً پورا سال بیماری میں گزرا۔ صفر کے مہینے میں خفقان کی شدت

اتنی بڑھ گئی تھی کہ ایک دن کپڑے پھاڑ ڈالے اور اس کے دو سونے سے شام تک آنکھیں بند کیے غش میں پڑے رہے۔ بیگیوں میں کہرام مچتا رہا مگر ان کو یہ بھی خبر نہ ہوئی کہ کون آیا اور کون گیا۔ دس مہینے گزر جانے کے بعد بھی بدن بید کی طرح کا پتا تھا، اتنا قرار نہ تھا کہ ناز بخوبی ادا کر سکیں۔ Channel eGangotri Urdu

مجھے یاد ہجرت کلہے سال رنج
تھے ان روزوں ایامِ مایہ نرا
کہ تھے تب ہزاروں دھندِ شصت پر
... ..
زیادہ ہوا دشمنوں کا مراق
ہوا تلخ منہ مثلِ زہرِ فراق
جگر خنجرِ غم سے کلنے لگا
گھریاں کے رزے اڑے بے شمار
ہوا غش، رہی کچھ نہ مجھ کو خبر
رہی تن میں اس درجہ طاقتِ قلیل
کیا کچھ کسی سے نہ اس ن کلام
جو تھیں سب نیک طینت شریف
لگیں رونے مانندِ ابرِ چین
یہ کہرامِ بالیں پہرِ چند تھا
خبر کیا کہ آئندہ ہوتا ہے کون
گیا دس مہینے کا عرصہ گزر
وہی فرطِ غفلت، وہی حالِ ار
قرار اس قدر بھی نہیں مطلقاً
کہیں میں بخوبی نمازیں ادا

رہے گا کہاں تک یہ حالِ سقیم

کمرے رحمِ مجھ پر خدا کے رحیم

دعا تعویذ - جب دعا علاج سے کچھ فائدہ نہ ہوا تو دعا تعویذ اور جھاڑ پھونک کی تدبیریں
ہونے لگیں۔ عامل، سائے، رمال، جوتشی پٹت آنے لگے اور دفعِ مرض کے لیے عجیب
عجیب تدبیریں بتانے لگے۔ اس سلسلے میں جوشعبدہ بانیاں دیکھنے میں آئیں ان کو
واجب علی شاہ نے تفصیل سے بیان کیا ہے۔ ذیل میں اس مقام کے چند نقل کیے جاتے ہیں

کوئی عالموں کو بلانے لگا جنوں ہو گیا جن بتانے لگا
مری والدہ اور کتنے محل لگیں کہنے سننے پہ کہنے عمل
ہوئی عالموں کی جو ہر سونلاش وہ آئے کہ تھی جن کی فکر معاش
دعا پیشہ بازی گراں شگرت اسی فن میں جن کو ہوئی عمر صرف
بچھا تھا عجب دامن مکر و فریب میں ان سب میں تھا طائرنا شکلب
یہ سب کچھ ہوا مگر مرض بدستور قائم رہا اور ضعف بڑھتا گیا :

مردوں ضعف کا حال کینو مکر بیان کہ تھا تارِ سبتر تن ناتوان
یہ بے تاب و طاقت نل زار تھا کہ کروٹ بدلنا بھی دشوار تھا
مرض نے کیا ناتواں اس قدر کہ بند آنکھ رہتی تھی دد دوپہر
نکالتی نہ تھی کوئی صحت کی راہ عجب حال تا مدت پنج ماہ
اٹھاتا تھا ہر روز اک تازہ رنج عمل ہوتے تھے شام تک پنج پنج
گئے سیزدہ روز یونہی گزرے ہوئی زیت بے آب و دانہ بسر
طبیعیوں نے کیا کیا نہ دھن ملے کہ تبخیر کی سر سے آفت ملے

میں بحرِ تحیر میں رہتا تھا غرق
نہ ہوتا تھا سر کی حرارت میں فرق

شاہ جن کا قضیہ

جب دوا، دعا، عمل، ہوم وغیرہ سے کچھ فائدہ نہ ہوا تو بادشاہ کے چند نیشہ کشوں
نے سازش کر کے شاہ جن کا قصہ کھڑا کیا۔ ایک کشمیری صادق علی نام کفن دوزی کا پیشہ کرتا
تھا اور امجد علی شاہ کے عہد میں شاہ جن بن چکا تھا، اسی کو پھر شاہ جن بنایا۔ اس
سلسلے میں اقتدارِ الدولہ لکھتے ہیں :

”ایک مکان نخاس میں بنا کر اس میں ایک بُرج بنایا اور پھت اس کی پچ میں سے خالی رکھی یعنی خول رکھا اور راستہ اس پھت کے اندر جانے کا دوسرے مکان سے رکھا اور ایک شخص کشمیری تھا کہ وہ نہایت زود فزون تھا اور نام اس کا صادق علی تھا، اسے جن بنایا اور اس نے اس بُرج کے خول میں دوسرے مکان سے جا کر مثل جن کے باتیں کیں۔“

عظمت علی ناظمی کہتے ہیں کہ وہ مکان محلہ رستم نگر میں تھا۔ یہ بڑی بڑی کراستیں اس مصنوعی شاہ جن کی طرف منسوب کی گئیں اور بادشاہ کو اس کی مدد سے کامل صحت ہو جانے کا یقین دلایا گیا۔ اس سازش میں ایسے ایسے لوگ شریک تھے اور انھوں نے مکرو فریب کا ایسا جال بچھایا تھا کہ ہوشیار سے ہوشیار انسان بھی اس میں پھنس جائے۔ واجد علی شاہ کہتے ہیں :

”پچھانے زمانے میں دایم قریب	اڑے کیوں نہ ڈر ڈر کے مرغ شکب
عجب گرم بازار ابلیس ہے	جدھر دیکھے مکرو تلبیس ہے
حقیقت میں دنیا شب تار ہے	چراغ اس جگہ قلب بیدار ہے
دل صاف جن کا ہے اٹلے راز	دہ سب جانتے ہیں نشیب فراز
خدا نے کیا جن کو صاحب تیز	دہ رکھتے نہیں حیلہ گر کو عزیز
ہر اک بات کا فہم آسان ہے	مگو کیا کرے ؟ آخر انسان ہے
اثر کہنے سننے کو ہے بیش تر	گھلے کس طرح جھوٹی سچی خبر
خصوصاً ہو درپیش جب خون جواں	کرے صبر کیوں کر دلِ ناتواں

مرض کی دہ شدت کہ زائل ہو اس
نہیں پاس کوئی سوا ہے ہر اس

شاہ جن کے پردے میں بڑی بڑی نیرنگ سازیاں اور شعبہ بازیوں پوری تھیں کہ، ۲۶ ستمبر ۱۸۲۶ء (۲۲ نومبر ۱۸۲۹ء) کو اشفاق السلطان امراؤ بیگم نے اس سازش کا بھانڈا پھوڑ دیا اور صادق علی خاں کا قصور معاف کروا کے، ۱۸ محرم ۱۲۶۶ھ (۲ دسمبر ۱۸۲۹ء) کو اسے بادشاہ کے حضور میں پیش کر دیا۔ اس نے کل ماجرانہ صرف کہہ سنایا بلکہ کر دکھایا اور سازشیوں کے نام بتا دیے۔ ۲۵ مئی ۱۸۵۰ء (۱۲ رجب ۱۲۶۶ھ) کو بادشاہ کے حکم سے مرو جوڑتیں ملا کر چودہ آدمی گرفتار اور مقید ہوئے۔ جن میں اکثر بادشاہ کے خاص مصاحبوں میں داخل تھے۔ ان میں سے ۱۲ آدمی ۲ جون ۱۸۵۰ء (۲۰ رجب ۱۲۶۶ھ) کو اور بقیہ دو آدمی ۲۳ جولائی ۱۸۵۰ء (۱۱ رمضان ۱۲۶۶ھ) کو شہر بدر کر دیے گئے تھے۔ عبدالعلیم ناٹمی نے شاہ جن کا قضیہ یوں بیان کیا ہے، ۱۲۶۶ھ میں جب شاہ کی بیماری نے طول کھینچا اور علاج معالجے سے فائدہ نہ ہوا تو عاملوں اور فقیروں کی طرف رجوع کی گئی۔ انھیں دنوں میں کچھ لوگوں نے یہ ڈھونگ کھڑا کیا کہ "ایک دلاہتی آدمی کو جن بنایا اور محلہ رستم نگر میں ایک مکان کی دہری پھت بنا کر بیچ میں اس کو بٹھا دیا۔ پھر مشہور کیا کہ اس گھر میں ایک جن شہید مرد ہیں۔ حاجت روائی میں فرد ہیں" لوگ منتیں مرادیں مانگنے کے لیے جانے لگے۔ اس بات کے ہر طرف چرچے ہونے لگے۔ رفتہ رفتہ یہ خبر بادشاہ تک بھی پہنچی۔ انھوں نے اپنے معتمد مصاحبوں کے ذریعے سے اس کی تحقیق کروائی انھوں نے بحالت تصدیق کی۔ اس سلسلے میں چند آدمیوں نے سازش کر کے بادشاہ سے ہزاروں روپے اور اشرفیاں وصول کیں۔ مگر رقم کی تقسیم کے باعث آپس میں نفاق پڑ گیا۔ اور بھانڈا پھوٹ گیا۔ یہاں تک کہ اس مصنوعی جن نے خود حاضر ہو کر سارا ماجرا کہہ سنایا بلکہ کر دکھایا۔

۱۷ مثنوی عشق نامہ، صفحہ ۵۹، سفر نامہ سلیم حصہ اول، صفحہ ۴۲، و قضاہ عاثر

۱۷ سفر نامہ سلیم حصہ اول، صفحہ ۱۰۶-۱۰۷، رقم مر قعہ خدی

مختصر یہ کہ ۱۲۶۲ء کا کچھ آخری حصہ اور ۱۲۶۵ء کا پورا سال اور ۱۲۶۶ء کے ابتدائی دو تین مہینے (۱۲۶۸ء کے آخری حصہ سے ۱۲۷۵ء کی ابتداء تک) کوئی ڈیڑھ برس بادشاہ کی بیماری میں گزرا۔

۱۲۶۹ء کا پورا سال بادشاہ کو سخت بیماری اور خفقان اور خاموشی کے دوروں میں گزرا۔ سلیمین خود بادشاہ کی بیماری کی خبر المیٹ اور ڈیڑھ روزی کو براہ دیتا رہا۔ اسی ۱۲۶۹ء میں وہ کہتا ہے کہ اس وقت اودھ میں کوئی حکومت نہیں ہے۔ بادشاہ گویوں اور خواجہ مسطور کے سوا کسی سے نہیں ملتے ہیں۔ وہ پبلک معاملات سے بالکل بے خبر ہیں اور اس کی ان کو کوئی فکر نہیں ہے۔ یعنی بادشاہ کی شدید بیماری کا جس میں ان کی موت کا خطرہ پیدا ہو جاتا تھا، مطلق ذکر نہیں کرتا ہے بلکہ ان پر امور سلطنت سے غفلت کا الزام لگاتا ہے۔ گویے بادشاہ کا دل بہلانے کے لیے ضرور حاضر رہتے ہوں گے۔ لیکن سلیمین اس کو بھی بادشاہ کی غفلت شکاری کا سبب قرار دینا چاہتا ہے۔ نیم صداقت صریح جھوٹ سے بھی زیادہ خطرناک سمجھی جاتی ہے۔ سلیمین نے اپنے ۱۲۶۹ء کے خط میں لاٹو ڈیڑھ روزی کو لکھا کہ بادشاہ نے

تندرستی کی حالت میں بھی بہت کام کبھی نہیں کیا۔ اس وجہ سے ان کی بیماری اتنی محسوس نہیں کی جا رہی ہے جتنی کام کرنے کی حالت میں کی جاتی۔ پھر بھی وہ محسوس کی جاتی ہے اور وہ ایک نہایت ضروری امر میں یعنی محاصل کی وصولیابی میں حکومت کے مصارف تقریباً ایک کروڑ سالانہ ہیں اور وصولیابی اس سال بادشاہ کی بیماری اور فصل خریف کی خرابی کے باعث ساٹھ لاکھ سے زیادہ نہیں ہوئی۔ سوال یہ ہے کہ جب بادشاہ سلطنت کا کام کرتے ہی نہ تھے تو ان کی بیماری کے باعث محاصل کی وصولیابی میں اتنی کمی کیوں ہو گئی۔ ظاہر ہے کہ محاصل کی وصولیابی زیادہ تر بادشاہ کی توجہ خاص پر منحصر تھی۔ جب حلی بیگ سردار کے مندرجہ ذیل بیان سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے۔ وہ بادشاہی کے آخری سال کے بارے میں لکھتے ہیں:

1. Eighteen fifty seven by surendra nath

”۱۲۷۱ھ میں بادشاہ کی انتظام ملکی دہالی سے بے توجہی کے باعث روپے کی آمد و قوت ہوئی۔ ملازمین پر تکلیف گزرنے لگی تھی۔“

جب بہت دن تک طبیعت درست نہ ہوئی تو بادشاہ نے وہ احکام و قوانین جو اپنی سلطنت کی تھوڑی سی مدت میں نافذ کیے تھے ان کا مجموعہ دستور واجدی کے نام سے مرتب کیا اور یہ دستور اہل اپنے خسرو و وزیر علی نقی خاں کو عنایت کر کے ملک کا انتظام ان کے سپرد کر دیا اور اپنے علم و اطلاع کے موافق ان کو زبانی ہدایتیں کرتے رہے۔ دستور واجدی میں چھیاٹھ دستور ہیں جن کے تصویب کی فہرست اس کتاب کے ضمیمہ الف میں دیکھی جاسکتی ہے۔

بیماری کے دوران میں جب ذرافاقہ ہوتا تھا تو امور سلطنت خود یہ نفس نفیس انجام دینا چاہتے تھے لیکن اطباء ان کو فکر و تردد کرنے اور قلب و دماغ کو تکلیف پہنچانے سے سخت مانعت کرتے تھے اور عیش و سرور کے مشغلوں کو اصلاح مزاج کا بہترین علاج قرار دے کر ان میں مصروف رہنے کی تاکید باصرہ کرتے رہتے تھے۔ تقریباً ڈیڑھ سال میں بادشاہ کی طبیعت بالکل درست ہو گئی تو انھوں نے سلطنت کا انتظام پھر اپنے ہاتھ میں لینا چاہا۔ مگر معالجوں نے بہت اصرار کے ساتھ منع کیا اور یقین دلایا کہ امور سلطنت میں مصروفیت ان کے لیے بہت مضر ہوگی۔ ان مشوروں کا مطلب بادشاہ نے سمجھ لیا۔ اس طرح ریڈیٹنڈ نے معالج کے طبی مشوروں کے پرہیز میں واجد علی شاہ کو امور سلطنت انجام دینے سے روک دیا۔ ۱۲۷۵ھ کے اوائل میں بادشاہ کو ذہن نشین کرایا گیا کہ ان کی زندگی اور بادشاہی دونوں کا انحصار اس پر ہے کہ وہ سلطنت کے کاروبار سے کلیتہً علیحدگی اختیار کر لیں۔

اب بادشاہ امور سلطنت سے بالکل دست کش تو نہیں ہو گئے مگر ان کی مصروفیت

میں بہت کم ہی ہو گئی۔ جوان سال اور جوان بہت بادشاہ کی فعال طبیعت پہلی تو بیٹھ نہیں سکتی تھی، انہوں نے اپنے وقت کا بہترین مصنف نکال لیا۔ کئی وسیع اور پر فضا بارغ لگائے، بہت سی شان دار عمارتیں بنائیں، فنون لطیفہ، موسیقی، اداکاری، شاعری کو ترقی دی اور اپنے وقت کا معتدبہ حصہ کتابوں کی تصنیف و تالیف میں صرف کیا۔

بادشاہ کی صورت اور سیرت

واجد علی شاہ مردانہ حسن کی مثالی تصویر تھے۔ جن لکھنے والوں نے بادشاہ کے صفات ثنائی نظم میں بیان کیے ہیں، انہوں نے ان کے حسن صورت کا بھی اکثر ذکر کیا ہے۔ وہ تندر اور عونا جوان، درشتی بدن کے نشہ زد شخص تھے۔ علاوہ ادراکالات کے زور و طاقت کا یہ عالم تھا کہ چٹکی سے سکے کے نقش مٹا دیتے تھے اور سکے کو دبا کر گولی بنا دیتے تھے۔ یہ حسن سیرت میں نہ حسن صورت سے بھی بڑھ کر تھے۔ ان کی سیرت کے متعلق چند واقعات حال لوگوں کے بیانات درج کیے جاتے ہیں۔ بادشاہ کے مزاج اور طبیعتی خصوصیات کا ذکر سب سے پہلے ہم کو اودھ کے رینڈیڈنٹ سلیم کے سرکاری خطوط میں ملتا ہے۔ واضح ہے کہ سلیم کوواجد علی شاہ کا دوست اور ہی خواہ کیٹی نہیں سمجھ سکتا۔ اس کے اصل انگریزی فقرے تاریخ دار لکھے جاتے ہیں۔

OCTOBER 11, 1849 — HE HAS NEVER BEEN A CRUEL
OR BADLY DISPOSED MAN.^۲

JANUARY 12, 1853 — HE IS NEITHER TYRANNICAL
NOR CRUEL.^۳

JUNE 1, 1854 — THERE NEVER WAS ON THE
THRONE I BELIEVE, A MAN MORE INOFFENSIVE
OF HEART THAN HE IS.^۴

۱۔ چنستان مظفر پور وواجد علی شاہ اور ان کا عہد ۱۸۵۳ء مکتوب سلیم بنام سر
ہنری ایلیٹ سکرٹری گورنر جنرل ۲۔ مکتوب سلیم بنام سر جیمز ۳۔ مکتوب سلیم بنام کرنل گو

ترجمہ:

۱۱ اکتوبر ۱۸۴۹ء - وہ ظالم یا بد مزاج شخص کبھی نہ تھے۔

۱۲ جنوری ۱۸۵۳ء - وہ نہ ظالم ہیں نہ بے رحم۔

یکم جون ۱۸۵۴ء - میں سمجھتا ہوں کہ ان سے زیادہ مرخاں مرخ طبیعت کا آدمی تخت شاہی پر کبھی نہیں بیٹھا۔

مرزا محمد تقی نے اودھ کی شاہی کا آخری زمانہ اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ وہ داج علی شاہ کے عہد میں کھنڈ میں موجود تھے۔ غدر کے وقت ان کی عمر تقریباً چالیس برس کی تھی۔ انھوں نے آفتاب اودھ کے نام سے اودھ کی تاریخ ۴۵ - ۱۸۴۴ء میں یعنی انتر راع سلطنت کے اٹھارہ اٹیس برس بعد لکھی۔ وہ اس کتاب میں داج علی شاہ کے بارے میں لکھتے ہیں:

”اس بادشاہ عالی جاہ کو خدا کے تعالیٰ نے بہت صفات حمیلہ عطا

فرمائے ہیں۔ اذل حلیم اور انکسار کہ باوصف ایام جوانی اور حکومت و سلطنت کے کبھی کسی پظلم و جبر نہیں کیا۔ بلکہ تمام عمر لفظ درشت یا دشنام وغیرہ کبھی زبان مبارک پر نہیں آیا۔ دوسرے عدالت کہ جس مقدمے کی اہل کو خبر پہنچی کبھی انصاف کو ہاتھ سے نہ دیا۔ تیسرے صلاح و تقویٰ کہ اگرچہ عین شباب میں سلطنت ملی مگر خیال سے نوشی بلکہ جملہ مسکرات وغیرہ امور منہیہ شرعیہ کا پیرامون خاطر خاطر نہ ہوا۔ پابندی صوم و صلوة میں کبھی فرق نہ آیا۔ چوتھے قابلیت و استعداد کہ باوصف تہذیب و سلطنت کے چند مشنویاں اور رسا کل

۱۳ مرزا محمد تقی کے والد محمد زخاں معروف بہ مرزا خانی سرکار انگریزی کی ملازمت ترک کر کے محمد علی شاہ کے عہد سلطنت میں دہلی سے لکھنؤ آئے اور کل مالک خرد و سرسلطانی کے صدر امین اعلیٰ کے منصب جلیل پر فائز ہوئے اور آخر عمر تک اسی منصب عالی پر مامور رہے۔ مرزا محمد تقی کے فرزند میرے مخلص اور محترم عنایت فرماؤں اور محمد علی شاہ کے مخلص اور مخلصوں کے مصنف تھے۔

علم موسیقی وغیرہ میں اور دیوان شعر تصنیف کیے۔ پانچویں ذہن زد کا کہ جس کام کی طرف اندک توجہ فرمائی اس کو بہت جلد تکمیل کو پہنچایا۔ علاوہ ان کے اور بھی بہت صفات نیک کے جامع ہیں۔ ابتدائے زمانہ سلطنت میں جس وقت ملاحظہ کا غدامت ملکی دہالی فرماتے تھے بمقتضای ذکاوت خلقی ایسی ایسی باریکیاں نکالتے تھے کہ بڑے بڑے دانش مندوں کے ہوش جاتے تھے۔ حضرت بادشاہ کے مزاج میں شوق ایجاد لہے تازہ بہت تھا۔ پوشاک و لباس و عمارات اور ان کی آراستگی میں ایسے ایسے عمدہ ایجاد کیے کہ دیکھنے سے تعلق رکھتے تھے۔

عظیم آباد کے عالم اور صوفی مزاج شاعر شاہ الفت حسین فریاد موسوی قادری نے اپنی بلند پایہ اخلاقی اور فلسفیانہ مثنوی دبستان اخلاق ۱۲۶۰ھ میں شروع کی جیسا کہ وہ خود لکھتے ہیں:

فروز بہ سزاؤ و دود و بدبختی
کہ بزم بہ تحریر اس نامہ دست
اس کا اختتام واجد علی شاہ کی معزولی کے تیرہ برس بعد ۱۲۸۵ھ میں ہوا۔ اس مثنوی میں ایک عنوان ہے ”در تائش اعلیٰ حضرت علیہ السلام خلافت پناہی گوید“ اس عنوان کے تحت بادشاہ کے ترک سلطنت کا ذکر یوں کیا ہے۔

جہاں را بہاں دارد الا گھر نیا درد چو ذرہ در نظر
براد رنگ و چتر آستین بر فشانہ سر بے نیازی بہ گردوں رساند
بہ دین پروری گوئے دولت بہرزد کہ دنیا بہ دنیا پرستان سپرد
وہ بادشاہ کا نام ان صفتوں کے ساتھ لیتے ہیں۔

خدیو خدا جوئے سلطان خصال جہاندار جم جہاں یوسف جمال

لے آفتاب اودھ قلبی

شہ دودمانِ قرا یوسفی میر آسمانِ قرا یوسفی
 جہاں داد و ترکمانی تبار پدر یر پدر خسرو نام دار
 فرازندہ چتر جہاد جلال فرد زندہ بزم فضل و کمال
 اور ان کے تین خاص اوصاف تواضع، عفو، صبر یوں بیان کرتے ہیں۔

سہ وصف گرائی زاد اوصاف او بود جمع کمتر در اصناف او
 تواضع کہ باشد زاد اوصاف خاص بدیں وصف ادبش خدا اختصا
 ندیدہ است و تشدید کس نہ ہوا بدیں در جہانت ادگی از شہاں
 زہر شے کم و بیش دار بچشم دلے خویشتن را نیار و بچشم
 فضائل از قسط تیر ازد و ز ظہور ز خورشید تاباں چو تابندہ نور
 بود عفو در ذات آں بحر جود چو غلے کہ با شخص دارد وجود
 دگر وصف محمود صبر جمیل کہ باشد کلید جزائے جزیل
 شاد عظیم آبادی اپنے استاد شاہ فریاد کے بیان کی تصدیق یوں کرتے ہیں۔
 "حضرت نے یاد شاہ ممدوح کے تین اوصاف گنوائے ہیں: ۱۔ عفو کا
 خوب جانتے ہیں کہ بالکل سچی تعریف ہے سلطنت کے زمانے میں بھی
 یہ اوصاف یکساں تھے"

جلیل القدر عالم، فارسی و عربی کے بے مثال ادیب و شاعر، کثیر التعداد کتاہوں
 کے مصنف، مفتی میر علی اس شہسری نے واجد علی شاہ کے انتقال کے بعد ان کا ذکر
 یوں کیا ہے۔

"واجد علی شاہ سی و دو سال بعد انتزاع سلطنت درصائب
 شدیدہ از حبس خودش فوت الہدہ و برادر ولدش تعین صدر ہزار و پسیہ ماہواری

بادجو گرفتاری و گرفتاری کمال تواضع و خاکساری و عزاداری و نماز
گزارش و غریب پروری و ہر گسری شیعہ و شعار خود ساختہ و طرح عمارت
سازی نقش و نگارے کہ چرخ رنگاری ندیدہ انداختہ و زیادہ از نصف شہر
خود برائے ملازمان کا گزاران مقرر بہ پرورش غریب پر داختہ ہے

دیر الانشا منشی محمد ظہیر الدین خان بہادر بلگرامی جو ادھ کے آخری تین بادشاہوں
کے عہد میں شاہی دارالانشا کے میسنری رہے تھے اور سلطنت کے معاملات اور بادشاہوں
کے حالات سے خوب واقف تھے، واجد علی شاہ کے متعلق لکھتے ہیں کہ یہ بادشاہ ظہیر رحمٰن
رحیم رحمت مجتہم اور خیر محض ہے۔ اس عیسے کے ثبوت کے لیے بہت سی لیلیں اور واقعات موجود ہیں۔ یہ
بھی منشی ظہیر الدین آگے چل کر لکھتے ہیں کہ اگر بادشاہ کے خلقی اخلاق اور فطری تواضع
کی حکایتیں لکھی جائیں تو دفتر کے دفتر ناکافی ہوں گے۔ یہ قاعدہ مقرر اور بادشاہوں کے
آداب میں داخل ہے کہ اپنی زبان و قلم سے خود کو مابدولت و اقبال کہتے اور لکھتے ہیں۔ ہم
نے فرمایا، ہم نے ارشاد کیا، ان کے قلم اور زبان کے محاورات ہیں۔ بادشاہ کے دست خاص
کی تحریروں میں یہ چیز دیکھنے کے قابل ہے کہ اپنے ادنیٰ ادنیٰ ملازموں، تابع داروں اور محکموں
کے نام تحریروں سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ یہ سلطان عالم والی ملک ادھ کے قلم کی ہیں بلکہ
ایسی ہیں جیسی دوست اپنے دوستوں کو مقام مساوات میں لکھتے ہیں۔

اس متواضع اخلاقت بادشاہ کے یہاں شعرا کی صحبت مشاعرہ اور فقر کی محفل
حال و قال میں بالکل تیسرہ ہوتی تھی کہ اس صحبت میں حاکم اور سردار کون ہے یہ
سنا گیا ہے کہ بادشاہ اکثر صحبتوں اور تقریبوں میں ہمانوں کی خاطر تواضع اور
ہمانی کے لوازم ادا کرنے میں خود بنفس نفیس مصروف رہتے تھے اور بادشاہی کی عظمت اور
دب سلطنت کی پروا نہیں کرتے تھے یہ

۱۔ تجلیات حقہ رقم منہ ۱۸۰۰ ۲۔ اسلحہ اجدی قلمی ص ۱۷۰ ۳۔ اسلحہ اجدی ص ۱۷۰ ۴۔

عظمت علی ناسی کا کوردی لکھتے ہیں :

”مزاج میں خوبے عجز و خاکساری حد کی... حجامس عزا داری عشرہ
محرم اور نماز جمعہ میں اعلیٰ اور ادنیٰ پاس برابر کھڑا ہوتا، ظلی الشہ سے سایہ
برابر رہتا۔ مہنیاں سے قطعاً پرہیز تھا۔ مسکرات معاذ اللہ کبھی آنکھ سے
نہ دیکھے“

حکیم محمد کاظم اپنی کتاب سوانح عمری میں لکھتے ہیں :

”ہنگام صحبت باندہ بیان خود نہایت گفتمہ روی و خوش خلقی می داشتند
شائبہ اکبر و خوش چنان کہ از عادات ملوک می باشد در طبع ہمایوں نبودہ“
ترجمہ : _____ اپنے مصاحبوں کی صحبت میں نہایت گفتمہ زاد و خوش خلق
رہتے تھے اور غرور و تکبر جو بادشاہوں کی عادت ہوتی ہے اس کا شائبہ بھی
ان کی طبع مبارک میں نہیں تھا۔

مولوی سید غلام حسنین قدر بلگرامی جو کیننگ کالج لکھنؤ میں فارسی کے پروفیسر رہے تھے
اور کالج کی عمارت کا لاجواب قطعہ تاتریخ جو انھوں نے کہا تھا وہ کالج کے ہال کے بڑے
دروازے پر اب تک لگا ہوا ہے۔ وہ بادشاہ کے بارے میں لکھتے ہیں :

”بالفضل کلکے میں رونق افروز ہیں۔ بڑے رحم دل، دیں دار، پایندہ

شرعیات، سخن داں اور علم موسیقی میں کامل ہیں“

صفیر بلگرامی شاہ معزول مقیم کلکتہ کی مدح میں لکھتے ہیں :

”ہمارا بادشاہ گیتی پناہ حسنین، خوب صورت، نامور، باذل،

شجاع، معجز گت تر طبع عالی خداداد، عدل و انصاف سے رعایا پر ارشاد“

لہ مرقع خسری قلی ورق ۱۵۵ء سوانح عمری ص ۳۳۳ مجموعہء سخن حصہ اول۔

صفحہ ۱۵ پرستان خیال پردہ اوّل صبح خندان

مولوی عبدالحکیم شرر لکھتے ہیں :

”واجد علی شاہ کی ذات میں اگلی اسلامی معاشرت کی اصلی تصویر
نظر آتی تھی۔ تہذیب تھی، دیں داری تھی، قدر دانی تھی اور انتہا دلچسپ
کی قناعت اور خود فراموشی تھی“

نجم الغنی رام پوری کا بیان ہے :

”چند اوصاف اس بادشاہ کے قابل ذکر ہیں۔ یہ بادشاہ اس قدر
رحم دل اور رقیق القلب تھا کہ باوجود اس قدر سلطنت اور زور و زور کے
اس سین شباب میں کسی پریش اور بے چہمی نہیں کی بلکہ گالی تک بھی زبان پر
نہیں آئی۔ نہ کسی موافق اور مخالف کو ظلم سے ستایا، نہ کسی کی جان لی یا جوڑ
اس سلطنت اور جاہ و حشمت اور شباب کے اس بادشاہ میں غرور و نخوت
جس سے ہزاروں میں کوئی امیر خالی نہیں ہوتا نام کو نہ تھا۔ مگر بدلت
برسی مست نہ گردی مردی“

میں احمد جعفری لکھتے ہیں :

”واجد علی شاہ... بڑے صاف گو بھی تھے۔ جودل میں وہ زبان پر
لگی لپٹی رکھنے کے قائل نہیں تھے۔ انھوں نے اپنی زندگی کا کوئی گوشہ
نہیں چھپایا، اچھا یا بُرا، سیاد یا سفید، روشن یا تاریک۔ جو کچھ دیکھا
جو کچھ کہا، جودل میں خیال آیا اس تک کو بغیر کسی جھجک اور تامل کے بیان کر دیا۔
سر سید رضا علی جو انگریزوں کی حکومت میں افریقہ کے ایجنٹ جنرل کے اعلیٰ منصب پر فائز
رہ چکے تھے اپنی سوانح عمری اعمال نامہ میں لکھتے ہیں :

۱۔ حزن اختر۔ مقدمہ ص ۵۲ تا بیچ آدھ حصہ۔ خیم ۱۳۸-۱۳۹ ۵۳

”شخصی طرز حکومت کی سب سے آخری مثال اودھ کی سلطنت تھی جس کا خاتمہ لارڈ ڈالہؤزی کے ہاتھوں ہوا۔ انگریز مورخ جو کچھ کہیں ہمارے وہ بزرگ جنہوں نے واجد علی شاہ کا دور دیکھا تھا اور جو ضبطی سے پہلے کے حالات سے واقف تھے، سلطنت اودھ کو ملک کے لیے مفید اور آخری فرماں روا کو ان حالات کے تحت جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے عمالی نے اودھ میں پیدا کر رکھے تھے معذور اور مجبور سمجھتے تھے۔۔۔ فوجی ملازمت کے تعلق سے نانا صاحب بھی عرصے تک اودھ میں رہے تھے اور ضبطی سے پہلے رعایا کی خوش حالی کا تذکرہ اکثر فرماتے تھے۔ اس دور کا لکھنؤ علوم و فنون کا مرکز تھا۔ خود واجد علی شاہ کو فن عمارت میں یدِ طولی حاصل تھا لکھنؤ کے علاوہ جب جلالہاٹن کر کے کلکتے بھیجے گئے تو وہاں بھی اچھی اچھی عمارتیں مٹیاجرج میں بنائیں۔ ہر فن کے اساتذہ اس فرمانروا کے عہد میں موجود تھے۔
پری پورنانشند درما اپنی ہندی کتاب میں لکھتے ہیں :

”جو لوگ خدا اور قسمت میں اعتقاد رکھتے ہیں انھیں بادشاہ کی زندگی سے یہی پتہ چلے گا کہ سبھی خوبیاں اور صلاحیتیں ہوتے ہوئے بھی اگر خدا کی مرضی نہیں ہے تو انسان کا کچھ بس نہیں چلتا۔ واجد علی شاہ ایسے ہی اولوالعزم، بلند ہمت، خداترس، رحم دل اور نیک چلن بادشاہ تھے۔ ان میں دورانہیشی کی کمی تھی لیکن انتظامی صلاحیت کی ان میں کمی نہ تھی، ان میں تاہل تھی۔ ریاست میں وہ ناکامیاب ہوئے پھر بھی ان میں جمود نہیں آیا۔ جیسے جیسے سلطنت کا کام کرنا غیر ممکن ہوتا گیا وہ ادب، موسیقی، ناٹک، کتا میں اور تاریخی مواد جمع کر کے ہندو مسلم اتحاد اور دوستی کے کلچرل کاموں کی طرف متوجہ

ہوئے۔ ہندوستانی فن اور کلمہ کی حفاظت کا انھوں نے اہم کام کیا۔ کسی تشریف
گھر کی لڑکی کی طرف انھوں نے کبھی بُری نظر نہیں ڈالی۔ زبردستی کسی کو اپنی
بیوی بنالینا یا کسی غیر مسلم لڑکی سے ناجائز تعلقات پیدا کر لینا انھوں نے
سیکھا ہی نہ تھا۔۔۔ سب بڑی بات یہ تھی کہ ان میں فرقہ واریت چھوٹک نہیں
گئی تھی۔ وہ حقیقت میں سچے ہندوستانی تھے۔

واجد علی شاہ کی مصنف مزاجی کا ذکر کئی مورخوں نے کیا ہے۔ مرزا محمد تقی نے اقبالِ دہ
میں لکھا ہے کہ ”جس مقدمے کی ان کو خبر پہنچی کبھی انصاف کو ہاتھ سے نہ دیا۔“ نجم الغنی نے
تاریخِ آودھ میں لکھا ہے کہ ”یہ بادشاہ اپنی ذات سے عادل تھا۔ کسی بوائے یا مخالف یا امیر
یا لگانے کی عدل میں رعایت نہیں کی۔“ اسی تاریخ میں ہے کہ میر محمدی حسن اڑوہ عمارات
سلطانی بمقابلہ امائی بیگم داروہہ سرکار محذوہ عظمیٰ کے مقدمے میں ”بادشاہ نے جو عدالت
فرمائی وہ مشنوی دودۃ التاج میں نظم ہے۔“

بادشاہ کی عدالت کے واقعات میں سے ایک واقعہ یہ ہے کہ ایک دن بادشاہ باغ
کی سیر سے واپس آ رہے تھے کہ ایک ستم زدہ بڑھیا نے اپنے کو گھوڑے کے سموں پر ڈال لیا۔ بڑھیا
شاہی نے دریافت حال کر کے عرض کیا کہ اس بڑھیا کی ایک نوجوان بہت خوبصورت لڑکی تھی۔
قبضے کا زمیندار اس کے گھر میں گھس کر لڑکی کو اٹھالے گیا اور اپنے گھر میں ڈال لیا۔ اب بڑھیا
انصاف کی استدعی ہے۔ اس بے اعتدالی کو سن کر مارے غصے کے بادشاہ کانٹے لگے۔
کلام میں لکھت پیدا ہو گئی۔ فوراً ملازمان حاضر کو حکم شدید دیا کہ اس فتنے کا تدارک کیا جائے۔
وہ لوگ بہت جلد اس موضع میں پہنچے جہاں یہ واقعہ پیش آیا اور اس زمین دار کو گرفتار
کر کے سخت سزا دی اور اس کے گھر میں آگ لگا کر اس کو مہدم کر دیا اور لڑکی کو اس کے
گھر سے نکال کے اس کی ماں کے سپرد کر دیا۔

۱۔ واجد علی شاہ اور آودھ راج کا پتہ ص ۷۷ تاریخِ آودھ حصہ پنجم ص ۱۳۹

ایک دوسرا واقعہ یہ ہے کہ ابراہیم خاں اور جہانگیر خاں کا ایک موضع میں ایک باغ تھا جو ان کا ذریعہ معاش تھا۔ اتفاق سے بادشاہ نے وہ موضع نواب خسرو محل کی جاگ میں مرحمت فرمادیا۔ محل مذکور کے داروغہ نے اس باغ پر بھی قبضہ کر لیا اور اس کے کچھ درخت کٹو لیے۔ ان بیچاروں نے بہت ماتمہ پاؤں مارے مگر کہیں شنوائی نہ ہوئی۔ یہاں تک کہ عدالت سے رجوع کیا وہاں بھی کسی نے ان کی فریاد نہ سنی آخر اپنی زندگی سے تنگ آکر ایک عرضداشت میں اپنے حالات لکھ کے سواری کے وقت بادشاہ کی خدمت میں پیش کر دی۔ بادشاہ ان کو مطمئن کر کے محل شاہی میں داخل ہو گئے اور اسی وقت بغیر نفیس اس محل میں تحقیق کر کے سالکوں کی داد دہی فرمادی۔ محل مذکور بادشاہ کی منظور نظر تھیں۔ انھوں نے بہت خاک چھانی اور آسمان وزمین کے قلابے ملائے۔ مگر بادشاہ نے ان کے التماسوں پر مطلق توجہ نہ کی اور فرمایا کہ امور عدالت میں تمھاری رعایت کسی طرح نہ کی جائے گی۔

بادشاہ کی اسی انصاف پسندی کا نتیجہ تھا کہ انصاف کی گرم بازاری رہتی تھی۔ ملک کی آبادی میں زیادتی اور زراعت میں ترقی ہوتی رہتی تھی۔

ظہیر الدین نے اسرار واجد میں لکھا ہے کہ ۱۲۶۷ھ میں بادشاہ کی انصاف پسندی کا ایک خاص واقعہ پیش آیا اور عجیب بات ہے کہ ”عدالت خاقانی“ کے فقرے سے اس کی تاریخ نکلتی ہے۔ ۲۷ صفر کو بادشاہ کے حضور میں ایک پرچہ اخبار گزارا کہ نواب نشاط محل کے عزیز میر محمد باقر کے حکم سے ان کے نوکر نے فلاں ہندو گسکے کے سر پر تلوار کا قبضہ مارا جس سے وہ مر گیا۔ اس پرچے پر حسب رابطہ وزیر اعظم حضور عالم نے داروغہ دیوان خانہ کے نام یہ حکم لکھ دیا تھا، ”مصلح السلطان بہادر کیفیت راست براست دریافت بعض رسائے بادشاہ نے کہا کہ در عظم اور داروغہ اور داروغہ دیوان خانہ نشاط محل کے توسل کی بنا پر تعینت کی داد دہی کیا حق نہ کریں گے۔“

۱۷ ہجری ۱۲۸۰-۱۲۹۱ ۱۷ نواب نشاط محل سید انشا کی نوادی واجد علی شاہ کی محل تھیں۔

اس لیے اس مقدمے کا فیصلہ میں خود کروں گا۔ اس اثنا میں محل مذکور نے بڑی تمنا اور پشیمانی کے ساتھ اجازت چھوڑی چاہی مگر کسی طرح نہ ملی۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ تحقیقات اور دیکھاری کے بعد حکم شرع ہوگا اس پر عمل کیا جائے گا۔ بادشاہ کی تجویز کے مطابق مقتول کی وارث عورتیں بڑی خاطر اور عزت کے ساتھ نثار محل کے پاس پہنچائی گئیں۔ محل مذکور نے ان کے قدموں پر سر رکھ کر معافی کی درخواست کی۔ محل کی تمام عورتیں یہ حالت دیکھ کر لرزے لگیں اور انھوں نے بھی ان کے قدموں پر سر رکھ دیے۔ ان عورتوں نے آٹھ سو روپے لے کر رخصتی نامہ لکھ دیا۔ یہ رخصتی نامہ بادشاہ کے ملاحظہ سے گزرا اور یقین دلایا گیا کہ تلوار کا قبضہ قتل کے ارادے سے نہیں مارا گیا تھا، اس کی موت اتفاقی ہے۔ اس کے بعد بھی ارشاد ہوا کہ جو حکم شرعی ہے وہ ضرور جاری ہوگا اور کسی کی سفارش نہ سنی جائے گی۔

ظہیر الدین نے واجد علی شاہ کی رعایا پروری کا ایک واقعہ یہ لکھا ہے کہ دلی عہد کی شب بکھاج کو بڑے جاہ و چشم کے ساتھ بادشاہ کی سواری مع نوشاہ کے دھن کے گھڑ پر تھی۔ راستے میں لوہے والے پل کے قریب ایک تیز زدہ ہاتھی کے دھکے سے ایک حلوائی کی دوکان کا ایک کونا گر گیا۔ اس روادری میں بادشاہ نے اپنی سواری فوراً روک لی باصرار عرض کیا گیا کہ نکاح کی راعیت نکلی جاتی ہے، اس تنگ وقت میں توقف مناسب نہیں ہے۔ حلوائی کو بہر حال رخصتی کر لیا جائے گا۔ لیکن بادشاہ کی عدالت پسند طبیعت نے یہ بات پسند نہ کی۔ اپنی سواری کے ہاتھی کو اس کی دوکان پر پہنچایا اور اس کو رخصتی اور مالال کی بغیر ایک قدم آگے نہ بڑھایا۔

بادشاہ کی رعایا پروری اپنی معزولی کے بعد
انتراع سلطنت کے بعد تمام شہر کھنڈ اور اہل کھنڈ کو ہینے تک قتل و غارت عام
میں مبتلا رہے۔ اس سب پطرہ یہ کہ انگریزی فوجوں کے قتل عام اور تاراج تمام سے جو لو

شہر چھوڑ کر بھاگ رہے تھے ان میں شہر کے یہ معاش شریک ہو کر آپس میں قتل و غارت کرنے لگے۔ سیکڑوں پر دہشتیں اور باعزت عورتوں نے اپنی لاشوں سے کنویں پاٹ دیے۔ یہ اس زمانے میں کھنڈ کے مہیبت زدوں کی امداد کے لیے بادشاہ معز دل نے بے حساب نقد، جو اسہرات اور زیورات وقت عام کر دیے اور اس سلسلے میں لاکھوں روپے کے مقروض ہو گئے، حالانکہ خود اس زمانے میں فورٹ ولیم میں مقید اور بے حد تکلیفوں میں مبتلا تھے۔

بادشاہ کے مصاحب

واجہ علی شاہ پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ ڈوم ڈھاری ان کے خاص مصاحب تھے جن کو وہ بڑے بڑے خطابات دیتے تھے اور اپنے اپنے منجھے منجیوں پر مقرر کرتے تھے اس سے یہ نتیجہ نکالنا مقصود ہوتا ہے کہ ان کی طبیعت میں بلندی نہ تھی۔ گویا وہ ہمیشہ ایسے ہی پست طبقوں کی صحبت میں رہا کیے۔ اس الزام میں صرف اتنی صلیت ہے کہ بادشاہ نے دلی عہدی کے زمانے میں پریوں کو یعنی اپنے مدرسہ موسیقی کی طالبات کو تعلیم دینے کے لیے چند منجی ملازم رکھے تھے۔ بادشاہ ہونے کے بعد جہاں بہتوں کو خطاب دیے وہاں ان ملازمین سابقین سے بھی بعضوں کو خطاب دیے اور شاید ایک دو کو جو ذی استعداد تھے کوئی منصب بھی دیا۔ لیکن کسی کا یہ عروج سال ڈیڑھ سال دو سال سے زیادہ نہیں رہا۔ اس مختصر مدت میں بھی وہ اپنی بے راہ روی کے باعث معزوب، مدبار سے موقوف، مقید اور شہر بدر ہوتے رہے۔ ان گانے بجانے والوں میں بعض بہت اچھی استعداد رکھتے تھے۔ ماسر تا ازوار قطب علی خاں قطب الدولہ کے متعلق بادشاہ کا بیان ہے۔

وہ قطب علی خاں صاحب شعور کہ ہیں قطب چرخ ولائے حضور

بجالتے ہیں وہ خوب ایسا ستار
 سزا کے ان میں کئی ہیں کمال
 کہ اس فن میں ہیں صاحب اعتبار
 ہنیم و عقل و خجستہ نصال
 نہیں راگ کے فن میں یہ بین بین
 نہیں ہیں فقط ستار انتخاب
 زبان عجم میں عدیم المثال
 سخن دان ہنر سنج معنی شناس
 لے یہ کمال ان کو اقبال سے
 صفا پیشہ آغاز موعے بدوت
 جو راجا جگت دیو تھے پیش تر
 یہ اولاد میں ان کی ہیں نام ور
 زیادہ نہیں عمر سی سال سے
 بریلی مکاں قوم کے راجپوت
 بہت صاحب رائے و عقل قیاس
 زیادہ نہیں عمر سی سال سے
 بریلی مکاں قوم کے راجپوت
 یہ اولاد میں ان کی ہیں نام ور

کوئی ان سے پوشیدہ شریعت تھا
 بہ ظاہر مگر کوئی مذہب نہ تھا

ایک موقع پر قطب الدولہ نے اپنے ہم پیشہ لوگوں کی حمایت میں بادشاہ کے استفسار کا غلط جواب
 دیا۔ اس لیے ان کے ساتھ وہ بھی معتوب ہو گئے اور انھیں کے ساتھ شہر بدر کر دیے گئے۔
 ۲۲ جون ۱۸۵۷ء کو ریزیڈنٹ نے گلے بجانے والوں کو کوئی مضب حاصل کرنے
 سے روکنے کے لیے ایک اقرار نامے کا مسودہ پیش کیا۔ بادشاہ نے ایک دو معمولی تبدیلیاں
 کر کے اسے منظور کر لیا اور ریزیڈنٹ کو اختیار دے دیا کہ وہ اس طبقے کے ناپسندیدہ افراد کو
 ملازمت سے بطرف اور ملک سے خارج کر سکتے ہیں۔
 چند ماہ میں موسیقی کا شاہی دربار سے چند روزہ تعلق اتنا بڑھا چڑھا کے بیان کیا
 گیا ہے گویا وہ لوگ اور صرف وہی لوگ بادشاہ کے مستقل مصاحب تھے۔
 منشی ظہیر الدین بلگرامی اپنی کتاب اسرار حکمت میں لکھتے ہیں :

”بعد انخراج مطربان فریب کار... اکثر شعرائے صاحب استعداد
نامی و معزز بہ مصاحبت و تقرب خاص عزت امتیاز یافتہ اکثر اوقات صحبت
را بذکر شعر و سخن و تحقیقات صحت الفاظ و تصنیفات کتب نوازیخ و سوانح و
نظم و رد و ناچیز و اکثر رسائل در علوم ہر قسم گرم می داشتند“

ترجمہ : فریب کا مطربوں کے انخراج کے بعد اکثر ذہنی استعداد نامی اور معزز شاعروں کو
مصاحبت اور تقرب خاص کا اعزاز و امتیاز عطا کر کے اکثر اوقات شعر و سخن
کے ذکر، صحت الفاظ کی تحقیق، کتب تاریخ و سوانح و نظم و رد و ناچیز اور ہر طرح
کے علوم میں رسائل کی تصنیف سے صحبت گرم رکھتے تھے۔
گوئیوں کو نکال دینے کے بعد بادشاہ نے پانچ شاعروں کو یعنی فتح الدولہ برقی،
مقبول الدولہ قبول، آفتاب الدولہ قلی، ہر الدولہ سیرنگی اور تہبیر الدولہ اسیر کو خلعت
دے کر مصاحبان خاص کا امتیاز بخشا۔
کتاب گم نام کے مصنف کا بیان ہے :

”اکثر جلسہ بافضلا و شعرا و دبیران می دارند و قدر دانی ارباب ہنر
بدرجہ اتم می فرمایند“

ترجمہ : اکثر عالموں، شاعروں اور انشا پردازوں سے صحبت رہتی ہے اور ہنرمندوں کی
انتہائی قدر دانی فرماتے ہیں۔
بادشاہ نے قدیمی نااہل مصاحبوں کو نکال کرنے، مصاحب منتخب کرنے کا ذکر
یوں کیا ہے :

قدیمی مصاحب جو تھکے و فنا میرا فریب و سرا سر دینا
غلام رضا اور اس کے عزیز وہ گھٹن وہ قطب علی بے تمیز

نکالے گئے جب میں قید و بند پریشاں ہوئی خاطر مستمند
مصاحب نے پھر کیے انتخاب کہ میں کامل و شاعر لا جواب

ان مصاحبوں کے نام بتائے ہیں جو حسب ذیل ہیں :
فتح الدولہ بہادر (برق)، مقبول الدولہ (قبول)، خواجہ سید (قلق)، مظفر علی بہادر
بہادر حسین، سید ذکی۔

یہ صاحب و ذاب صاحب بنی خاص میسر انھیں رتبہ اختصاص
محبت کا مجھ سے یہ دل میں و نور کہ ہر وقت حاضر ہیں پیش حضور
میں ان حکایات ہنسی و حال مراجی بہلتا ہے ان سے کمال
اس کے بعد لکھا ہے کہ مقبول الدولہ و مظفر علی مسیے کے کہیں کے دوست ہیں۔ فتح الدولہ چچا
پشتوں سے سرفروش ہیں۔ مظفر علی کو 'خاں بہادر' کا خطاب دیا اور ان کو خاص دفتر
شاہی میں منشی مقرر کیا۔ میرزا احمدی کو مقبول الدولہ بہادر خطاب دیا اور ان کو خاص دفتر
شاہی میں منشی مقرر کیا۔ میرزا احمدی کو مقبول الدولہ بہادر خطاب دیا اور اسکے دولت ان
کو عنایت کی اور اردلی توپ خانے کی خدمت بھی بحال رہی۔ ذکی علی کو 'سیدی اور خانی' نے
کرشن کے کل عز خانوں کا دار و غفر مقرر کر دیا ہے
سر سید رناتھ سین اپنی انگریزی کتاب اٹھارہ سو ستاون میں واجد علی شاہ
کے بارے میں لکھتا ہے :

”اچھا ہوتا اگر وہ شاعروں اور ادیبوں کی صحبت پر قناعت کرتے،
مگر ان کے والد نے ان کو بد توئے گوئیوں کے ساتھ رہنے کی اجازت نہ
دی تھی اور وہ گوئیوں اور طوائفوں کو پڑھنے لکھنے والوں پر ترجیح دیتے تھے۔
یہ مصنف واجد علی شاہ سے بے حد مخالفت رکھتا ہے اور ان پر الزام لگانے کے لیے کسی
دلیل اور ثبوت کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ یہاں تو اس نے ان کے ساتھ ان کے حد درجہ محتاط

۱۷۵۔ ۱۷۶ مثنوی عشق نامہ، ص ۶۴۳-۶۴۵

اور پابند شریعت والد پر بھی ایک بے بنیاد الزام بے دھرمک لگا دیا ہے۔
بادشاہ کی مذہبیت

واجب علی شاہ بڑے مذہبی آدمی تھے۔ نماز روزہ اور تمام احکام شرعی کی سختی سے پابندی کرتے تھے۔ وہ خود کو خطاب کر کے کہتے ہیں:

اختر اس طرح نمازوں میں بہ دل پیوستہ
جس طرح سامنے حاکم کے گنہگار آئے

پھر فرماتے ہیں:

ہم نمازوں میں جو بے آس کھڑے رہتے ہیں

سامنے چشم کے دوسو اس کھڑے رہتے ہیں

ان کی مذہبیت ادیبے تعصبی کے بارے میں چند معتبر واقفانِ حال کے بیانات پیش کیے جاتے ہیں۔ مرزا محمد تقی کا یہ بیان اور اچھا ہے:

”اگرچہ میں شباب میں سلطنت ملی، مگر خیال سے نوشی بلکہ بظلمت

وغیرہ امور منہیہ شرعیہ کا پیرامون خاطر عاطف نہ ہوا، پابندی صوم و صلوٰۃ میں کبھی فرق نہ آیا۔“

عظمت علی ناچی کا کوردی کا بیان:

”واللہ کہ حضرت کو صوم و صلوٰۃ کی سر دست پابندی اس قدر کہ اللہ کریم

رات کو پہر بھر سیکھ کہتے اس پر بھی نور کے ترک کے بلاناغہ نماز پڑھنے کو اٹھتے

نہیں تو جبیر اٹھائے جاتے۔ ماہ رمضان میں ہم روزہ عبادت اور خیر کا

شغل رہتا۔ شام کو روزہ کھولتے اور کھولتے، غرض تیس دن صوم غالی

نہ جاتے۔“

صفیر بلگرامی کا بیان

”ہمارا بادشاہ گیتی پناہ... مقید صوم و صلوة، دہندہ بخش و کواۃ،
اس دولت اس ثروت پر خدا کی یاد ہر وقت یاد، خدام کو ہر دم یہ ارشاد کہ
جب وقت نماز آئے جو کوئی موجود ہو بے خوف و خطر جگائے، تا طاعت خدا
میں خلل نہ پڑے، کہیں مہر منیر خلوت کدہ مشرق سے نکل نہ پڑے بنا ہی سے
شب دروز مسکرات سے بمرتبہ نفور ہے

مرزا حب علی بیگ سردار کا بیان :

”تقیٰ ذات اقدس سے تقویت رکھتا ہے۔ زہد و ورع کو بصد نیاز
ناز ہے۔ عین شباب میں سلطان عالم مقید روزہ و نماز ہے۔
مولوی عبدالحکیم شرر کا بیان

(۱)

”موسیقی کے سوا اور تمام حیثیتوں سے بادشاہ بڑے متقی و پرہیزگار
اور پابند شرع تھے۔ نماز کبھی قضا نہ ہوتی تھی۔ تیسوں روزے رکھتے تھے۔
انیسوں، شراب، فلک سیر یا کسی اور قسم کے نشے سے زندگی بھر احتراز رہا۔
حرم کی عزاداری نہایت خلوص عقیدت سے بجا لاتے تھے۔

(۲)

”عہد شاہی کے واحب علی شاہ کو میں نہیں جانتا۔ شیا برج کے
واحب علی شاہ جن کو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا وہ تو اتقاد پرہیز گاری،
خدا ترسی اور خدا پرستی کی محکم تصویر تھے... کوئی غیر منکوحہ اور غیر محتومہ ہوت
خدمت گزاری اور ذلیل خانگی کاموں کے لیے بھی حضوری تک نہ پہنچ سکتی تھی۔

۱۔ صبح خندان پردہ اول پرستان خیال ترجمہ بوستان خیال ۲۔ سرور سلطانی (دیباچہ)

۳۔ گزشتہ لکھاؤ ص ۶۵ ۴۔ حزن اختر مقدمہ ص ۱۱

واجہ علی شاہ شریعت اسلام کی پابندی میں نا محرم عورتوں کو دیکھنا بھی جائز
 نہیں سمجھتے تھے۔ بادشاہ کی خواص محل کی ایک خادمہ انجو بیگم سے بادشاہ کو بڑی محبت
 تھی۔ لیکن نکاح کرنے کے بعد جب وہ بادشاہ کے پاس آئی تو انھوں نے اس کے چہرے
 پر نظر نہیں کی۔ خود فرماتے ہیں :

مرے پاس آئی وہ ہو کر سوار گلستاں میں جس طرح آئے ہزار
 مگر ہے خدائے دوعالم گواہ نہ کی اس کے چہرے پہ ہرگز نگاہ
 تشق میں خوف الہی رہا سحاط رسالت پہنا ہی رہا
 معتبر شاہدوں کے بیان سے معلوم ہو چکا ہے کہ بادشاہ نے کبھی شراب کو ہاتھ
 نہیں لگایا مگر ایک چیز اس معاملے میں غلطی پیدا کر سکتی ہے۔ فارسی مثنوی گوہر کی تقلید
 میں بادشاہ نے اپنی مثنویوں میں کوئی نئی داستان شروع کرتے وقت ساقی سے شراب
 مانگی ہے۔ لیکن انھوں نے کبھی جگہ یہ بتا دیا ہے کہ شراب اور ساقی سے ان کی کیا مراد ہے۔
 چند مقام مثلاً پیش کیے جاتے ہیں :-

پلا ساقیائے دوبارہ مجھے کہ آتا ہے پھر استخارہ مجھے
 وہ ہے جس کو کہتے ہیں حب رسولؐ وہ ہے جس کو کہتے ہیں مہر بتولؑ ۶۶۲

مراد ہو کیونکہ نہ شاق ہے نہیں اس سے بہتر زمانے میں شے
 میں جس کا ہوں طالبِ عشق ہے کہ مہر سے دل دے پہ عشق ہے ۶۶۳

وہ ہے بھیجام میں مثلِ جم دوعالم فراموش ہوں یکدم
 بحرِ عشق ہرگز ہے کچھ نہ یاد کہ سستی سے اپنی ہی ہے مراد ۶۶۴

ختم و شیشے میں سے ہے باقی بہت طلب ہو جوئے کی توساقتی بہت
 دل اپنا جو معنی پر آمادہ ہے طبیعت ہے ساقی سخن بادہ ہے ص ۶۷۵
 جلوس کے دو سیر سال ۶۴۲ ہجری کے اواخر میں بادشاہ سخت بیمار ہو گئے۔ اور
 بیماری نے بہت طول کھینچا۔ اس حالت میں مذہبی واجبات قضا ہوتے رہے۔ اس کا ذکر
 اپنی مثنوی اہیبت حیدر علی میں یوں کیا ہے :

علامت سے ہوں آشنا روز و شب ہرارت میں ہوں مبتلا روز و شب
 تجھے علم ہے اے سمیع و بصیر تری ذات تو ہے علیم و خیر
 ہوئے مجھ سے کب ترک صوم و صلوٰۃ میں ہر سال دیتا ہوں خمس و زکوٰۃ
 تو ہے عالم غیب اے کبریا نہیں مجھ پہ ہرگز نمازیں قضا
 مگر کیا کروں سخت ناچار ہوں کہ زنجیر غم میں گرفتار ہوں
 کبھی صبح کی اور کبھی شام کی نمازیں قضا ہیں ان ایام کی
 خطا بخش دے میری اے میرے رب جو طاق ملے گی ادا ہوں گی سب
 غم جرم دل کس کا سہتا نہیں مرض میں تو کچھ ہوش رہتا نہیں

برآرندہ جملہ حاجات ہے
 شفا بخش عالم تری ذات ہے

بادشاہ کا یہ قول ابھی آپ سن چکے ہیں :

ہوئے مجھ سے کب ترک صوم و صلوٰۃ میں ہر سال دیتا ہوں خمس و زکوٰۃ
 رزٹینٹ سلیمین زکوٰۃ دینے پر اعتراض کرتا ہے :
 ”افراد کی طرح ریاست پر کبھی زکوٰۃ اسی وقت واجب بنتی ہے جب

۱۔ مثنوی عشقہ کا مہ ص ۶۷۵ ۲۔ مثنوی جو ۱۲۶۵ء میں نظم کی گئی فارسی کی مشہور رزمی مثنوی
 حاتم حیدری کا لخص ترجمہ ہے ۳۔ حوزۃ اختصار مقدمہ ص ۱۲۰

ہر طرح کے قرضوں سے پاک ہو۔ موجودہ بادشاہ کے والد قرض سے محفوظ تھے۔ ملازموں کی تنخواہیں ہمیشہ وقت پر دے دی جاتی تھیں اور وہ ہمیشہ پابندی وقت کے ساتھ زکوٰۃ دیا کرتے تھے۔ موجودہ بادشاہ پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے، لیکن مجتہد وزیر اور درباری مصاحبین کا اس کی ادائیگی میں اتنا فائدہ ہے کہ وہ اس کو بند نہیں ہونے دیتے۔

داجد علی شاہ نے اپنی مثنویوں میں جو حمد، نعت، منقبت وغیرہ لکھی ہیں اس میں ان کی مذہبیت کا عکس صاف نظر آتا ہے۔ ان کی مثنوی بحر الفتح سے ایک طولانی مناجات کے چند شعر پیش کیے جاتے ہیں۔ یہ گمان نہ ہو کہ یہ مناجات تخت و تاج سے محرومی کے بعد کہی گئی ہوگی۔ یہ اس زمانے کی تصنیف ہے جب بقول بادشاہ اودھ کا ملک زیر نگین تھا، ایک لاکھ پیادے اور سوار، سترہ سو اہل قلم، پانچ سو طبیب، پندرہ سو چوب دار تابع فرمان تھے اور رعایا باریا کا شمار نہ تھا۔

اے غفور اے سحابِ لطیف سخا	اے خطا پوش اے محیطِ عطا
جرمِ بچہ سے شرمار ہوں میں	روسہ ہوں گناہ گار ہوں میں
عفو کرنا شعرا ہے تیرا	نامِ آمرزگار ہے تیرا
میں گدا ہوں گدا نواز ہے تو	میں ہوں بیچارہ چارہ ساز ہے تو

۱۔ سلیم کا سفر نامہ ۱۷۷۷ء ۲۱۱۔ یہ تعداد بادشاہ نے مثنوی حزنِ اختر میں لکھی ہے۔ دیکھیے مثنوی ص ۱۷۷ اس کے علاوہ اودھ کے سرکاری ملازمین کی تعداد کا ذکر دو جگہ اور ملتا ہے۔ ہمارا جاجے گوپال ثاقب کا بیان ہے کہ ۱۷۶۲ء فصلی کی برآورد کے مطابق عہدِ داجد میں خزانہ اودھ سے پچھتر ہزار سات سو تیس آدمیوں کو سات لاکھ بائیس ہزار دو سو پچھاسی روپے تیرہ آنے تین پائی ماہوار تنخواہ ملتی تھی (نہبذۃ الکواکب ص ۱۱۱ الف) سجا بھین ریکاتی کا قول ہے کہ سات ہی ہزار آدمی سب مجموعہ ملازم ہر فرقہ و پیشہ سپاہ کے تھے (سوانح شاہ اودھ ص ۳)

تو ہی مضمت ذرا ہو بار اللہ
 تیری رحمت بڑی کہ میرے گناہ
 جب سے لائق نظر وانی ہے نوید
 ہے ترے فضل سے بڑی امید
 گو سرا پا گناہ گار ہوں میں
 پر یہ تجھ سے امید دار ہوں میں
 جب تلک قطع ہو نہ تارِ نفس
 تاکہ باقی رہے شمارِ نفس
 تیری الفت کا دل میں رُخ ہے
 روشن اس گھر میں یہ چراغ ہے
 خلوت دل میں یادِ غیر نہ ہو
 بے ترے کچھ مرادِ غیر نہ ہو
 دل کو لبریز معرفت کر دے
 نورِ عرفاں سے جسمِ جہاں بھر دے
 روحِ قالب سے جب دواں ہوئے
 نام تیرا مری زباں ہوئے

داحد علی شاہ کا سرا پا بند شریعتِ آدمی فطری طور پر علمائے دین کا بہت احترام کرتا ہے۔ علامہ مفتی میر محمد عباس شوشتری داحد علی شاہ کے انتقال کے ذکر میں فرماتے ہیں۔

» دُعظیم و توقیر فقیر، هیچ دقیقہ فرو نگذاشته۔ روزے چتر را برداشته مثل خادمان پشت سر من از نشیمن تا مسجد کہ خیلے راہ بود پیادہ رفتہ ترجمہ: مجھ فقیر کی تعظیم و توقیر میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہ کرتے تھے۔ ایک دن میرے سر پر چتر لگا کر خادموں کی طرح نشیمن سے مسجد تک میرے پیچھے اتنی دور پیدل گئے۔

معلوم ہوتا ہے کہ داحد علی شاہ صرف حقیقی علما کی قدر کرتے تھے۔ ان مذہبِ پیشہ ریاکار لوگوں سے متفرق تھے جو علما کا روپ بھر کر سادہ لوح عوام کو دھوکا دیا کرتے ہیں۔ داندے شاہی مشاعرے میں ایک غزل پڑھی تھی جس کے چند شعر کسی دوسری جگہ درج کیے گئے ہیں۔ اسی غزل میں تین شعر کا یہ قطعہ بھی ہے

علمائے باز جو یہ کنٹھے گھٹے والے ہیں : جہاں میں جیسے مہینے اعتبار دیکھ چکے

اٹھائی گیسے میں سب جل ساڑھیں غند
کچھ ایک دو نہیں ہم تو ہزار دیکھ چکے
جنید سچے سے بہتر نہ ان کے نہ ہر سے کفر
یہ لوگ جیسے ہیں ایمان دار دیکھ چکے
اگر یہ اشعار بادشاہ کے خلاف مزاج ہوتے تو زندان کو شاہی مشاعرے میں
پڑھنے کی کبھی جرأت نہ کرتے۔

واجب علی شاہ پابندی سے روزے رکھتے تھے اور ماہ مبارک رمضان میں زیادہ
وقت عبادت اور تلاوت کلام پاک میں صرف کرتے تھے۔ ماہ رمضان ۱۲۸۶ھ میں
ایک دن قرآن مجید کی تلاوت کے دوران میں بادشاہ کے دل میں آیا کہ اس طرح کی
آیتیں تلاش کی جائیں جن میں خدا کو لفظ رب سے خطاب کیا گیا ہے۔ اس خواہش کی بنا
پر ایسی پچھتر آیتیں نکال کر ان کو حروف تہجی کی ترتیب سے مع ان کے محل وقوع، مطالب
اور فوائد کے لکھ کر ایک کتاب میں درج کیا اور صحیفہ سلطانیہ اس کا نام رکھا۔ تین
برس کے بعد یہ کتاب ۱۲۸۹ھ میں مطبع سلطانی، کلکتہ میں چھپی۔

واجب علی شاہ امام حسین سے بڑی عقیدت رکھتے تھے۔ مولوی شمس رکھنوی کا چشم دید
بیان ہے کہ بادشاہ محرم کی عزاداری نہایت ہی خلوص عقیدت سے بجالاتے تھے۔
انہوں نے بادشاہ ہوتے ہی اپنے والد واجب علی شاہ کی قبر پر ایک عظیم الشان امام باڑہ
سبطین آباد کے نام سے دس لاکھ روپے کے صرف میں تیار کیا۔ قصر باغ میں ایک بہت
وسیع شان دار بارہ دری پتھر کی بنوا کر ”قصر العرا“ اس کا نام رکھا۔ یہ بھی حقیقت میں امام باڑہ
تھی جس کو بادشاہ کی جدت پسند طبیعت نے امام باڑوں کے روایتی طرز تعمیر سے بالکل
مختلف صورت دی۔ مقبول الدولہ ہمدی علی خاں قبوکی کے ایک قطعہ تاریخ کے چند
شرح عنوان درج کیے جاتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس بارہ دری میں عزاداری
۱۲۷۰ ہجری میں شروع کی گئی تھی۔

تایخ بنکاء تعزیه اری دیکارہ درسی سنگین المسمی بہ قصہ العزلی:

بقصر باغ در قصر العزا از نیت خالص شروع اسال کرده شاہ بہت رخاں عزادار
نیا مد نظر مانند این سنگین عزراخان ندیدہ میچ کس با شتم خود زین سال عزادار
دعا یہ قبول این مصرع تایخ ہا تلف گفت گزتا یک صد و سی سال این سلطان عزادار

امیرالدولہ بیک لائبریری میں ایک انگریزی کتاب میں کس بارہ درسی کی تصویر ہے جس میں تعزیے اور علم رکھے ہوئے ہیں اور ذکر صاحب منبر پر بیٹھے ہوئے ہیں۔

سید ہمدی حسن با شندہ لکھنؤ میں برس سے کربلا کے معنی میں مجاور تھے وہ پنجشنبہ ۲۶ شعبان ۱۲۷۰ ہجری (مئی ۱۸۵۴ عیسوی) کو خاک پاک کی ایک ضریح لے کر آئے اور دیانت الدولہ کی کربلا میں اترے۔ بادشاہ کو خبر کی گئی تو حکم دیا کہ سب ارکان سیاہ پوش ہو کر ضریح کے استقبال کو جائیں۔ بحسب حکم شاہ زادے، امرا اور ولی عہد روضہ کاظمین میں جمع ہوئے۔ ۹ بجے رات کو ضریح ایک صندوق میں مقفل زیر شاہانہ روانہ ہو کر ادھی رات کو در دولت پہنچی۔ بادشاہ نے دروازے تک استقبال کیا اور ضریح کو قصر باغ کی سنگی بارہ درسی میں رکھوا دیا اور ضریح لانے والے سید صاحب کو خلعت اور زر نقد عطا کیا۔

روضہ امام حسین کے ایک خاتم سید صالح کربلا سے بادشاہ کے لیے ایک عبالے کر آئے۔ مالک الدولہ صولت نے تاریخ تہی۔ ماتے کا مصرع یہ ہے پاک محلہ نے اختیار کیا۔ سید صاحب نے عرض کیا کہ امام حسین نے مجھے حکم دیا کہ عبالے کو دراج علی شاہ کو ہمدی طرف سے دو۔ بادشاہ نے وہ عبا سر پر رکھی اور سید صاحب کو بہت کچھ اس کا صلہ دیا۔ واپسی کے وقت انھوں نے کہا کہ ناصر الدین شاہ ایران کی طرف سے ایک بھانڈا کربلا میں

۱۰ دیوان قبول ص ۵۲ ۲۰ قیصلہ التاریخ جلد دوم ص ۱۰۰ - ۱۰۱

روشن کیا جاتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ حضرت کی طرف سے بھی جھاڑ روشن ہو کرے۔ یہ استدعا قبول ہو گئی اور جھاڑ کی قیمت اور بتیوں کے ماہانہ مخارج کے لیے حکم ہو گیا۔ رقم الحزق ۱۹۳۳ء میں کربلا کی زیارت سے مشرف ہوا تو بادشاہ کا نذر کیا ہوا جھاڑ روضہ امام حسین میں آدیزاں تھا اور بادشاہ کا بتوایا ہوا ایک چاندی کا دروازہ بھی موجود تھا۔

مٹیا برج کے زمانہ قیام میں بادشاہ نے ایک امام باڑہ بتوایا جو ابھی تک برقرار ہے۔ نام تو اس کا بھی سبطین آباد ہے، لیکن لکھنؤ کے سبطین آباد سے اس کو کچھ نسبت نہیں۔ مٹیا برج میں شاہی محلات کے امام باڑے بھی تھے۔ مدرسہ قیصریہ کے قیام کے موقع پر منصرم الدولہ نے اپنی تقریر میں کہا:

”اس چھوٹے سے مقام میں ہرسال عزاداری محرم الحرام میں کوئی سو لاکھ روپیہ صرف ہوتا ہے۔ علیٰ ہذا القیاس محافل میلاد شریف اور دیگر خیرات و مہجرات میں ہزاروں روپے صرف ہوتے ہیں۔ ہمارے آقا اور بادشاہ کی فیاضی کیا کم ہے کہ کربلائے معلیٰ میں ایک شفا خانہ مختصر سا بہ تقریر تنخواہ طبیب اور مصارف علاج قائم فرما دیا ہے، جس کی نظیر اس وقت تک نہیں دیکھی گئی۔ اور مدینہ منورہ میں سو روپے ماہوار ایک مدنی کو سبیل کا خرچ دیا جاتا ہے پچھلے

واجب علی شاہ اور موسیقی کا شوق

فنون لطیفہ، موسیقی، رقص، اداکاری وغیرہ کی سرپرستی ہندستان کے لاجپاؤں اور بادشاہوں کا معمول تھا۔ موجودہ جمہوری حکومت نے بھی موسیقی کے کالج، یونیورسٹی سنگیت ناٹک اکاڈمی، لالت کلا اکاڈمی وغیرہ قائم کر دی ہیں اور ہر فن کی ترقی اور اہل فن کی ہمت افزائی طرح طرح سے کرتی رہتی ہے۔ واجب علی شاہ کے والد شریاجاہ امجد علی شاہ

بڑے مذہبی آدمی تھے۔ ان کے عہد حکومت میں اکثر محکمے علماء مذہب کے ہاتھ میں تھے۔ مگر ارباب نشاط کا محکمہ ان کے عہد میں بھی قائم تھا۔ واجد علی شاہ کی طبیعت کو ان فنون سے گہری دل چسپی تھی۔ مگر یہ دل چسپی صرف حظ نفس کے لیے نہ تھی بلکہ ہندوستان کے ان قدیم فنون کی سرپرستی اور ان کو ترقی دینے کے لیے تھی۔ یہ میں اپنی کتاب لکھنؤ کا شاہی اسٹیج میں پوری تفصیل کے ساتھ بیان کر چکا ہوں۔ اس لیے یہاں اس موضوع سے بحث کرنا غیر ضروری ہے۔ بادشاہ کو موسیقی سے بے حد دل چسپی تھی لیکن اسلامی شرع کے احکام کے مطابق وہ گانے بجانے کو ناجائز سمجھتے تھے۔ جب کبھی بیاری کی شدت سے موت کا اندیشہ پیدا ہو جاتا تھا تو گانے بجانے سے توبہ کر لیتے تھے۔ مگر یہ توبہ زیادہ تک قائم نہ رہ سکتی تھی۔ مولوی شمس کھنوی بھی موسیقی کو ناجائز سمجھتے تھے۔ اسی بنا پر وہ کہتے ہیں :

”حضرت جان عالم کو اگر واقعی الزام دیا جاسکتا ہے تو موسیقی کا الزام ہے۔۔۔ اچھا گانا چاہے کیسے ہی اتنا دل پر ہیر گاری پر آمادہ ہوں توبہ تڑوا دیا کرتا ہے مگر اس میں بھی اس قدر احتیاط تھی کہ مسیحی علم میں قیام مکمل کے زمانے میں کبھی انھوں نے سوامر ڈھارویوں یا اپنی ممتوعہ گلانے والیوں کے کسی بازاری عورت کا گانا نہیں سنا۔ لہذا جب ہم بہت سے بزرگان دین کو صحبت رغنا کا لطف اٹھاتے دیکھتے اور عرض نہیں کرتے ہیں تو واجد علی شاہ مرحوم کے معاملے کو بھی خدا پر چھوڑ دینا چاہیے۔ خدا معاف کرنے والا ہے اور امید ہے کہ برگشتہ بخت تاجدار اودھ کے اس جرم کو ان کی اور نیکیوں کے صلے میں معاف کر دے گا۔“

بادشاہ کی بے تعصبی

واجد علی شاہ مذہبی احکام کے بہت پابند تھے۔ مگر مذہبی تعصب سے پاک تھے۔

اس معاملے میں ذاتی واقفیت رکھنے والے شاہدوں کے بیانات درج کیے جاتے ہیں :
مولانا شہر رکھنوی کا بیان :

”بادشاہ اگرچہ شیعہ تھے۔ مگر مزاج میں مطلق تعصب نہ تھا۔ ان کا پرانا

مقولہ تھا کہ میری دو آنکھوں میں سے ایک شیعہ ہے اور ایک سنی ہے۔

بے تعصبی کا اس سے زیادہ ثبوت اور کیا ہوگا کہ سارا انتظامی کاروبار سنیوں

ہی کے ہاتھ میں تھا۔ وزیر اعظم منصرم الدولہ بہادر سنی تھے۔ منشی السلطان

جو ایک زمانے میں سب سے زیادہ مقرب اور سارے جہانور خانے، کل اہل قلم

اور کئی اور محکموں کے افسر اعلیٰ تھے سنی تھے۔ بخشی امانت الدولہ جن کے ہاتھ

سے کل ملازمین حتیٰ کہ محلوں اور شاہزادوں تک کو تنخواہ ملتی تھی سنی تھے۔

عطار الدولہ اور دارودنہ معتبر علی خاں جو آخر میں سب سے بڑے عہدہ دار اور

کل کاروبار کے مالک تھے دونوں سنی تھے۔ اس سے بڑھ کے کیا ہوگا کہ

امام باڑہ بسطین آباد اور محل کے خاص امام باڑے بیت البکاء کا انتظام

اور مجلسوں اور مذہبی تقریبوں کا انصرام بھی سنیوں کے ہاتھ میں تھا۔

کبھی کسی نے اس کو محسوس ہی نہیں کیا کہ کون سنی ہے اور کون شیعہ ہے۔

شہر کا دوسرا بیان :

”بادشاہ نے جہانور خاں مرزا رمضان بیگ کے سپرد کیا جو لکھنؤ کے

ایک ہندو رئیس رائے دلا رام کے بیٹے تھے۔ رمضان بیگ کو منشی السلطان

بہادر کا خطاب تھا۔ تمام اہل قلم اور محرر چاہے کسی دفتر میں کام کرتے

ہوں انھیں کے ماتحت تھے اور ان کی برطرفی بحالی ان کے سپرد تھی۔ وہ

سنی المذہب بڑے دیں دار و مدزے نماز کے پابند اور بڑے لسان اور

بذہب سخن تھے۔ بادشاہ کو ان کی باتوں میں بڑا مزہ آتا۔ رات کو گاڑی پر سوار

لے گزشتہ لکھنؤ صفحہ ۷۵۔

ہو کر اپنی کوٹھیوں کے بانوں میں گشت لگاتے تو منشی السلطان کو خواصی میں
بٹھالیتے ۱۱

مولوی عبدالرزاق مصنف البوامکہ مٹیا بروج کے چشم دید حالات کے بیان میں
لکھتے ہیں :

”اعلیٰ عہدہ دار اکثر سستی تھے اور یہ بادشاہ کی بے تعصبی کی دلیل تھی ۱۲

مولانا شہر کے مندرجہ بالا دونوں بیانون میں شاہی جانور خانے کا ذکر آیا ہے۔
اس کی حیثیت کیا تھی ؟ خواجہ زین العابدین کا چشم دید بیان ہے کہ بادشاہ کے جانور خانے
میں ہزار ہا پرند و پرند تھے، جن کے دانے چارے کا خرچ دس ہزار روپے سالانہ تھا۔
بھیکن خاں مخاطب یہ معتبر علی خاں دانہ خوری کے ہتم تھے۔

عہدہ واجدی کے ہندو منصب دار

یہی بے تعصبی کا برتاؤ دوسرے برادران وطن صاحبان ہندو کے ساتھ بھی تھا۔
وہ بڑے ذمہ دار اور بڑی بڑی تنخواہوں والے منصبوں پر فائز تھے۔ چند ہندو منصب داروں
کے نام ہمارا اہلجے گوپال ثاقب کی تاریخ اودھ، زمبدۃ الکھائف سے یہاں درج کیے
جاتے ہیں :

”مشیر الدولہ مؤید الملک ہماراج الدھراج بال کرشن بہادر جتا جنگ

ابن راجا دیا کرشن، غازی الدین حیدر کے عہد سے واجد علی شاہ کے
عہد تک دیوانی کے منصب اعلیٰ پر ممتاز رہے۔

ہمارا جہ بہاری لال بہادر ابن افتخار الدولہ ہمارا جہ بیوہ رام بہادر

برادر زادہ مشیر الدولہ بہادر مذکور الحد دراصل باقی نویس ملک محمد وسہ۔

راجا کنن لال بہادر محمد علی شاہ سے واجد علی شاہ کے عہد

تک امیر بیت الانشا یعنی میر منشی رہے۔

بعد وفات راجا کنرن لال بہادر بابو پورن چند کار پر داند سرشتہ
دستخط عرض و پرچہ اخبار مقرر ہوئے۔

مدبر الدولہ منشی الملک راجہ جوالا پیر شاد بہادر محکم جنگ سر دفتر
دفتر خاص۔

کنور راج بہادر پسر رائے دولت رائے ہتھم بیت الاجرا۔

سر دیال برادر بہادر سنگھ ہتھم بیت التعلیل عرف دفتر بنارس۔

بخشی الملک راجا لال جی بہادر ہتھم کچہری بخشی گوی

بخشی الملک راجا الفت رائے پسر راجا لال جی بہادر

بخشی الملک کنور دھنپت رائے پسر راجا الفت رائے

رائے منشی دھر سوری نواسہ راجا لال جی بہادر۔ کنور دھنپت رائے
کی بخشی گوی کے زمانے میں نائب بخشی تھے۔

پینڈت نشن نرائن ہتھم سرشتہ نظارت یعنی تقسیم تنخواہ محلات و
شاہزادگان داعزہ واقربائے شاہی۔

راج راج راج الدھراج، پیشوا پردھان راجا راڈ امراد سنگھ
ہتھم بیت الضرب سلطانی۔

راجا بہادر سنگھ ابن رائے صاحب رام منصرم الملک سلطانی
واقع دہلی یعنی ریاست قدیم برہان الملک۔

میں نے ۱۹۲۲ء میں اپنے مقالے راجا کنرن لال اشکی کی تہذیب میں لکھا تھا۔

”کچھ بہت دن نہیں ہوئے کہ ہندوستان میں ہندو مسلمان شیر و شکر

ہو رہے تھے۔ مذہب باہمی عداوت و نفرت تھی مذہب تلخی و بے اعتباری ابھی

کل تک مسلمان اپنے ہندو ہم سالیوں کو اور ہندو اپنے مسلمان پڑوسیوں کو

ان کے سین اور خاندانوں پر تلواروں کے لحاظ سے بھائی، چچا، دادا،

ماسوں، پچھٹھا وغیرہ کہہ کر پکارتے تھے۔ یہ رشتے صرف زبانی نہ ہوتے تھے، ہماری سوسائٹی نے جو حقوق اور فرائض ان رشتوں سے وابستہ کر دیے ہیں وہ سب ادا کیے جاتے تھے۔ خوشی اور غم، تقریبوں اور تہواروں میں ایک دوسرے کے شریک رہتے تھے۔ یہ رشتے عارضی بھی نہ ہوتے تھے بلکہ اکثر کئی کئی پشتوں سے چلتے آتے تھے اور کئی کئی پشتوں تک چلتے تھے۔ باہمی اتحاد نے یہاں تک ترقی کی تھی کہ کسی مذہب کی حدیں جگہ جگہ سے ٹوٹ چلی تھیں۔ ہندوؤں میں مسلمانی رسمیں اور مسلمانوں میں ہندو داغے ہوا سناٹے جانے لگے تھے۔ جن ہندوؤں اور مسلمان گھرانوں کو پاس پاس رہتے ہوئے دو تین پشتیں گزر گئی تھیں ان میں یہ پتا بھی مشکل سے چل سکتا تھا کہ وہ ایک دادا کی اولاد اور ایک خاندان کے رکن نہیں ہیں۔ دونوں اپنے اپنے مذہب میں پکے تھے۔ مگر اختلاف مذہب سے ان کے باہمی تعلقات میں فرق نہ پڑتا تھا۔ آج اس میل ملاپ، اس اتحاد کے لیے ہماری نگاہیں ترستی ہیں اور اس رواداری اور بے تعصبی کے لیے ہمارے دل ٹپتے ہیں۔

یہ بیان شاہانِ اودھ کے زمانے پر بالعموم اور واجد علی شاہ کے عہد پر بالخصوص صادق آتا ہے۔

بادشاہ کی علمی استعداد

واجد علی شاہ کی ابتدائی تعلیم و تربیت کا تفصیلی بیان نہیں ملتا۔ وزیر السلطنت نواب سید محمد امیر علی خاں امیر لکھتے ہیں کہ وہ کچھ دن درسی کتابیں پڑھنے میں مصروف رہے، کامل اتالیقوں اور فاضل استادوں کی صحبت میں اپنی فطری ذہانت و ذکاوت سے بہت کچھ سیکھ لیا۔ بعض دوسرے کمالات جن کی تعلیم اور بابِ سلطنت اور اصحابِ معدلت کے لیے

واجب و لازم ہے، بڑی تن دہی کے ساتھ آسانی سے حاصل کر لیے یہ خود واجد علی شاہ کا بیان ہے کہ جب عمر کے پانچ برس گزرے تو باپ نے مکتب کے حوالے کر دیا۔ نواب امین الدولہ اندر حسین خاں ان کے خاص اتالیق تھے۔ علم طب کی دو کتابیں میوان^۱ اور شرح اسباب ان سے بھی پڑھیں تھے۔
مولانا شمس الرحمنوی لکھتے ہیں :

”میرا بچپن اور نیرشباب کا ابتدائی زمانہ مٹیا بروج میں اور خاص بادشاہ جہاں پناہ کے سایہ عاطفت میں بسر ہوا ہے۔۔۔۔ میں نے بادشاہ جم جاہ کو، ان کے دربار کو، محلات عالیات کے رہنے کی شان کو، شاہ زادگان والاتباری کی دل چسپ صحبتوں کو اور سوادہ بنگالہ میں لکھنؤ کے اچڑے ہوئے کروفر کو اپنی آنکھ سے دیکھا ہے۔
اس کے بعد ذاتی واقفیت کی بنا پر لکھتے ہیں :

”واجد علی شاہ کا علمی مذاق نہایت ہی پاکیزہ اور اعلیٰ درجے کا تھا۔ ان کی علمی استعداد بہت بڑھی ہوئی تھی۔ عربی کے قواعد نہ تھے، مگر فارسی میں۔۔۔۔ دم بھر میں دو دو چار چار بند کی نثریں لکھ ڈالتے جو مشہور و نامور شاعران فارسی کے کمال کو یاد دلادیتیں۔ رفعت الدولہ اور اور لائق الدولہ کے ایسے صاحب کمال نثر نگار وابستہ داماں دولت تھے۔ ممکن تھا کہ وہ لوگ جہد و جہد از تکلف کے بعد ان سے اچھی طرح لکھ لیں، مگر جس خوبی کے ساتھ قلم برداشتہ واجد علی شاہ لکھ دیتے، میرے خیال میں کسی سے ممکن نہ تھا۔ یہی حالت نظم کی تھی۔“

۱۔ وزیرقامہ ص ۹۷ صوت المبارک ص ۳۳ عشق نامہ فارسی ص ۲۵۴
حزق اختصر مقدمہ ص ۹۷ رفعت الدولہ رفیع الملک کاتب الملک کنشید محمد رفیع ضوی ص ۷
لائق الدولہ محمد جان علی خاں بہاؤ الملک شہنشاہ غازی خان اختصر مقدمہ ص ۱۲

راجا درگا پرشا دست ملیوی کا بیان :

”مثل اوبادشا ہے بایں جمیعت علوم و فنون بر سر زمین ہند
برخاستہ چنین فرماں رواے باچندیں فضل و کمال در فضا کے ملک ہندوستان
علم بادشاہی نہ فرارشتہ۔ بیش تراوقات شریف بہ تذکرہ علمی می گزراستند :
اگر بخت گل گشت حدائق و قفرج باغات سواری می فرمایند خدام صندوق
ہائے تصنیفات و کتب ہائے اساتذہ ہمراہ می دارند۔ چرا کہ اکثر اوقات
دریں حالت قفرج با خدام و مقربان خدمت اکثر تذکرہ سخن می شود و اتفاق
ملاحظہ تصنیفات اساتذہ می شود۔“

ترجمہ : ان کا سا کوئی بادشاہ علوم و فنون کی اس جامعیت کے ساتھ ہند کی زمین
سے نہیں اٹھا۔ ایسے کسی فرماں روا نے اتنے فضل و کمال کے ساتھ مملکت
ہندوستان کی فضا میں بادشاہی کا علم بلند نہیں کیا۔ بیش تراوقات شریف علمی
تذکرے میں گزرتے ہیں۔۔۔ اگر باغوں کی سیر و قفرج کے لیے سوار ہوتے ہیں خدام
استادوں کی تصنیفوں اور کتابوں کے صندوق ساتھ رکھتے ہیں۔ کیوں کہ اکثر اوقات
سیر کی حالت میں خدام اور مقربان خدمت سے تذکرہ سخن ہوتا ہے اور اساتذہ کی تصنیفات
ملاحظہ کرنے کا اتفاق ہوتا ہے۔

حکیم محمد کاظم سواج عمری میں لکھتے ہیں :

”درذکات طبع و ذہانت بے عدیل و در اکثر فنون مثل شاعری و تاریخ

دانی و موسیقی حدیم نظیر علی

ساج کلکتہ ہی کہتے ہیں :

”علامہ تحصیل کمال بہ انواع فنون فاضلہ شوقی مفرطاً بدرہ فن شعر و

سخن دارند

صغیر بلگرامی کا بیان ہے :

”ہر علم میں کامل بر قوت طبع دراکہ ہر فن میں حرفاً حرفاً گماں حاصل ہے
خواجہ بادشاہ صغیر لکھنوی لکھتے ہیں :

”فن جو عمدہ جہاں میں ہیں مشہور حد سے ان فنوں میں عبور
دیکھو انصاف کی نظر سے اگر مثل ان کا نہیں ہے کوئی بشر“

داعی علی شاہ کی علمی استعداد کے سب سے زیادہ معتبر شاہد تو ان کی تصنیف تالیف
کی بڑی کثیر تعداد کتابیں ہیں۔ بادشاہ کی خدمت میں جو عرض داشتیں پیش ہوتی تھیں
ان کی مدح میں جو قصیدے کہے جاتے تھے، ان کی کئی کتابوں کی جو شرحیں لکھی گئی تھیں
ان کی زبان اتنی عالمانہ ہے کہ معمولی استعداد والے ان کو سمجھ بھی نہیں سکتے۔ لیکن بادشاہ
ان پر مناسب احکام صادر کرتے، ان سے لطف اندوز ہوتے، ان کی داد دیتے اور صلہ و
انعام عطا فرماتے تھے۔ اس سے بھی ان کی علمی استعداد کا سراغ ملتا ہے۔

بادشاہ کی قلم برداشتہ فارسی تحریر کی مثال کے لیے ایک طو لانی تحریر کے چند کلمے
درج کیے جاتے ہیں۔ داعی علی عہد میں شاہی دارالانشاء کے میسرشی ظہیر الدین ظہیر بلگرامی
نے معزول بادشاہ کی خدمت میں ایک فارسی قطعہ اور ایک عرض داشت پیش فرمائی تھی
جس میں بادشاہ کی سوانح عمری لکھنے کے لیے ان کی تصنیفات اور روزنامہ ادبیہ و ادبیہ
مانگی۔ بادشاہ اس وقت فورٹ ولیم میں نظر بند اور جسمانی اور روحانی اذیت میں مبتلا تھے
انھوں نے معذرت کے ساتھ تقریباً تین ہزار روپے نقد عنایت فرمائے اور پچاس روپے
ماہوار تنخواہ مقرر کر دی اور عرض داشت کے جواب میں تحریر فرمایا :

”شعاع آفتاب کلامش چنان بر ذرہ دلم تابید کہ سر تنایا محو حیرت

گشتم... بصفائے بندش و حسن کلامش کہ دریا فتم بہر دو دست دل گزشتہ بدم
بخدا کہ ہرگز قابل دلائق چنین تحریر بنظیر نہ بودم۔ لطف و کیفیت جدائی
از لب نمی خیزد مگر انچہ ازل خیزد بدل ریزد... دہرا پچہ دہارہ رسائل تصنیف
تصنیف را فتم در شون جدا گانہ مع دیگر روز نامچہ و سوانح عمری عرض داشت
صورتش بر ایں گوید کہ تالیفات و تصنیفات عمدہ را ایل غارت باغیان
ہم چو خس و خاشاک در امواج تاراج چنان غرق ساختہ کہ اثر حرفے از ان
باقی نیست۔ در روز نامچہ و سوانح عمری جز آہ جگر و دود دل اختراش نام نہ ان
یا صبح غریباں... حالاً دگر حصیت علیہ

بادشاہ کی فارسی شکر کا ایک نمونہ اور پیش کیا جا تا ہے :

” در عالم یاس و قید و ہراس کہ از شومی بخت نارسیدہ بجائے سیاہی
آب دیدہ صرف نمودہ در فرط بے قراری و حالت آہ و زاری کہ نصیب دشمنان
با یعنی در زندان فرنگ تان کہ موسوم بہ قلعہ و لم فورڈ کلکے است ہر قدر تحفہ
کہ برائے بستیدیان نزد خود داشت بے تکلف از لوک خامہ ریختہ“

بقول شہر بادشاہ عربی کے عالم نہ تھے لیکن عربی سے نا بلکہ بھی نہ تھے۔ ان کی بعض
کتابیں ان کی عربی دانی کا ثبوت پیش کر رہی ہیں۔ ان کی دو مختصر عربی تحریریں ہدایت السلطان
ارشاد السلطان کے نام سے تھیں، جن کی نہایت مبسوط طبری عالمانہ اور فاضلانہ
تشریح منشی امیر احمد امیر مینائی نے دو کتابوں کی صورت میں لکھیں جو شاہی دربار میں
ان کی رسائی کا ذریعہ ہوئیں۔

بادشاہ نے فارسی اور اردو شاعری کا وسیع مطالعہ کیا تھا۔ اپنی ایک کتابیں

۱۔ ظہیر الانشا ص ۶۷۷ نصاب اختاری۔ دیا چہ سہ ان کتابوں کے بارے میں دیکھیے

میرا مضمون امیر مینائی کی دو کم یاب کتابیں، ہماری زبان، علی گڑھ، ۲۲ ستمبر ۱۹۶۶ء

بھانڈوں کے لیے جو نقلیں لکھی ہیں ان میں ایک نقل مشاعرے کی ہے، جس میں فارسی اور اردو کے پچیس پچیس شاعر آتے ہیں اور اپنا ایک ایک مطلع سناتے ہیں۔ ان کے لیے بادن غزلوں کے مطلع لکھ دیے ہیں۔ اپنا یہ مطلع لکھا ہے۔

ایک حسرت طور پر بھی بہر ہوئی رہ گئی ۔۔۔ ایسا کچھ دیکھا کہ آنکھوں کو متنازع گئی
بادشاہ کو اودھ کی دیہاتی بولیوں پر کافی عبور تھا۔ ان کے گیت زیادہ تر انھیں بولیوں میں ہیں۔ انھوں نے خیال راگنی بھٹیاری کی مثال میں اپنا یہ گیت پیش کیا ہے۔

آستانی۔ سچ مورے گھر کاج مندیلہ باجے مانی ری۔

انتر۔ گلیوں گلیوں ہن برستے دھلکتے ہنگارا اکھتر پیا ملک اودھ براجے
مانی ری یہ

ایک گیت کی آستانی ہے۔

اتنا جائے کہو ہماری اور سے ہر سوں کر جو رجو بیگ داس دیجیے برہن بیا کل پوت
سہو نہ جات بچھرن کو دکھ بھاری تھ
رام چیرا کھنیا سے پوچھتا ہے۔

راجن کے راج اودھ راج ہمارا ج شیو پر دھان چھترتی بتاؤ تو کیا ہوا
ذیل کا شعر ٹھیکہ دیہاتی زبان میں ہے۔

بلا یوں ن کامورے گھرنچ تو ہمے تھرے بگاڑ ہوئی

بسے نہ دیہوں تھار پڑوا جو مورستی اچھاڑ ہوئی

واجبد علی شاہ اور شاہی کتب خانہ

واجبد علی شاہ کافی علمی استعداد اور تصنیف و تالیف کا غیر معمولی ذوق رکھتے تھے۔ اچھی کتابوں کے قدردان تھے۔ ان کے عہد میں لکھنؤ کے شاہی کتب خانے میں دلاکھ

کتابیں موجود تھیں اور کتب خانے کا علم ہزاروں روپے تنخواہ پاتا تھا۔ لیکن بہت سی کتابوں کی جگہ خالی ہو گئی تھی۔ بادشاہ نے اس خلا کو پر کرنا شروع کر دیا۔ جلوس کے پہلے ہی سال حسب ذیل اشتہار شائع کیا:۔

”از کتب فہرست مفصلہ ذیل ہر نسخہ کہ لغایت بیت دہام اس ماہ (یعنی ذی قعدہ) روز پنجشنبہ ۱۲۶۳ھ نزد محمد حسین ہتھم مطبع سلطانی در تکیہ شاہ فصیح بر مکانش برسد ہماں وقت بشرط پند قیمتش خاطر خواہ بائع دادہ خواہد شد“

ترجمہ: کتابوں کی مفصلہ ذیل فہرست میں سے ہر نسخہ جو اس ہتھم (یعنی ذی قعدہ) کی پنجشنبہ تاریخ روز پنجشنبہ ۱۲۶۳ھ تک مطبع سلطانی کے ہتھم محمد حسین کے مکان پر تکیہ شاہ فصیح میں پہنچے گا اس کی قیمت بشرط پند پیچھے والے کی خاطر خواہ اسی وقت دے دی جائے گی۔

اس فہرست میں مختلف موضوعوں کی ڈھائی سو کتابوں کے نام ہیں جن میں اکثر نادر اور کم یاب ہیں۔ تاریخی کتابوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔ اس عہد کے نامی تاریخ گو کرامت علی اظہر نے اس اشتہار کی تاریخ بھی ۷

پیش ہر صاحب معالی شان
در سن عیسوی بخواب اظہر
سیر ہر نسخہ فرحت انگیز است
اشتہار کتب دلاویز است
یہ پوری فہرست میرے مضمون ”لکھنؤ کا شاہی کتب خانہ“ مطبوعہ ماہ نامہ نیاد و لکھنؤ
مورخہ اگست ۱۹۰۷ء میں شامل ہے۔

اودھ کا مقدمہ پارلی منٹ میں پیش کرنے کے لیے واجد علی شاہ کی والدہ بھائی اور ولی عہد لندن گئے تو سیرج الدین خاں کا گوری بادشاہ کے سفیر کی حیثیت سے ان کے ساتھ تھے۔ انھوں نے اودھ کی حکومت اور حکمرانوں کی حمایت میں ایک کتاب لندن میں شائع کی۔ اس میں شاہی کتب خانے کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ مختصر بیان

کیا جاتا ہے۔

کمپنی نے بادشاہ کے باغات، محلات، بھانور خانے، پوشاک خانے، بھوانیہرات، نوادر، عجائب خانے اور کتب خانے سب پر قبضہ کر کے ضبط کر لیا ہے۔ شاہی کتب خانہ دولاکھ نہایت بیش قیمت جلدوں پر مشتمل ہے یہ

حسام الدولہ نے ڈپٹی کمشنر کو اپنے خط مورخہ ۱۴ اگست ۱۸۵۶ء میں لکھا کہ صحت الدولہ بہادر نے آج مجھ کو اطلاع دی ہے کہ کپتان فلیچر (FLETCHER) (HAYES) آپ کے حکم کی تعمیل میں اعلیٰ حضرت بادشاہ کا کتب خانہ فرج بخش کوٹھی سے جنرل مارٹین کی کوٹھی میں فوراً لے جانا چاہتے ہیں۔ چونکہ یہ اشیاء اعلیٰ حضرت بادشاہ کی سرکاری ہیں، میں بغیر بادشاہ کی اجازت کے اس معاملے میں نہ ہاں کہہ سکتا ہوں نہ نہیں لیکن دونوں سرکاروں کی دوستی اور اتحاد کے لحاظ سے آپ کو ان کتابوں کے معائنے اور مطالعے سے منع نہیں کرتا ہوں۔ یہ تحریر ڈپٹی کمشنر کو بہت ناگوار ہوئی اور ۱۹ اگست کو حسام الدولہ کے نام چیف کمشنر کا خطاب نامہ آیا کہ شاہی کتب خانہ حوالے کرنے اور اس کو مارٹین کی کوٹھی میں منتقل کرنے کے بارے میں ڈپٹی کمشنر کے نام تمہارا پیغام بہت نامناسب زبان میں تھا۔ تم نے ان کے عہدہ جلیلہ کا لحاظ نہیں رکھا۔ وہ آئندہ تم کو ایسی معاملات میں گفتگو کرنے کی اجازت نہ دیں گے اور تم کو اعلیٰ حضرت بادشاہ اور دھوکا معتمد ایجنٹ سمجھیں گے۔ بادشاہ کے ذاتی محلوں کے اندر تم کو جو بھی اختیار ہو لیکن پبلک مفاد کے معاملات میں تم کو یہ حق نہیں ہے کہ اعلیٰ افسروں کے احکام کی تعمیل میں روز بروز تاخیر کرتے رہو۔ تم بھی عزت آئیٹ انڈیا کمپنی کے ادنیٰ ملازموں کی طرح ہو۔

اس خط میں یہ بھی لکھا کہ فارسی کتابیں جو کثیر سرمایے سے فراہم کی گئی ہوں گی ان کو دیکھ کر ڈپٹی کمشنر کو افسوس ہوا کہ وہ ایک بے مزت کمرے میں بھر دی گئی ہیں۔ سلیں ان کو خراب

کر رہی ہے اور کپڑے کھا رہے ہیں۔ وہ ان کو ایک بڑے وسیع کمرے میں رکھنا چاہتے ہیں تاکہ اعلیٰ حضرت بادشاہ کی املاک محفوظ رہے۔ تم کو سمجھ لینا چاہیے کہ ڈپٹی کمشنر سے کسی طرح کی بات چیت اور خط و کتابت نہ کریں گے۔
مختصر یہ کہ ملازمین شاہی نے کتب خانہ انگریزوں کے حوالے نہیں کیا۔ مگر تحفظ کے بہانے سے زبردستی ان کی تحویل سے لے لیا گیا۔ انگریزوں کے ہاتھوں کتابوں کا جو حشر ہوا وہ ذیل کے واقعہ سے ظاہر ہے۔

انتزاع سلطنت کے بعد ایک نیا چیف کمشنر لکھنؤ میں آیا۔ ایک دن اس نے شاہی کتب خانے کا معائنہ کیا اور کتابوں کی بے ترتیبی کو دیکھ کر بہت افسوس کیا اور اس کا سبب دریافت کیا۔ مفتاح الدولہ نے کہا کہ یہ بے ترتیبی میجر کارنگی کی بدولت ہوئی کہ ایک دن سارا کتب خانہ جو کوٹھی فرج بخش کی الماریوں میں با ترتیب تھا انکو اکرا باہر پھینکوا دیا۔ فرمایا اب تم انھیں ترتیب سے درست کر کے رکھو۔ عرض کیا کہ کتب خانے کا عملہ جو ہزار روپے تنخواہ پاتا تھا اب کہاں ہے۔ فرمایا کارنگی صاحب کو اس قدر زیادتی نہ کرنا چاہیے تھی۔
شاہی کتب خانہ ۱۵۵۷ء کے غدر کی لوٹ مار میں بھی تباہ ہوا ہوگا۔ منشی ظہیر الدین بلگرامی نے بادشاہ کی سوانح عمری لکھنے کے لیے ان کی کتابیں مانگی تو بادشاہ نے جواب میں لکھا۔
”تالیفات و تصنیفات عمدہ راسل غارت باغیاں ہم پوچھ خفاشاں
درامواج تاراج چناں غرق ساختہ کہ اثر حریف ازاں باقی نیست“

ترجمہ: عمدہ تالیفات و تصنیفات کو باغیوں کی لوٹ کے سیلاب نے خس و خاشاک کی طرح اس طرح ڈبو دیا کہ اب ان کے ایک حرف کا نشان بھی باقی نہیں ہے۔
ظاہر ہے کہ باغیوں کی لوٹ کا سیلاب بادشاہ کی تصنیفات و تالیفات کے ساتھ شاہی کتب خانے کی کتنی ہی کتابوں کو بہا لے گیا ہوگا۔

بادشاہ اودھ کے کتب خانوں میں عربی اور فارسی کتابوں کے وسیع ذخیرے کی فہرست بنانے کے لیے ڈاکٹر اشپیرنگر لکھنؤ کے ریڈیڈنٹ کا اسٹرا اسٹنٹ مقرر کیا گیا۔ وہ ۳ مارچ ۱۸۴۸ء سے یکم جنوری ۱۸۵۰ء تک لکھنؤ میں رہا۔ ایک ہیٹا اس کو دو کتب خانوں پر مشتمل دینا پڑے۔ اور کوئی تین ہیٹے ہیٹا رہا۔ صرف اٹھارہ ہیٹے کے قریب فہرست بنانے میں صرف کیے۔ اس مدت میں اس نے دس ہزار جلدوں کے قریب دیکھیں اور ان کی فہرست تیار کی۔ یہ فہرست چار جلدوں میں تھی، جن میں سے صرف ایک جلد شائع ہوئی۔ باقی تین جلدوں کا پتہ نہیں۔

ڈاکٹر اشپیرنگر شاہی کتب خانے کے داروغہاؤں کی غفلت اور بددیانتی کی مذمت کرتے کے بعد لکھتا ہے کہ اپنے اس بیان کے ساتھ میری گزارش ہے کہ موجودہ داروغہاؤں یا کتابداروں کو میں قابل تعریف اور نہایت ایمان دار سمجھتا ہوں۔ وہ بڑے ہنر مند لوگ ہیں، خاص کر توپ خانے کے داروغہاؤں میں سے ایک۔ یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ کتب خانہ ابتداء سے ایسے آدمیوں کے ہاتھ میں نہیں رہا۔ خواہرے کہ ہنر مند ایمان دار اور قابل تعریف داروغہاؤں کا انتخاب اور تقریر بادشاہ وقت واجد علی شاہ کی توجہ خاص کا نتیجہ تھا۔

واجد علی شاہ نے اپنی مٹیاء برج کی چھوٹی طوسی سلطنت میں ایک چھوٹا سا کتب خانہ بھی قائم کر لیا تھا۔ خواجہ زین العابدین، جن کا ذکر اوپر آچکا ہے اس کے داروغہ تھے۔ انھوں نے مجھ سے خود فرمایا کہ کتب خانہ بادشاہ کے خاص محل میں تھا جس کا نام سلطان خانہ تھا۔ بادشاہ زیادہ تر اسی محل میں رہتے تھے۔ شاہی کتب خانے میں پچیس تیس چوبی الماریاں کتابوں کی تھیں۔ میرے علاوہ کتب خانے کے تین داروغہ اور بھی تھے۔ بادشاہ کے انتقال کے بعد میرے سامنے ایک انگریز پور کتب خانہ کاڑیوں پر لہو ا کے لے گیا۔ معلوم نہیں کہ وہ کتابیں کیا ہوئیں۔

مٹیاء برج کے شاہی کتب خانے کے ایک داروغہ محمد علی حسن تھے۔ ان کا ایک قطعہ تاریخ بادشاہ کی لغت کی کتاب ملاذ الکلمات کے آخر میں موجود ہے۔ اس کا عنوان اور آخری شعر درج کیا جاتا ہے۔

”قطعہ تاریخ تالیف... از فکر شاعر شیوا بیان محمد علی داروغہ کتب خانہ شاہی“

از سرالہام محسن یافتہ سالش زغیب
مترن علم معانی معدن یک یک زبان
دوسرا مصرع مادہ تاریخ ہے جس کے عدد ۱۲۹۲ھ ہیں۔ اس میں سرالہام یعنی الف کے
ایک عدد کا تعمیم کرنے سے ۱۲۹۳ عدد نکلتے ہیں۔

بادشاہ کی اکثر مطبوعہ کتابوں پر کتب خانے کی ہر جگہ کر اکثر یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ یہ
کتابیں بادشاہ کے کتب خانے کی ہیں۔ اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لیے لکھا جاتا ہے کہ اوعد
کے ہر بادشاہ نے اپنے عہد میں کتب خانے کی ایک ہر بنیادی تھی جس پر بادشاہ کے نام کا ایک
شعر کندہ کیا جاتا تھا۔ آخری چار بادشاہوں کی ہرروں پر اشعار ذیل کندہ تھے۔
سلیمان جاہ نصیر الدین حیدر کی ہر

خوش بہت ہر کتب خانہ سلیمان جاہ : ہر کتاب مزین چون نقش بسم اللہ
محمد علی شاہ کی ہر

زبے ہر سلطان والا جناب : کہ زبیا بود برجین کتاب
احمد علی شاہ کی ہر

ناسخ ہر ہر شد چوں شد مزین بر کتاب : خاتم احمد علی شاہ زمین عالی جناب
د احمد علی شاہ کی ہر

خاتم د احمد علی سلطان عالم بر کتاب : ثابت و چر نو بادا نافرغ آفتاب
د احمد علی شاہ اپنی ہر کتاب چھپوا کر مفت تقسیم کر دیتے تھے۔ اس پر ان کے کتب خانے کی ہر
یہ بتاتی ہے کہ یہ مفت تقسیم کی ہوئی کتابوں میں سے ہے۔ اپنے ذاتی کتب خانے کے لیے
وہ نہایت خوش خط، مطلا، مذہب، منقش نسخے تیار کر داتے تھے۔ ایسے کئی نسخے میری نظر
سے گزر چکے ہیں۔ خاص خاص لوگوں کو بھی خوش خط قلمی نسخے عنایت کیے جاتے
تھے۔

بادشاہ کا تصنیف و تالیف میں انہماک

داجہ علی شاہ کو تصنیف و تالیف کا فطری شوق تھا۔ انہوں نے دزدیوان اور تین
مثنویاں اٹھارہ برس کے سن میں تصنیف کیں اور ساری عمر تصنیف و تالیف کا شغل جاری
رکھا، یہاں تک کہ اردو اور فارسی نظم و نثر میں ان کی کتابوں کی تعداد سو سے اوپر پہنچ گئی۔
لکھنؤ کے عالم شاعر سید علی کا تل معروف بہ مولوی علی میاں نے داجہ علی شاہ کی وفات پر
دس قطعات تاریخ کہہ کر *تِلْكَ عَشْرُوْةُ كَامِلَةٍ* کے نام سے شایع کیے۔ ایک قطعے میں
یہ شعر بھی ہے۔

بیش تر از صد مصحف در نظم و نثر بر کمال علم و عرفانش گواہ
داجہ علی شاہ اور ان کی حکومت کو بدنام کر کے اور دھڑے پر خا صبا نہ قبضہ کرنے کے ناپاک مقصد
سے انگریزوں اور ان کے ضمیر فروش ہندوستانی پٹھوں نے پروسیگنڈے کی وہ ہم چلائی کہ
داجہ علی شاہ کا نام عیش کوشی اور نفس پرستی کا مترادف بن گیا۔ کون تصور کر سکتا تھا کہ افس
بدنام بادشاہ کو اپنی ہوس ناکیوں اور عشق بازیوں سے کتابیں لکھنے کی فرصت ملی ہوگی۔ پھر
کتابیں بھی دوچار نہیں، دس بارہ نہیں، سو سے زیادہ! اگر حقیقت یہ ہے کہ کامل کے اس قول
میں کوئی مبالغہ نہیں ہے۔ صرف میری تنہا تلاش کے نتیجے میں داجہ علی شاہ کی ساٹھ سے اوپر
کتابیں بیش تر شاہی مطبع کی چھپی ہوئی دستیاب ہو گئیں جو میرے کتب خانے میں موجود ہیں۔
ان کے علاوہ کچھ اور کتابوں کا پتہ لگا اور کچھ کتابوں کے نام معلوم ہوئے۔ ان کتابوں کے بارے
میں ضروری تفصیلات آئندہ پیش کی جائیں گی۔

متعدد مصنفوں نے بادشاہ کی تصنیفی مصروفیت اور تصانیف کی کثرت کا ذکر کیا ہے۔
نثر لکھنوی بادشاہ کی قلم برداشتہ فارسی تحریروں اور فی البدیہہ نظموں کا ذکر کرنے کے بعد
لکھتے ہیں۔

”حضرت جان عالم نے سیکڑوں مرثیے اور سلام کہہ ڈالے اور اتنی کتابیں
نظم و نثر میں تصنیف کیں کہ ان کا شمار آج بھی کیا جا سکتا ہے۔“

سب کی تصنیف میں یہی شانِ جبرستگی اور قلم برداشتگی تھی ۱۲
راجا درگا پرشا دس دیو لکھتے ہیں :

”دریں روز ہا اگرچہ از انتزاع سلطنت و قلت مدخل و کثرت مخارج
خاطر مقدس با نواع افکار در ساختہ است اما از غایت شوق سخن بیش تراوفا
بہ تذکرہ علمی می گرداند و از تصنیفات تازہ بہ تازہ و تالیفات نو بہ نو فیوضات
بے پایاں بہ حاشیہ نشینان بباطیمت مناطی رسانند ۱۳

ترجمہ : ان دنوں اگرچہ سلطنت کے انتزاع، آمدنی کی قلت اور اخراجات کی کثرت سے
خاطر مقدس طرح طرح کی فکروں سے دوچار رہتی ہے، لیکن انتہائی شوق سخن
کی وجہ سے اپنا وقت عزیز بیش تر علمی تذکروں میں گزارتے ہیں اور اپنی تازہ بہ تازہ
تصنیفات اور نو بہ نو تالیفات سے اپنی بباط مبارک کے حاشیہ نشینوں کو بے انتہا
فیوض پہنچاتے ہیں۔ ایک نامعلوم الاسلم مصنف جو بادشاہ سے ذاتی واقفیت رکھتا
ہے اس کا بیان ہے۔

”شوق علم و ہنر کتابت و سخن درمی رابآن مدارج دارند کہ خود صاحب
تصانیف در علوم مختلفہ و صاحبان دیوان اشعار گہر بار و مثنوی ہائے آب دار
شدہ۔ اکثر جلسہ بافضلا و شعرا و دبیران می دارند و قدر دانی ارباب ہنر بدرجہ

اتم می فرمایند ۱۴
یہی مصنف کہتا ہے کہ میری کتاب تاج فراست سے بادشاہ کے علم و ہنر کا کچھ اندازہ کیا جاسکتا ہے۔
ہندوستانی زبان کے مشہور فرامشیسی عالم اور معلم گارساں دتاسی نے بادشاہ کی

۱۲ حزن اختصر مقدمہ ص ۱۱۱ ۱۳ بوستان اودھ ص ۱۸۱ ۱۴ مصنف کی طرح کتاب کا نام
بھی معلوم نہیں ہو سکا۔ اس اہم تاریخی کتاب کا ایک ناقص مطبوعہ نسخہ لکھنؤ یونیورسٹی کے کتب خانہ
میں موجود ہے۔

معزولی کے چند مہینے بعد ۳۰ دسمبر ۱۸۵۶ء کو اپنے سالانہ لکچر میں اپنے طالب علموں سے کہا ”مجھ کو داجہ علی شاہ سے اس بنا پر دل چسپی ہے کہ وہ ایک ممتاز

مصنف اور اچھے شاعر ہیں۔ ان کا تخلص اختر ہے اور وہ ہندوستانی شاعری کے آسمان پر چند روشن ستاروں میں سے ایک ہیں۔ میں تمہارے سامنے ان کی کتابوں اور نظموں کا ذکر دو سکے موقع پر کر چکا ہوں۔ وہ اپنے خاندان کے شالمان سلف کی روایتوں کے حامل اور ان کے لائق وارث ہیں۔ ان کا سارا خاندان ہندوستانی ادبیات کا محسن تھا اور اس کے اکثر افراد خود بھی ادبی ذوق رکھتے تھے۔“

داجہ علی شاہ کے شوق تصنیف و تالیف کے بارے میں ایک عینی شاہد کا بیان بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ لکھنؤ کے حاذق اور حسن طبیب شفاء الملک حافظ حاجی خواجہ شمس الدین احمد صاحب کے ایک بزرگ عزیز خواجہ زین العابدین مرحوم نے مدت ہوئی میر سوالوں کے جواب میں جو کچھ فرمایا تھا وہ یہاں درج کیا جاتا ہے: میں اٹھارہ سال کی عمر میں ۱۸۸۶ء میں داجہ علی شاہ کی سرکار میں ملازم ہوا۔ ابتدا میں میں جانور خانے میں ردی نوٹس لکھتا تھا۔ کوئی چار سال کے بعد حکمرانہ تعمیرات سے متعلق ہو گیا۔ دو برس بعد شاہی کتب خانے کا داروغہ مقرر ہوا۔ یہ ملازمت بادشاہ کے انتقال (۱۸۸۷ء) تک قائم رہی۔ اس طرح میں کوئی گیارہ برس بادشاہ کی سرکار میں ملازم رہا۔

بادشاہ کا معمول تھا کہ گرمی کے موسم میں صبح سے دس گیارہ بجے تک اندر جاؤں اور صبح کے وقت سے نو دس بجے رات تک تصنیف و تالیف میں مصروف رہتا تھا۔ جب میں کتب خانے کا داروغہ مقرر ہوا تو میرے سپرد یہ خدمت بھی کی گئی کہ اوقات تصنیف میں بادشاہ کے سامنے حاضر رہوں۔ وہ چاندی کے پلنگ پر دو زانو بیٹھتے تھے اور

لکھتے وقت بائیں طرف کو بہت جھک جاتے تھے۔ میں دست بستہ سامنے کھڑا رہتا تھا اور میری نگاہ اس کاغذ پر رہتی تھی جس پر وہ لکھتے بیٹھتے تھے۔ جب ایک صفحہ ختم ہو جاتا تھا تو میں جھک کر بائیں طرف اس کاغذ کو خشک کر کے پلٹ دیتا تھا۔ جب دوسرا صفحہ بھی بھر جاتا تھا تو وہ کاغذ علیحدہ رکھ دیتا تھا۔ یہ خدمت آخر وقت تک مجھ ہی سے متعلق رہی۔

جب میں یہ خدمت انجام دینے کے لیے حضور میں حاضر ہوتا تھا تو نفل اسکیپ کاغذ کے چند جڑ مسطر کشیدہ جن میں بنی اسطور کوئی آدھ اپنچ کا ہوتا تھا اور کچھ حاشیہ چھوٹا ہوتا تھا اور سیاہ نخل کے ایک ٹکڑے پر کئی قلم بنے ہوئے اور اس کے پاس ایک دوات یہ سب چیزیں پلنگ پر رکھی ہوتی ہوتی تھیں۔ قلم دوات کاغذ وقت معینہ پر بادشاہ کے پلنگ پر رکھ دینا بھی شاید انھیں کا کام ہے۔

بادشاہ معمولاً ایک جہز روز لکھتے تھے۔ محرم میں صرف مرثیے اور سلام تصنیف کرتے تھے۔ ان کی آخری تصنیف کسی فارسی کتاب غالباً حیات القلوب کا ترجمہ تھا۔ وہ اس کتاب کو فارسی نشر سے اردو نظم میں اتنی تیزی کے ساتھ ترجمہ کرتے تھے کہ معلوم ہوتا تھا کتاب کو نقل کر رہے ہیں۔ مرض الموت میں مبتلا ہونے سے کچھ دن پہلے تک وہ اس کام میں مصروف رہے۔

خود واجد علی شاہ کی تحریروں سے ادبی کاموں میں ان کے انہماک کا پتہ چلتا ہے۔ وہ اپنی ایک نیم متنازعہاں نواب اکلیل محل کو اپنے خط مورخہ، اردی قعدہ ۵، ۱۲۰۵ ہجری میں لکھتے ہیں۔

”بالفعل اپنے کلام کو جمع کر رہا ہوں۔ اس وجہ سے مجھے فرصت نہیں ہے۔ مگر جواب تمھارے محبت نامے کا ذوالفقار الدولہ سے لکھوا دیا ہے، خود سن لیا ہے۔ اگر تاج جمع ہونے کلام کے میں اپنے لکھنے سے نہ لکھوں تو کچھ اور خیال ذکرنا، کم محنت تصدیق کرنا۔ انشاء اللہ شرب اس سے

فراغت ہوئے گی بدستور نظم و شعر لکھوں گا ^۱
 ایک دوسری سیکم لکھ غزالہ کو ماہ ذی قعدہ ۱۲۲۵ھ میں ایک خط میں لکھتے ہیں:
 ”بالفعل میں اپنا کلام جمع کرنے میں مصروف ہوں۔ لہذا جواب
 ذوالفقار الدلدلہ سے لکھا کر خود سن کر بھجوا دیا۔ کم محبتی کی وجہ سے یہ بات
 نہیں ہے۔ انشاء اللہ بعد فراغ اپنے ہاتھ سے لکھ کر تمہارے حب و بھجواہ
 بھجواؤں گا۔ خاطر جمع رکھو۔“

داحد علی شاہ نے اپنی کتاب بنی میں جو ۱۲۹۲ ہجری کی تصنیف ہے، ایک
 جگہ اپنی چھالیس کتابوں کے نام بتانے کے بعد لکھا ہے ”یہ سب فقیر کے کتب خانے
 میں موجود ہیں اور جو ترزل سلطنت اور غارت بدعاشوں میں تاراج ہوئیں وہ خارج از
 حساب ہیں“ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جو کتابیں وہ اس وقت تک لکھ چکے تھے ان کی تعداد
 چھالیس سے بہت زیادہ تھی۔ فہرست تصنیفات بہ ترتیب حروف تہجی حسب
 ذیل ہے:

۱۔ اختر ملک	۲۔ افسانہ عشق	۳۔ ارشاد خاقانی	۴۔ ایمان
۵۔ بحر الہدایت	۶۔ بحر الفت	۷۔ بحر خلعت	۸۔ بنی
۹۔ تاریخ مذہب	۱۰۔ تاریخ ممتاز	۱۱۔ تاریخ خاص	۱۲۔ تاریخ فراق
۱۳۔ تاریخ مشغلہ	۱۴۔ تاریخ غزالہ	۱۵۔ تاریخ نور	۱۶۔ تاریخ حبشیہ
۱۷۔ تاریخ دہر	۱۸۔ تجلی عشق	۱۹۔ جوہر عروض	۲۰۔ حزن اختر
۲۱۔ دریائے تشق	۲۲۔ دستور و ہدایہ	۲۳۔ دفتر ہمایوں	۲۴۔ دیوان مبارک
۲۵۔ دفتر بریشان	۲۶۔ دلہن	۲۷۔ سخن اشرف	۲۸۔ شیوع فیض
۲۹۔ صحیفہ سلطانی	۳۰۔ صوت المبارک	۳۱۔ عشق نامہ	۳۲۔ قمر مضمون

۳۳۔ کلیات اختر	۳۲۔ کلیات سوم	۳۵۔ گل نشہ عاشقان	۳۶۔ مسودات حوشیہ
۳۴۔ ماہی نامہ	۳۸۔ مرقع فرخ	۳۹۔ مباحثہ بین النفس والعقل	۴۰۔ نا جو
۴۱۔ نظم نامور	۴۲۔ نضاح اختر	۴۳۔ ہیبت حیدری	۴۴۔ لغت ہفت زبان کردہ

ابھی ناتمام ہے۔

۳۵۔ پانچ چار کتابیں مراثنیٰ اور مصائب منظوم شہدائے کربلا میں کہ ان مرفیوں کا حساب نہیں کیا۔
۳۶۔ مجموعہ واحد یہ اس فہرست میں نمبر ۴۵ پر چار پانچ کتابوں کا ذکر ایک ساتھ کر دیا گیا ہے! اس طرح
یہ فہرست پھیلا لیس کتابوں کی نہیں کوئی پچاس کتابوں کی ہے بلکہ

نواب امیر علی خاں امیر نے بادشاہ کی انیس کتابوں کا ذکر کیا ہے، جن میں سے سترہ
بنی کی فہرست میں شامل ہیں۔ صرت دو کتابیں اور ہیں یعنی قصائد مبادک اور مقتل معتبر۔
بیش تر کتابوں کا تفصیلی بیان ہے اور آخر میں کہا گیا ہے کہ اسی طرح علوم و فنون میں حضرت
کی اور بہت سی تصانیف ہیں، جن کی تفصیل کی اس مختصر تحریر میں گنجائش نہیں ہے بلکہ

ہمارا جبے گوپال ثاقب نے اودھ کی تاریخ نجدۃ الکوائف کے نام سے ۱۲۰۶ھ
میں لکھی اور بعد کو اس میں ضمیمہ کا اضافہ کیا۔ اصل کتاب میں واحد علی شاہ کی پندرہ کتابوں کے
اور ضمیمہ میں پانچ کتابوں کے نام بتائے ہیں۔ ان میں سے سولہ کتابیں بنی کی فہرست میں
شامل ہیں۔ باقی چار کتابیں یہ ہیں، 'بیاض دباغیات'، 'بیاض سلاخ'، 'ہدایت السلطان'،
ارشاد السلطان اور لکھا ہے کہ ان کے علاوہ بہت سے مرثیے اور سلام اور بیش تر علوم و فنون
میں نثر و نظم کی کثیر تصنیفات ہیں۔

نصائح کلکتوی تذکرۃ المعاصرين میں لکھتے ہیں:

”تصنیفات و تالیفات چہ در نظم و چہ در نثر و یہ بلان فارسی چہ بزبان

اودر بختہ کلک گھر ملک ادست۔ گنجائش اسمائے تمامی آہنادر قہاباید
طویل و عریض۔“

اس کے بعد بادشاہ کی چودہ کتابوں کے نام بتائے ہیں جو سب بنی کی فہرست میں شامل ہیں۔
محسن نے اپنا تذکرہ شہر و اجد علی شاہ کے عہد سلطنت میں ۱۲۶۹ھ میں مرتب
کیا۔ اس میں بادشاہ کی تصنیفات و تالیفات کا ذکر یوں کیا ہے:

”سوائے اور تالیف و تصنیف کثیرہ کے تین دیوان تین مثنویاں کہ

خلاصہ فکر عالی ہیں واسطہ فیض عام کے طبع ہوئی ہیں۔“

پھر انھیں باتوں کی تکرار تین دفعہ کی ہے اور ہر دفعہ آخری فقرے میں زرا اسی لفظی تبدیلی
کر دی ہے یعنی

”طبع ہو کے واسطہ فیض عام کے مرحمت ہوئی ہیں“، ”تقسیم ہوئی ہیں“

”تقسیم فرمائی ہیں۔“

(سر پلاسٹن ۵، ۵۳، ۱۷۴، ۱۳۸۶)

منظر علی اسیر نے مثنوی دیباچہ المسلمین میں عہد و اجد علی کے آخری سال ۱۲۷۶ھ میں
تمام کی اس میں وہ کہتے ہیں:

کمال علم کی کیوں کر ہو تعریف کتابیں کیں بہت حضرت نے تصنیف

دو ادین درساں کا ہے مجمع کمالات و فضائل کا ہے مجمع

محسن اور اسیر کے ان بیادوں سے واضح ہوتا ہے کہ و اجد علی شاہ نے زمانہ سلطنت میں بہت
سی کتابیں رسالے، دیوان اور مثنویاں تصنیف کیں اور ان کو چھپوا کر تقسیم کر دیا۔

مرزا حاتم علی بیگ تہر کے ایک قطعہ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ و اجد علی شاہ کے
ایک رسالے کا موضوع فوجوں کی قواعد و یرید (تھا۔ تہر نے اس کا تاریخی نام مجاہدہ اختری
تجویز کیا تھا جس سے اس کا سال تصنیف ۱۲۶۱ھ نکلتا ہے۔

وہ قطعہ اور اس کے عنوان کی عبارت حسب ذیل ہے:

قطعہ نام تاریخی رسالہ واجد علی شاہ بادشاہ

یہ وہ رسالہ شہہ انجم سپاہ ہے جس سے ہر پلٹنوں کی قواعد کا انتظام
اے تہر حضور معلیٰ میں عرض کر تاج کا جھاگہ اختی ہے نام

کتاب نبی ۱۲۹۲ھ کی تصنیف ہے۔ اس میں جن کتابوں کی فہرست دی گئی ہے وہ اس سن
تک لکھی جا چکی تھیں۔ اس کے بعد بادشاہ تیرہ برس اور زندہ رہے۔ اس مدت میں جو کتابیں
لکھیں ان میں سے صرف چند کے نام معلوم ہیں رسالہ واجد علی سلطانید ترجمہ

مجموعہ سلطانید ثبات القلوب، جواب اودھ بلوہک۔

بادشاہ نے نظم و نشر کی اتنی کتابیں تصنیف کر دیں، لیکن ان کو نہ شاعری کا دعویٰ
ہے نہ نشر نگاری کا۔ اپنے طبعی انکسار کی بنا پر فرماتے ہیں۔

مستم آں کہ از نظم گویاں نیم ز سہم تفکر مشبک، تنسم
نہ از نشر گویان ذی اعتبار نہ از کاتبان شریا نگار

ایک شبہ کا ازالہ

واجد علی شاہ کی زندگی کا جو خلاص حقیقت تصور عام طور پر ذہن نشین کر دیا گیا ہو
اس سے یہ شبہ پیدا ہو سکتا ہے کہ مالی منفعت اور بادشاہ کی نظر میں سرخ روئی حاصل
کرنے کے لیے دوسروں نے کتابیں لکھ لکھ کر نذر کر دی ہوں گی جن کو صاحب تصانیف
بننے کے شوق میں بادشاہ نے اپنی طرف منسوب کر لیا ہو گا۔ لیکن یہ شبہ بالکل بے بنیاد
ہے۔ ان کی جس کتاب کے چند صفحے پڑھ لیے جائیں وہ خود بتا دے گی کہ اس کا مصنف
کون ہے۔ واجد علی شاہ جس بے تکلف انداز میں اپنا ذکر کرتے ہیں اور جس صفائی اور مبیاکی
سے اپنے ہر طرح کے نجی حالات بیان کر دیتے ہیں وہ کوئی دوسرا شخص کو ہی نہیں سکتا۔
درباریوں، زیر دستوں اور غرض مندوں کا ذکر نہیں، بالکل غیر متعلقان اور بے غرض لوگوں

نے بھی انستراع سلطنت کے بعد تک جب بادشاہ کے لیے کچھ لکھا تو ان کا انتہائی احترام ملحوظ رکھا۔ ان کی تحریروں میں جو شانہ داب و آداب اور عظمت و شوکت نظر آتی ہے، بادشاہ کی تحریروں میں اس کا شائبہ تک نہیں ہے۔ اس ناقابل تردید اندرونی شہادت کے علاوہ ایک ذاتی واقفیت رکھنے والے ہم عصر مصنف کا بیان بھی سن لیجیے۔ مولانا شرر فرماتے ہیں:

”واجد علی شاہ کا کلام برا بھلا جو کچھ ہے خاص ان کا ہے۔ اس میں ایک حرف بھی کسی اور کا نہیں۔ بادشاہوں کے یہاں عموماً صاحب کمال شعر و مصنفین ملازم ہوا کرتے ہیں اور انھیں کا کلام ان شہریاروں کے نام سے شایع ہوا کرتا ہے۔ بخلات اس کے واجد علی شاہ کی تصانیف میں رطب و یابس جو کچھ ہے ان کا ہے اور کسی کا ایک حرف بھی اس میں شامل نہیں ہے۔“

رجب علی بیگ سرور کا بیان ہے کہ واجد علی شاہ کی تخت نشینی پر انھوں نے ایک قطعہ تاریخ ایک عرضداشت کے ساتھ نذر کیا تو بقول سرور:

”تقدیر نے یادری کی، قسمت لڑکھئی۔ چوکی خانے میں حاضری کا حکم ملا۔ اکثر باریاب ہونے لگا۔ بارہا جو حضرت نے نظم کیا اس کی نشر لکھنے کا حکم دیا۔ مسعدت بخت سے جو تخریر کیا پسند ہوا، مزاج عالی غور بند ہوا۔ ایک دن موقع پا کے عرضداشت پیش کی۔ اس وقت طبیعت حق طویرت مخلوط تھی۔ دوشالہ رد مال مرحمت کیا، اقران و اشال میں اعزاز و امتیاز بخشا۔“

اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ سرور بادشاہ کے حکم سے ان کی نظموں کو نشر میں منتقل کیا

سمتے تھے۔ مگر کوئی ایسی تحریر یا کتاب میرے علم میں نہیں ہے جس سے اس بیان کی تصدیق ہوتی ہو۔

داجد علی شاہ کے طریقہ تصنیف کے بارے میں مولوی عبدالحق صاحب کی تحقیق اینٹن ملاحظہ ہو۔ فرماتے ہیں :

"داجد علی شاہ کی یہ عجیب عادت تھی کہ وہ اپنے کتب خانے میں گئے اور ادھر ادھر سے چند کتابیں اٹھالیں اور کتاب کہیں سے بھی کھول کر چند ورق نقل کر لے۔ اسی طرح جو کتاب سامنے آئی اس میں سے کچھ حصہ نقل کر لیا۔ وہ اس بات کا مطلق لحاظ نہیں کرتے تھے کہ یہ کتابیں کس مضمون کی ہیں یا میں نے مختلف مضامین اور علوم کی کتابوں کے اقتباس بے ٹھکانے جمع کر دیے ہیں۔ غرض بادشاہ کی کتابیں اسی طرح تصنیف ہوتی تھیں اور وہ خود نیز ان کے درباری ان کتابوں کو اعلیٰ تصانیف میں سے خیال کرتے تھے۔"

میں داجد علی شاہ کی تقریباً ستر کتابوں کا مطالعہ کر چکا ہوں۔ ان میں ایک کتاب بھی ایسی نہیں ہے جس پر مولوی صاحب کا یہ بیان صادق آ رہا ہو۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ بادشاہ کی کوئی تصنیف یا تالیف ان کی نظر سے نہیں گزری تھی۔ اس لاعلمی کی حالت میں کوئی شخص جس کے مزاج میں تحقیق و تصدیق کا شائبہ بھی ہو ایسی بے اصل بات اس بے باکی سے نہیں کہہ سکتا۔ بابا اردو کے اس بیان پر میں نے اپنے ایک مضمون میں بحث کر چکا ہوں جو ۲۲ ستمبر ۱۹۶۶ء کے ہمدادی ذبیان، علی گڑھ میں 'اسیر مینائی' کی دوکیاں کتابیں کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔

شاعری اور شاعروں کی قدردانی
داجد علی شاہ کی طبیعت میں موزونیت اور شاعری کا شوق فطری تھا۔ اختر

لے چند ہم عصر لطیف پریس، دہلی ۵۲

تخلص کرتے تھے شاعری سے ان کو جو غیر معمولی دل چسپی تھی وہ آخر عمر تک قائم رہی جو فرماتے ہیں :

شعر گوئی میں مزہ ایسا ملا ہے اختراعت کرتے کرتے کہ کبھی شوق غزل جائے گا
ضعیفی میں بھی لپٹی ہے بلبلے شاعری ہے بچھوٹے کی کبھی اختراعت قلم سے شوق طفلانہ
وہ لڑکپن میں بھی کچھ نہ کچھ نظم کرتے رہے ہوں گے، لیکن سترہ برس کے سن میں انھوں نے
باقاعدہ شاعری شروع کی اور اپنی فطری زود گوئی اور پیر گوئی کی بدولت ایک سال میں
دو دیوان اور تین مثنویاں کہہ ڈالیں۔ خود ان کا بیان ہے کہ ۱۲۵۳ ہجری میں پندرہ برس
کی عمر میں ان کی شادی ہوئی اور دو سال میں دو لڑکے پیدا ہوئے۔ ۱۲۵۵ ہجری میں انھوں
نے ایک خوبصورت عورت موتی خام کو اپنی دل بستی کے لیے نوکر رکھا۔ یہ بات خاص محل کو
بے حد ناگوار ہوئی۔ جب یہ خبر ان کے والد امجد علی شاہ کو ملی تو انھوں نے ناراض ہو کر موتی خام
کو ملازمت سے علیحدہ کر دیا اور بیٹے کو نظر بند کر دیا۔ اس خانہ نشینی کی حالت میں شعر و شاعری
کی طرف متوجہ ہوئے اور اس عورت کے عشق میں بوجہ دلولہ طبیعت دو دیوان اور تین مثنویاں
نظم کیں یہ اس وقت ان کا سن اٹھارہ برس کا تھا۔

ایسے قریب موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تین مثنویاں افسانہ عشق
دیباچہ عشق، اور بحر الفت ہیں جو شہزادگی کے زمانے میں تصنیف اور
طبع کی گئی تھیں اور شاہی کے زمانے میں نظرتانی کے بعد شایع کی گئیں۔ بادشاہ کی تصنیف
کے سلسلے میں ان مثنویوں پر تفصیل سے بحث کی جائے گی۔ یہ بات پورے یقین کے ساتھ نہیں
کہی جاسکتی کہ وہ دو دیوان کون سے ہیں جن کا سبب تصنیف بادشاہ نے بیان کیا ہے لیکن
ایک دیوان غزلیات سنی بہ گلہ سہ عاشقاں ایسا موجود ہے جو ان کی ولی عہدی کے زمانے
میں مکمل ہوا۔ اور تقریباً بائیس برس کی عمر میں ۱۲۵۹ھ میں شایع ہوا۔ اس کے سورت
پر مصنف کا نام خط طغرائیں یوں لکھا گیا ہے ”ابو المنصور کندر قد رسلماں چشم صاحب عالم
دلی عہد مرزا محمد واجد علی خاں بہجہ دار دام اقبالہ“

بادشاہ اپنی بادشاہی اور فرماں روائی کے زمانے میں بھی نثری تصنیفوں کے ساتھ ساتھ نظمیں بھی کہتے اور ان کے مجموعے مرتب کرتے رہے۔ زمانہ شاہی کی زیادہ تر تصنیفیں بادشاہ کے کلکے چلے جانے کے بعد غدر میں لٹ گئیں۔ بادشاہ اپنی سوانح عمری اور درناہ بھی لکھا کرتے تھے۔ یہ دونوں چیزیں بھی غدر میں تلف ہو گئیں۔

بادشاہ کی شاعری کا ذکر بہتوں نے کیا ہے۔ ان کے بعض ہم عصروں اور قریب العمد راویوں کے بیانات یہاں پیش کیے جاتے ہیں۔ راجا جے گوپال ثاقب اپنی مثنوی عنبر حمت میں جو ۱۲۸۴ ہجری کی تصنیف ہے کہتے ہیں۔

زہے جسم معانی جانِ عالم	جہاں را امن و سلطان عالم
فروغ دیدہ کشورستانی	فرزداں اختر ادب معانی
سخن سنج و سخن بین و سخن داں	سخن فہم و سخن ساز و سخن داں

بادشاہ کی وفات پر ایک قطعہ تاریخ میں ان کی شاعری کا ذکر یوں کیا گیا ہے

حضرت داجد علی سلطان عالم شاہ ہند	جن کا قبضہ ملک مضمون پر تھا کوفہ کے ساتھ
خسر و ملک معانی شہر یار ملک نظم	نوح مضمون میں بس جیسے قشون ہنر کے ساتھ
روح خاقانی کو سکتہ ہونے کیوں کر قبر میں	لطف مضمون ٹھہ گیا شاہ سخن گستر کے ساتھ

صفیر لکھنوی بادشاہ کی معزولی کے بہت دن بعد اپنی مثنوی گلشن عشق میں کہتے ہیں۔

کیا کروں ان کی شاعری کا بیاں	کہیے ہیں اپنے وقت کے سحباں
جتنے اہل زباں ہیں مانتے ہیں	بلکہ استاد اپنا جاننے ہیں
بادشاہ زمن وہ حضرت ہیں	شاہ ملک سخن وہ حضرت ہیں
چشم بد دور کیا طبیعت ہے	سینہ گنجینہ فصاحت ہے

صفیر بلگرامی ترجمہ بوستان خیال جلد اول کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

لہ رضا علی ضوی کی قلمی بیاض چمنستان بلاغت

”شاعری کی طرف جو طبیعت آئی اس کی شان وہ بڑھائی کہ
استادوں کی شان گھٹائی۔ تین مثنویاں چند دیوان حضرت کے یادگار
زمانہ ہیں“

وزیر علی صاحب اپنی مثنوی صیدیہ میں کہتے ہیں :

موتو ہے اس سے جہاں سخن کہ ہے اختر آسمان سخن
صغیر لکھنوی کی مثنوی آئینہ اختر کا تاریخی نام ظفر نامہ ہے جس سے اس کا سال
تصنیف ۱۲۷۶ ہجری نکلتا ہے۔ وہ بادشاہ کے ادبی مشاغل کے بارے میں کہتے ہیں :

فراہم تھے سب کا ملان جہاں طیب سخن رخ درامش گراں
مگر شہ کی تکمیل کا تھایہ حال کہ لیتے تھے صلاح اہل کمال
کھلی شہ نے دیوان فرمائے تھے مع پسند تصنیف چھپوائے تھے
زبان فصاحت بیاں کا کلام بہت تھا پسندیدہ خاص عام
وہ دیوان کہہ کر کبھی مثنوی کبھی دوسری قیسری مثنوی
بہت خوش بیانی سے موتی پر دے کہ از رفتہ دل جس کو سن سن کے ہوئے

راجا درگا پرشاد سندیلوی بادشاہ کی شاعری، شاعروں کی قدردانی اور ان کے عہد میں
لکھنوی شاعروں کے اجتماع کا ذکر یوں کرتے ہیں۔

”حضرت سلطان عالم داحد علی شاہ بادشاہ المتخلص بہ اختر در سخن
سرائی و معنی آفرینی از بلع البغداد فصیح الفصحا بودہ اند۔ در عہد دولت شہ
نازک خیال و سخن دران معنی شناس بہ پائے تخت اد جمع آمدہ از پایہ شناسی
قدردانی آن حضرت دامن آزد و پر از گل ہائے مراد گردند و بیش از وہم خیال
از القاب و خطاب دزد و جواہر بہرہ دانی ربودند“

ترجمہ: حضرت سلطان عالم واجد علی شاہ بادشاہ المتخلص بہ اختر سخن سرائی دہلی آفرینی میں بیلیوں سے زیادہ بیلیں اور فیضوں سے زیادہ فیض تھے۔ ان کے عہد سلطنت میں نازک خیال شاعروں اور معنی شناس سخن دروں نے دار السلطنت میں جمع ہو کر حضرت کی رتبہ شناسی اور قدر دانی سے آرزو کا دامن مراد کے پھولیوں سے بھر لیا اور القاب و خطاب، زرد جوہر سے دہم و خیال سے بڑھ کر بہرہ مند ہوئے۔

ان وابستگان دامن دولت کے علاوہ اور شاعر بھی شاہی انعام و اکرام سے سرفراز ہوتے رہتے تھے۔ ان سرفرازی یافتہ شعرا میں مرزا غالب دہلوی اور شیخ زکی مراد آبادی بھی تھے۔ غالب ایک خط میں یوسف مرزا کو لکھتے ہیں:

”میں چودہ پارچے کا خلعت ایک بار اور ملیوس خاص زمانہ درشاہ ایک بار پیش گاہ حضرت سلطان عالم سے پا چکا ہوں۔ مگر یہ بھی جانتے ہو وہ خلعت مجھے دو بار کس کے ذریعے سے ملا ہے؟ یعنی جناب قبلہ و کعبہ مجتہد العصر نجلہ العالی۔ اب آدمیت اس کی مقتضی نہیں ہے کہ میں بے ان کے توسط کے درج گسٹری کا قصد کروں۔ چنانچہ قصیدہ لکھ کر ادھیہا کہ میرا دستور ہے، کاغذ کو بنوا کر حضرت پیر و مرشد کی خدمت میں بھیج دیا ہے یقین ہے کہ حضرت نے وہاں بھیج دیا ہو گا اور میں تم کو بھی لکھ چکا ہوں کہ میں نے قصیدہ لکھ کر بھیج دیا ہے“

صاحب عالم مارہروی کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

”واجد علی شاہ بادشاہ اودھ کی سرکار سے جلد درج گسٹری پانوں پے سال مقرر ہوئے۔ وہ بھی دو برس سے زیادہ سبجے یعنی اگر چہ اب بھی جیتے ہیں مگر سلطنت جاتی رہی“

شیخ ہمدی علی خاں ذکی مراد آبادی کو بادشاہ نے "ملک الشعرا" خطاب عطا کیا اور
مرزا حیرت دہلوی اپنی کتاب چراغ دہلی میں لکھتے ہیں :

"واحد علی شاہ تخلص اختر شاعر بھی تھے۔ ان کے تین دیوان چھپے ہیں۔

اشعار سے رنگینی اور حکومت کی بول آتی ہے۔ اور بھی کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔

بعض دفعہ عربی اشعار بھی موزوں کیے ہیں لیکن ٹنگا گیا ہے کہ اگر ان میں غلطیاں

بھی ہوتی تھیں تو درباری علماء عداً طور سے ان اشعار کو صحت کا جامہ پہنا دیتے

تھے۔ غرض شاہ اودھ کی کل کتابیں دل جی سے خالی نہیں ہیں۔"

بادشاہ بہت زود نویس اور پرگو شاعر تھے۔ وہ خود کہتے ہیں۔

اس قدر جلدی غزل کہتا بہت دشوار ہے کب کوئی دنیا میں اختر آپ سا پیدا ہوا

ان کے اس دعوے کی تصدیق دوسروں نے بھی کی ہے۔ رفعت علی رفعت اپنی مشنوی

نقد غالب جنگی میں واحد علی شاہ کی مدح میں لکھتے ہیں۔

سخن سنجے کہ در یک خط بے فکر بہ نظم آرد ہزاراں معنی بکر

محمد کاظم نے اپنی کتاب سوانح عمری بادشاہ کے انتقال سے چند ماہ بعد ۳۰۵ ہجری میں
لکھی۔ ان کا بیان ہے

"در زکات طبع و ذہانت بے عدیل و در اکثر فنون مثل شاعری و قوافی

والی و موسیقی عدم النظیر خصوصاً در شاعری کہ طبع تواج و مضمون خیز و قوت

تصنیف آں قدر شعر عجول و سرعت تصنیف کی کہ دند کہ دوس از کتابان در

تحریر آن عاجز می شدند

ترجمہ: زکات اور ذہانت میں بے نظیر تھے اور اکثر فنون میں مثل شاعری و قوافی والی اور

موسیقی کے بے مثل تھے خصوصاً شاعری میں بادشاہ کی طبیعت تواج اور مضمون خیز

تھی۔ اس قدر جلد شعر کہتے تھے کہ دو کتاب ان کو نہ لکھ سکتے تھے۔

مولوی عبدالکلیم شہر کا چشم دید بیان ہے۔

”میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ اپنے دائرہ دولت سلطان خانے سے بچے پر سوار ہو کر امام باڑہ سبطین آباد کی مجلس میں شریک ہونے کے لیے روانہ ہوئے اور جو مرثیہ و سلام وہاں پڑھیں گے انھیں راستے میں تصنیف کر رہے ہیں۔ دو کتاب ساتھ ساتھ چل رہے ہیں۔ ایک کو مرثیے کے بند تصنیف کر کے لکھواتے ہیں اور دوسرے کو سلام کے اشعار۔ مرثیہ لکھنے والا جب تک مرثیے کا بتایا ہوا بند لکھے سلام لکھنے والے کو سلام کا شعر بتاتے ہیں اور دونوں کو اس قدر جلد جلد بتاتے جاتے ہیں کہ ایک کا کلمی قلم رکنے نہیں پاتا۔ امام باڑہ و دفتر لانگ بھی نہ ہو گا میگر وہاں تک پہنچتے پہنچتے پورا سلام اور مرثیے کے چھ بند لکھوا دیے۔ دو مختلف بحر پر ایک ساتھ طبع آزمائی کرنا جس قدر دشوار امر ہے اس کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو شعر کہنے کی مشکلوں سے واقف ہیں علیہ

شاعری کے فن میں واجد علی شاہ کے استاد فتح الدولہ مرزا محمد رضا برق تھے۔ استاد کے انتقال کے بعد بادشاہ نے ان کا ذکر یوں کیا ہے :

”فتح الدولہ بخشی الملک مرزا محمد رضا برق استاد مرحوم راقم ابن مرزا کاظم علی صلیہ جنھوں نے تادم مرگ گھر سے قدم باہر نہیں نکالا بخشی نذر کو میر والد کے عہد سلطنت میں تمام فوج کے بخشی رہے اور میرے عہد میں استاد عاشق رہے اور بعد از انتراع سلطنت ہمراہ آئے اور زندان قلعہ و سیم فورڈ لکھنے میں بھی میرے ساتھ قید ہوئے۔ اور اسی زندان میں جان بحق ہوئے۔ اور وقت

دم واپس یہ بیت اور یہ مطلع پڑھ کر روانہ فردوس ہوئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ اِنَّا

اِلیْہِ راجعون

مطلع برق جو کرنا تھا آخر دہی کو کے اٹھے جان ہی آپ کے روانے پر مر کے اٹھے
بیت سانس لینے میں ہر گھاسے سک جاتے تن برق بدلو جاتے ہی پڑانا ہو گئی آج
اپنی شنوی حزن اختار میں بھی اپنے استاد کی وفات پر افسوس کیا ہے۔

زن و مرد سے کم ہوئے سات لوگ مجھے فتح دولہ کا اب بھی ہے سوگ
خدا بخشے اس کو عجب مرد تھا فن شاعری میں تو وہ فرد تھا
یہ بند ہے شاگرد اس ماہ کا بندھا ہے دھواں ل میں اک آہ کا

بادشاہ کی طبیعت میں موزونیت فطری تھی۔ اسی کے ساتھ انھوں نے علم عروض و قافیہ کی بخوبی تحصیل کی تھی۔ وہ اس علم کو شاعروں اور شعراء سے دل چسپی رکھنے والوں کے لیے ضروری سمجھتے ہیں۔ فرماتے ہیں :

”شعر کے شائقوں کو علم عروض اور قافیہ کا بھی ضرور چاہیے اور موزوں کرنے والوں کو خبر ان دونوں فنون کی واجبات سے ہے“

”اب قریب تیس برس کے سن ہوا۔ سوائے شغل شعر اور شاعری کے اور کوئی شوق نہیں ہوا۔ مگر یہ سب بغیر علم عروض اور قافیہ کے بے رنگ تھا“

”فتح الدولہ بخشی الملک محمد رضا خاں بہادر فتح جنگ المتخلص بہ برق

حاضر حضور ہوئے۔ اسے زمانہ تین برس کا یا کچھ زیادہ گزرا ہو گا کہ چرچا اس فن کا پھر نازہ ہوا۔ حقیقت میں بہادر و صوف حکیم اس فن کا ہے۔ مولف کو کوکبی ذوق و شوق عروض اور قافیہ کی طرف اور میلان طبیعت کا اس واسطے کہ چار کی محفل میں جواب دینے سے عاری نہ ہوں بہت بڑھ گیا“

بادشاہ نے ایک شعر میں عروض کی بہت سی کتابیں دیکھنے کا ذکر کیا ہے۔

بہت میں نے دیکھی کتاب عروض سو اس کے لکھی جواب عروض
انھوں نے شمس الدین نقیر کے رسالہ عروض و قافیہ کا فارسی سے اردو میں ترجمہ کیا اور اس
موضوع پر نثر و نظم میں کئی رسالے لکھے جن کا تفصیلی ذکر ان کی تصنیفوں کے سلسلے میں کیا جائے گا۔
اس علم سے بادشاہ کی اتنی دل چسپی دیکھ کر امام الدین طالت اپنے رسالہ عروض و
قافیہ سبھی بہ تقویت الشعاع کے دیباچے میں لکھتے ہیں :

بہ دور حضرت واحد علی شاہ کہ ہے سب اہل فن کا وہ خبر گیر
وہ حسن صورت و سیرت ہے اس کل کہ عالم کو کیا ہے اس نے تسخیر
گزرتا مگر نظر سے یہ رسالہ کہ کیا دیکھ چکی ہے میں نے تقریر
خدا اگر چاہتا اس کے صلے میں بجائے زر مجھے دیتا وہ جاگیر
طالت ایک ذی علم شخص تھے۔ بقول خود ظاہری دباطنی میں شاہ عبدالعزیز دہلوی کے اور
شاعری میں شاہ نصیر کے شاگرد تھے۔ خاتمہ کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس سے پہلے
چار کتابیں لکھ چکے تھے۔ ذبیح سلیمان جاہی، استخراج بوضع کو اکب میں، (۲) مجموعہ عظیم
عزیزہ، شاہ عبدالعزیز کے وعظ بعض سورہے قرآن سے متعلق، (۳) دستور العمل، استخراج
علم جفر میں، (۴) افشاے پربتہار۔ ذبیح سلیمان جاہی بقول مصنف تمام زچوں کا خلاصہ
ہے۔ یہ کتاب غالباً سلیمان جاہ نصیر الدین حیدر بادشاہ اودھ کے عہد میں لکھی گئی تقویت الشعاع
کا ایک نسخہ مطبع خواجہ محمد امین کا چھپا ہوا میرے کتب خانے میں موجود ہے۔

شاہی محل میں مشاعرے

واجد علی شاہ اپنے محل میں مشاعرے کرتے تھے، ان میں شریک ہوتے تھے اور
شعر کی خاطر تواضع خود بنفس نفیس کرتے تھے۔۔۔ مشاعرے کی صحبت میں یہ امتیاز نہیں
ہوتا تھا کہ اس صحبت میں حاکم اور سردار کون ہے۔

لہ اسرار واجدی قلمی

واجب علی شاہ منشی مظفر علی اسیر لکھنوی کے بارے میں کہتے ہیں :

”یہ شخص دس پندرہ برس کے سن میں راقم کا ہم پالہ اور ہم نوالہ ہوا۔

اور صحبت مشاعرہ کوئی ایسی نہ ہوتی تھی جس میں اس کے میرے ہم راہی نہ ہو۔“

یہ عبارت بتاتی ہے کہ ایک زمانے میں بادشاہ اسیر کے ساتھ مشاعروں میں شرکت کیا کرتے تھے۔ یہ مشاعرے شاہی محل میں ہوتے ہوں گے

اور وہ کے ریڈیٹ کرنل سلیم نے گورنر جنرل لارڈ ڈالہوزی کو اپنے خط مورخہ ۱۲ ستمبر ۱۸۴۹ء میں لکھا

”تقریباً دس دن ہوئے لکھنؤ کے سرشاہر بادشاہ کا کلام سننے کے لیے

محل میں جمع ہوئے تھے۔ وہ سب ان کا کلام سننے اور اپنا کلام سنانے کے لیے

۹ بجے رات سے ۳ بجے صبح تک بادشاہ کے ساتھ بیٹھے رہے۔ ان اشعاروں

میں سے ایک نے جو ایک سابق وزیر محمد الدولہ آغا میر کے سب سے بڑے بیٹے ہیں

مجھ سے کہا کہ ایک بادشاہ کو دیکھتے ہوئے کلام بہت ہی اچھا تھا“

محمد الدولہ سے سلیم کی مراد محمد الدولہ ہیں اور ان کے بڑے بیٹے وہ تھے جن کا خطاب امین الدولہ اور تخلص تھر تھا۔ ان کا مطبوعہ دیوان راقم کے کتب خانے میں موجود ہے۔

دیوان زند میں ایک سر غزل ہے جو واجب علی شاہ کی فرمائش پر لکھا گیا تھا۔ اس کا

عنوان ہے ”سر غزل حسب الحکم بادشاہ جم جاہ خلد اللہ ملکہ“ پہلی غزل کا مقطع یہ ہے

زند ہے سرکار عالی میں قدیمی جاں نثار

کب اُسے خلعت میں شمشیر و سپر ملتی نہیں

زند کے دیوان ثانی میں ایک غزل کا عنوان ہے ”غزل مشاعرہ واجب علی شاہ بادشاہ“

یہ تائیس شعر کی طولانی غزل ہے۔ چند شعر نقل کیے جاتے ہیں۔

دقار شاہ ذوی القدر دیکھ چکے ظہور قدرت پروردگار دیکھ چکے
 وہ جیتے جی ہوئے ایذا سے نزع کی آگاہ جو صدمے تیرے شب انتظار دیکھ چکے
 جنوں نے خوب کھائی بہا حبیب و کنار ہو اس اُڑتے ہوئے تار تار دیکھ چکے
 نہ پہنچا ایک بھی ذرہ تمہارے امن تک اڑا کے خاک بھی ہم خاکسار دیکھ چکے
 بھلا وہ خاک کریں قصد زم ہستی کا ہو لوگ راحت کنج مزار دیکھ چکے
 قصور بخت ہے پھر جائیں اب اگر محرم در کریم تو اُمید دار دیکھ چکے
 ہوائے ذاتِ خدا کے واسطے ہے فنا ثباتِ ہستی ناپائیدار دیکھ چکے
 الہی تو نے شرف جس کو آسمان پہ دیا وہ سر زمین بھی یہ خاکسار دیکھ چکے

فقیر بھی مترصد نگاہِ لطف کا ہے
 اور بھی دستِ مرا شریار دیکھ چکے

محمد بخش شہید شاگردِ ناسخ کی ایک غزل کے تین شعور درج کیے جاتے ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ غزل شاہی مشاعرے میں پڑھی گئی تھی۔

نہ کیوں شاداں ہو ہر گلِ زد کہ شائستہ کی محفل برنگِ غنچہ ہائے گلِ شگفتہ غنچہ دل ہے
 بلند آسمان کی قصر شائستہ دکھتا ہے جو کمرہ ہے در برج نہرے یا ماہِ کامل ہے
 پڑھوں شعرا میں کچھ اور تاسیسی توانی میں کہ شائستہ کی محفل سخن دانوں کی محفل ہے
 شیخ امداد علی یا در شاگردِ شہید کی ایک غزل بھی غالباً شاہی مشاعرے میں پڑھی گئی تھی جس کے منتخب اشعار درج ذیل ہیں :

کسے دیکھیں سوائے جانِ عالم کہ عالم ہے فدائے جانِ عالم
 بہت نازاں ہیں گلِ جامے پہ اپنے سنگھار دیجیے قباے جانِ عالم
 چراغِ آفتاب و شمعِ مہ میں کہاں نور و ضیاء جانِ عالم

لے دیوان ثانی رستہ ص ۱۹۲-۱۹۳ لے دیوان شہید ملی لے و اجد علی شاہ کا لقب

سلطان عالم اور عرت جانِ عالم تھا۔

مٹا دوں اے ہوس رنگ اکیر دکھا دوں خاک پائے جانِ عالم
انہیں پرواہ ہے کیا نسل ہما کی جو ہیں زیرِ لواے جانِ عالم
نہیں بھٹکتے کسی اہلِ دول سے وہ سرکش ہیں گدلے جانِ عالم
سخن فہم و سخنِ دان و سخنِ رس نہیں کوئی رسوایے جانِ عالم
عدد سے کبھی نہیں دل میں کذرت نہ ہے صدق و صفاے جانِ عالم
ٹپکتی ہے مری باتوں سے الفت یہ ہے جوشِ دلاے جانِ عالم

رقابت کیجیے کس کس سے یا دد

زمانہ ہے فداے جانِ عالم

واجہ علی شاہ کی مہارت کو سہتی کی بنا پر قیاس کیا جا سکتا تھا کہ وہ شاعرے ہیں
اپنا کلام خوش الحانی سے پڑھتے ہوں گے مقبول الدولہ مرزا احمدی علی خاں قبول کے ایک
فحش کے مندرجہ ذیل بند نے اس قیاس کو یقین سے بدل دیا

متفق اس امر پر عالم میں ہیں ذی عقل و ہوش نرگس گلِ دونوں ہیں یا شہِ ندے چشم و گوش
شعر سن کر ہو گئے مرغانِ خوش الحانِ خوش پیر کے بھی دل میں کیوں آئے جوانی کا نہ جوش

کہنے والے، پڑھنے والے ہوں جو سلطان آپے

جب تک واجہ علی شاہ بادشاہ رہے لکھنؤ میں شاعروں کا جھگڑا رہا۔ مگر جب وہ
معزول ہو کر لندن کے ارادے سے روانہ ہو گئے تو یہ مجمع منتشر ہو گیا اور شعر و سخن کی محفلیں سونی
ہو گئیں۔ شہید لکھنوی جوشاہی شاعروں میں شریک ہو کر دہلی کی رونق اور شان دیکھ چکے
تھے، کس حسرت سے کہتے ہیں۔

لکھنؤ بے کس ہوا حضرت جو لندن کو گئے ہم یہاں نالاں ہیں وہ فریادِ دشمن کو گئے
فضل گل کب آئے گی کٹیوں کے آخرِ نمہ سنج ایک مدت ہو گئی یارانِ گلشن کو گئے

خود داجہ علی شاہ کہتے ہیں :

جب سے قیدی ہوا کھنکے میں اگر اختر
شاعر ہند بہت لطف سخن بھول گئے
امیر اللہ تسلیم کا مندرجہ ذیل شعر بادشاہ کے اس قول کی تصدیق کرتا ہے
عہد شاہی تک ہی تسلیم شاعر کی کس توقع پر کریں اب کس بین کی آرز
بادشاہ کو آتش کا کلام بہت پسند تھا۔ فرماتے ہیں ۔

کلام شاعران ماسلف منسوخ کر ڈالا
جنہیں کچھ عقل ہے آتش کا دیوان لے لیتے ہیں

شعر کی قدر دانی انتزاع سلطنت کے بعد

داجہ علی شاہ شاعروں کے بڑے قدردان تھے۔ انتزاع سلطنت کے بعد میسوں
شاعران کے دامن دولت سے وابستہ ہو کر مٹیا برج میں مقیم ہو گئے۔ ان کے علاوہ بہت
سے شاعر صلہ و انعام پاتے رہتے تھے منشی امیر اللہ تسلیم شاعر بھی تھے اور خوش نویس بھی۔
انہوں نے ایک منظوم عرض داشت خوش خط لکھ کر بادشاہ کی خدمت میں پیش کیا۔ بھیجی۔
بادشاہ نے اس پر منظوم حکم لکھ دیا :

بشنوئے خوش نویس دے خوش گو
ایں دونوں ہی کنی دہر دو نکو
نام تو مندرج بہ دفتر شد
بت دہہ رد پیہ مقرر شد
یعنی تیس روپے ماہوار وظیفہ مقرر کر دیا۔

مولوی محمد بخش شہید ناسخ کے شاگرد تھے اور خود استاد کی کامرتبہ رکھتے تھے۔
ان کے شعر ذیل سے معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ کی سرکار سے ان کا بھی کچھ وظیفہ مقرر ہو گیا تھا۔
تقدیر خوار سلطان عالم کا اثر یہ ہے
سخن انوں میں شہر ہے شہید اکمل ہے کامل ہے

لے حیات تسلیم از عمرش گمادی اشاعت دوم ص ۱۲۷ دیکھیے میرا مضمون، شہید

لکھنوی، شعاع اردو، الہ آباد، جولائی ۱۹۴۷ء

بمقتضائے مراحم خسروی مرحمت شدہ است ^{۱۱}

وہی قطعہ بعض شعروں میں ضروری ترمیم کر کے اسی طرح کی عرض داشت کے ساتھ ۱۲۵۵ھ میں واجد علی شاہ کی خدمت میں لکھتے بھیجا۔ اس عرض داشت میں بادشاہ کی تصنیفات مانگیں اور اپنی زیر تصنیف کتاب سیواسلطان و سوانح واجدی کی تکمیل کے لیے روزنامہ اور سوانح عمری عنایت فرمانے کی درخواست کی۔ بادشاہ نے اس عرض داشت پر فارسی میں جو طولانی عبارت ہے قلم برداشتہ لکھ دی وہ ظہیر الدین نے اپنی مطبوعہ کتاب ظہیر الاشفاق اور غیر مطبوعہ کتاب اسرار واجدی میں من و عن نقل کر دی ہے۔ اس کے بعض اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں۔ قطعے کی تعریف میں لکھا:

”شعاع آفتاب کلامش برزہ دلم تابید کہ سرتاپا جو حیرت گشتم
صفائے بندش حسن کلامش کہ دریا نتم بہر دودست دل گرفتہ ماندم
بخدا کہ ہرگز قابل دلائل چنین تحریر ہے نظیر بنوم لطف و کیفیت وجدانی
از لب نئی خیزد مگر آں چہ از دل خیزد بر دل ریزد ^{۱۲}

اپنی تصنیفات کے بارے میں لکھا:

”تالیفات و تصنیفات عمدہ راسل غارت باغیان ہرچو خوش خاشاک
درامواج تاراج چنان غرق ساختہ کہ اثر حرفے از آن باقی نیست ^{۱۳}

روزنامہ اور سوانح عمری کے بارے میں لکھا۔

”روزنامہ اور سوانح عمری خبر آہ جگر دود و دل اختراشا م زندان یا
صبح غریباں یا بحر اشک یا تصادم رشک دور از یاران، مجرد سیون
فراق زنان و فرزند ان حال دیگر چیست ^{۱۴}

ظہیر الدین کی کسی تصنیف غالباً سیواسلطان و سوانح واجدی کے لیے اشتیاق کا ظہار

یوں کیا۔

”حبذا تصنیف کہ از کلک صداقت سلکش بمطالعہ راقم درآید۔ بدل کہ ہمہ تن مشتاق مشاہدہ اس تحریر دل پذیر صدق نظیر ام۔ دربارش دیر بناید ساخت ^{یہ}

اس قطعے کے صلے کے متعلق لکھا :

”صلہ اش بعوض ہر نقطہ ایک گنج مرزا یداست، مگر درین مان مبلغ پنجاہ روپیہ درماہ اوبرائے ضرورت تیاری کتاب سیو السلطان و سوانح واجدی مقرر نمودیم ^{یہ}

قطعے کے ایک حصے میں جو داجد علی شاہ سے متعلق ہے کچھ اعداد و سنین کا ذکر آیا ہے۔ بادشاہ نے ہر عدد اور ہر سن کی مناسبت سے روپے اور اشرفیاں صلے میں دیں جن کی مجموعی رقم دو ہزار نو سو دس روپے ہوئی اور اس کے بارے میں لکھا کہ یہ رقم ”موافق تمہید خود باد عنایت فرمودیم بالقی بعد تمہید ^{یہ}

اس تحریر کے آخر میں اپنا نام مع تاریخ یوں لکھا۔

”بقلم پرورد و الم ہج ملاں جان عالم اختر مورخہ ۲۹ ر شوال المکرّم ۱۲۴۵ ہجری ^{یہ}

ظہیر الدین اس تحریر سے جس قدر متاثر ہوئے اس کا اظہار یوں کیا ہے :

”از ہر حوت و ہر فقرہ اس فرمان والا شان کہ بہ افشا و المائے قلم خاص زیب تحریر پذیرفتہ است ملاحظہ کردنی است کہ چہ بلا تاثیر است کاتب الحروف فدائے ہمیں تحریر سخن شناسی و قدر دانی ہواست۔ انعام صلہ بر مدح از ممدوح گوشتن کار و بار فردشان و شاعران است مگر چنین

صلہ و قدر دانی و نکتہ رسی و مضمون نہی و داد سخن و قبول خاطر کہ از مضمون
فرمان معلی پیدا است چہ انعام روحانی است کہ دل ہی دانند ^۱
ظہیر الدین نے آگے چل کر دو مختلف مزاجوں کے لوگوں کا ذکر ان لفظوں میں کیا ہے۔
”ہمیں یک سخن است کہ یکے بہ شنیدنش خوش و محظوظ شدہ باہر تہہا
خود را کمتر دیدہ انعام می بخشد و فروتنی ہامی کند ... ویکے باہر تہہ کمتر ہوا خود را
بالا تر از اں دیدہ بر ہم می شود ^۲

اور مقدم الذکر مزاج کی مثال میں داجد علی شاہ کی اس تحریر کا حوالہ دیا ہے۔
راجا درگا پرشاد سندیلوی اپنی تاریخ اودھ میں بادشاہ کی اسی تحریر کے بارے میں لکھتے ہیں:
”ناظر کتاب ازین دستخط خاص استنباط قدر شناسی علم آں حضرت
می توانند ساخت و معلوم توانند کرد کہ ایں بادشاہ قدسی صفات را با علم و
فضل چگونہ مناسبت بودہ است و با وجود ایں ہمہ افکار و آلام ہنوز چہ قدر
قدر دانی سخن می فرماید ^۳

اس حقیقت کے لیے کسی مزید ثبوت کی ضرورت نہیں ہے کہ داجد علی شاہ اپنے عہد میں
شعر و سخن کے سب سے بڑے قدر دان اور شاعروں کے سب سے بڑے سرپرست تھے۔
شیو پر دھان ہمارا راجا جے گوپال سنگھ بہادر ثاقب مختلف صنعتوں میں مدحیہ قطعے
فارسی میں کہہ کر بادشاہ کے حضور میں پیش کیا کرتے تھے جس کے صلے میں وہ اضافہ و وظیفہ اور
دیگر مراحم و نوازش خاقانی سے سرفراز ہوئے۔ بادشاہ کے حکم سے ان قطعوں کو کچا کر کے ایک
کتاب مرتب کی اور اس کا تاریخی نام نادلت الثاقب رکھا جس سے اس کا سال تالیف
۱۲۹۰ ہجری نکلتا ہے۔ کتاب کے اختتام پر ایک نظم ہے جس میں یہ اشارہ بھی ہے:
بود بس کہ الطاف پروردگار ^۴ بود لطف سلطان بن بے شمار

به سال گزشتہ زاعزاز دجاہ
 ہم اکنون در ہر درخت کیشود
 دگر لطف شاہانہ مبذول داشت
 فزوں است لطفش ز وہم و قیاس
 گمراہی خطایم عطا کرد شاہ
 بہ ما ہائے من ترقی نمود
 بہ فضل و نوازش چہا برخواست
 بردن است ز اندازہ شکرد سپاس

شعر میں نے نے طرز کی بنوئیں کرنا نسخہ والوں کا متنازع طریقہ ہے۔ برتن کا یہی کچھ ٹوٹا پھوٹا کلام مجھے یاد آگیا ہے۔

اس طرح گردوں نے مجھ کو لاکے پٹکا خاک پر تن سے ادینا ہو کے سایہ شامیانہ ہو گیا
برتن نے مرتے وقت یہ شعر لکھ کر بادشاہ کے پاس بھیجا
برتن جو منہ سے کہا تھا وہی کہے اٹھے : جان دی آپ کے دردازے پہرے کے اٹھے
دیوان ان کا چھپ گیا ہے۔

مہتاب الدولہ درخشاں - درخشاں کا نام مع خطاب مہتاب الدولہ کوکب الملک
سید علی بہان خان بہادر تھا یہ منشی مظفر علی اسیر سے فن شعر کو حاصل کیا تھا۔ ان کی
سخن سنجی و خوش گوئی پر اسٹاکو کو بھی ناز تھا۔ برتن نے اپنے خوش فکر شاگرد مرزا محمد رضا طور کو
ادراستیر نے درخشاں کو دربار شاہی میں پیش کیا۔ درخشاں اور قلی کی نذر ساتھ ہی ہوئی اور
دونوں کو خطاب بھی ساتھ ہی ملے درخشاں کو مہتاب الدولہ اور قلی کو آفتاب الدولہ الحاق
اور دھکے بعد قلی اور اسیر لکھنؤ میں رہ گئے۔ طور کو بلائے معلیٰ چلے گئے، برتن اور درخشاں
بادشاہ کے ساتھ مٹیائبرج میں رہے اور وہیں مر بھی گئے۔

بادشاہ کے قلعے سے چھوٹنے اور سہ ماہی کے فتنہ و فساد فرد ہونے کے بعد لکھنؤ سے
اور بھی شعر اپنیچے اور ملازمان شاہی میں منسلک ہوئے۔ سات شاعر ان میں سے سبوتیارہ
کہلاتے تھے۔ یہ امتیاز حضرت کا دیا ہوا تھا۔ درخشاں بھی ان ساتوں میں داخل تھے۔
کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ ہوادار پر سوار چلے جارہے ہیں۔ شعر کو باریابی کا موقع
مل گیا۔ باتوں باتوں میں کوئی مصرع حضرت کی زبان سے نکل گیا۔ سب نے مل کر اسے طرح
قرار دے لیا۔ پھر جو سواری ہوئی تو اپنی اپنی غولیں مناتے ہوئے ہوادار یا بوچے کے ساتھ ساتھ
چلے۔ بوچے کے کہا مرزا ج شناس تھے۔ آہستہ آہستہ قدم اٹھانے لگے اور سیدھی راہ کو چھوڑ کر

باغوں کے اندر ہوتے ہوئے گزرے۔ شعرا جب پڑھ چکے تو رئیس الدولہ جو خوش فویسوں کے انسر اور مطیع سلطانی کے ہتھم تھے بوجے کے قریب آئے اور بادشاہ کی غزل صاف کی ہوئی گوزال دی۔ ان سے غزل لے کر حضرت نے پڑھنا شروع کی، کلام الملک، ملوک الکلام، کاشور بلند ہوا۔ لیجیے شاعر ہو گیا۔ جہاں پناہ رئیس منزل میں داخل ہو گئے۔

بادشاہ کہتے تو بہت تھے مگر شاعرے میں آنے کا ذوق نہ تھا۔

مہتاب الدولہ سن شخص تھے۔ نسخہ دانش کے شاعروں کا ذکر کیا کرتے تھے۔

دخشاں کی ایک غزل کے چند اشعار یہ ہیں:

کبھی تم نے بھی گل کھایا تو ہوتا جلال نے کا مزہ پایا تو ہوتا

کوئی نیسے لیے ہے بے خورد خواب تمہیں اتنا خیال آیا تو ہوتا

کہیں سکتہ نہ عاشق کو ہوا ہو اسے آئینہ دکھلایا تو ہوتا

پلائی مگر نہ ساقی نے مجھے

دکھا کر جام ڈھکایا تو ہوتا

یہ غزل بھی اسی طرح کے شاعرے کی ہے جو سواری کے ساتھ ہوا کرتا تھا۔ بادشاہ کی غزل بھی اس طرح میں ہے۔ ان کا ایک شعر یہ ہے۔

مجھی کو دعا عطا پند نصیحت

ذرا اس کو بھی سمجھایا تو ہوتا

مجھ سے رئیس الدولہ نے ذکر کیا کہ اپنی غزل پڑھ کر حضرت نے خواجہ حیدر علی آتش کا مطلع پڑھا۔

کبھی وہ سرود قد آیا تو ہوتا

کوئی دم گور پر سایا تو ہوتا

اور مہتاب الدولہ سے فرمایا کہ دیکھو نہ ظاہر یہ مطلع دو سخت معلوم ہوتا ہے۔ انھوں نے عرض کیا بجا ارشاد ہوتا ہے۔ کہنے لگے نہیں سرود کو گور سے ایک مناسبت ہے۔ یہ درخت قبرستان میں اکثر لگاتے ہیں۔ یہ لڑکیوں کی رسم ہے۔ مہتاب الدولہ نے کہا کہ کوئی دم، کا لفظ بھی سرود

کے مناسب حال ہے کہ اس کا سایہ دیر تک نہیں رہتا۔ پھر فرمانے لگے کہ فارسی کے ساتھ
سایہ اور آیا کبھی قافیہ نہ کریں گے۔ اردو میں کوئی اس کا خیال نہیں کرتا۔ میں نے بھی
یہی اختیار کر لیا ہے۔ مہتاب الدولہ نے ناسخ کا مطلع پڑھا۔

گھر غمِ فرقت میں سونا ہو گیا

کنجِ مرقہ کا نمونہ ہو گیا

اور عرض کیا کہ دیکھیے تیغ نے بھی ہمارے تختی کو ردی قرار دیا ہے۔ جناب مفتی میر عباس صفا
کے پاس یہ ذکر پہنچا۔ انھوں نے اس مسئلے میں یہ اجتہاد فرمایا کہ دیکھا اور نمونہ اور اچھا قافیہ
نہ کرنا چاہیے۔ لیکن سایہ اور گویا اور نمونہ اور سونا میں کچھ قیاحت نہیں۔ ایک بادشاہ کے
دم سے مٹیابر ج میں عجب دل چسپ مجمع رہا۔ کیسے کیسے دقائق چھن گئے اور کتنے لوگ شاعر
طیب و علامہ بن گئے۔

درختاں کی ایک نزل کا مطلع ہے :

کلِ وہ جو چھہ کر دیکھ کے بیگانہ بن گیا ۔ میں بھی تو ہشیار ہوں دیوانہ بن گیا
یہ زمین بھی بادشاہ کی نکالی ہوئی ہے۔

بادشاہ کی عادت تھی جہاں دیکھا کہ شعراے سب سے زیادہ میں سے کچھ لوگ سلام کو حاضر
ہوئے ہیں، باتوں باتوں میں کوئی مصرع نظم کر دیا۔ یہ لوگ اکثر کوئی قطعہ یا رباعی جس میں
اعادہ سلطنت کی دعا ہوتی تھی پڑھ دیا کرتے تھے جس سے ان کا زخم کہن تازہ دجاتا تھا
اور اپنا درد دل کسی مصرعے میں ظاہر کرتے تھے۔ زبان سے نکالنے کا کم از کم اثر تھا کہ لے چھ گوش میں
بادشاہ ابھی ہوا دار سے اتر کر سلطان خانے میں داخل نہ ہوئے تھے کہ مہتاب الدولہ نے
یہ مصرعے پڑھے :

لے بادشاہ کا مطلب یہ تھا کہ اساتذہ فارسی ایسے دو لفظوں کو قافیہ نہیں کرتے جن میں سے
ایک میں حرفِ روی ہمارے تختی ہو اور دوسرے میں الف۔

نہ ہے اس طرح سنگ آسے چرخ گردش میں نہ ہے یوں غرابہ سداے چرخ گردش میں
 دیوں تیج دست پارے چرخ گردش میں رہے گا تخم اختر تا کجاے چرخ گردش میں
 ان مصرعوں کو بہت پسند کیا۔ فرمایا کہ قافیے بدل بدل کر اور مصرعے لگا دو اور میرے مصرعے
 کو مصرعے ترجیع قرار دو۔ پھر جو ملاقات حضوری حاصل ہوئی تو ہتاب الدولہ نے ایک ختمہ پڑھا
 جس میں بہت سے بندھے۔ ہر بند میں چوتھا مصرعہ ختمے کا گروہ کا مصرع تھا جسے بھی ملا اور
 ختمہ مطبع سلطانی میں چھاپا گیا۔

ایک صحبت میں میں بھی موجود تھا اور تمام شعرا وندماے شاہی کا مجمع تھا۔ اعادہ ملک
 کی دعائیں لوگ لے رہے تھے کہ حضرت نے دست دعا بلند کیے اور یہ مصرع پڑھا
 باز آتقصیر سے بس گوش مالی ہو چکی، شگفتہ ایک شاعر حاد علی مرزا کو کتب دلی عہد بہادر کے
 مصاحبوں میں تھے۔ انھوں نے عرض کیا کہ خانہ زاد نے مصرع لگایا ہے حکم ہوا کہ پڑھو۔
 شان توتی الملک دکھلا دیکھی شان تنوع

باز آتقصیر سے بس گوش مالی ہو چکی

اس صحبت میں بادشاہ نے کچھ اپنا کلام بھی سنایا تھا۔ دو شعر مجھے یاد رہ گئے۔ ایک مطلع
 ایک حسرت طور پر بھی ہر سوارہ گئی ایسا کچھ دیکھا کہ آنکھوں کو تارہ گئی
 اور ایک غزل کا یہ شعر

جوانی میں یہ موتھے سفیدی ہے یہ دندان کی

ضعیفی ہنس رہی ہے مجھ سے، کیوں اندوہ گیس ہونا

یہ شعر پڑھ کر ہتاب الدولہ سے مخاطب ہوئے کہ معنی بیان کرو۔ انھوں نے عرض کیا کہ بالوں
 کی سفیدی نہیں ہے بلکہ ضعیفی کا خندہ دندان نام ہے۔ فرمایا یہ تو خندہ دندان نما کر رہی ہے۔

لے قرآن مجید کی اس آیت کی طرف اشارہ ہے توتی الملک من تشاء وتنزى الملک
 جمعت تشاء تو جے چاہے حکومت دے دے اور جس سے چاہے حکومت چھین لے۔

مگر میں سمجھ رہا ہوں کہ مجھ سے ہنس رہی ہے۔ اب اندہہ گیس ہونے کی کوئی وجہ نہیں اس
 نکتے کے ارشاد فرمانے پر ہتاب الدولہ فوراً اٹھے اور آداب بجالائے۔ گویا حضور نے ان کی
 شرح پر اصلاح دی اور انھوں نے اصلاح کا سلام کیا۔

مرزا مسیتا عیش۔ ناسخ والوں میں ہیں۔ معیار وحدائق البلاغہ ہمیشہ پڑھتے پڑھاتے
 رہتے تھے۔ نازک خیالی کے مدعی اور بنوٹ کے استاد ہیں۔ آخر میں غزل کہنا چھوڑ کر
 منقبت میں شعر کہا کرتے تھے۔

سر کے بھل چلنا ہے لازم شاہ راہ طوس میں
 گو کھر د کوسوں بچھا ہے تارچ کیکا دوس کا
 گو کھر د کے لفظ میں جوا بہام ہے اس پر وہ ناز کرتے تھے۔ سلام کے اس مطلع میں جو بنوٹ
 ہے ملاحظہ ہو:

سلامی حال عاید جس جگہ میں نے لکھا دیکھا مرے پائے نگہ نے بن کے چشم آبلہ دیکھا
 میں نے کہا یہاں چشم آبلہ کو قافیہ کرنا غلط ہے۔
 آغا جوش شرقیہ۔ آتش کے شاگرد تھے۔ عالی خاندان شخص تھے۔ نہ لکھتے نہ پڑھتے، مگر بہت
 اچھے شاعر تھے۔ ان کا دیوان چھپ گیا ہے۔ اس مطلع کو سینے اور اس کی زبان دیکھیے
 جھٹ پٹا دقت ہے بہتا ہوا دیا ٹھہرا۔ صبح سے شام ہوئی دل نہ ہمارا ٹھہرا
 ان کے کلام میں ذرا بھی تکلف اور تصنع نہیں ہوتا۔

منزل عش کا حال آپ میں لوں تو کہوں دم ذرا لینے دو میں لں کو سنبھالوں تو کہوں
 کون ہے جس سے فناء کہوں لے دل تیرا سننے والا کوئی پہلی میں بٹھالوں تو کہوں
 ان کے کلام کی خصوصیت یہ ہے کہ دیر دہشت کردہ و صنم و برہمن و ناقوس و تشقہ و زنا و رذیلہ
 مصطفیٰ و زائد و مؤذن و واعظ و شیخ و خائفہ و دے خانہ و شیشہ و ساغر و ساقی و پیر و مغان

لے آغا جوش عرف تھا 'نام سیادت حسن جلال الدین حیدر خاں تھا۔

جام و صراحی دینا کا ذکر کہیں نہیں آنے پاتا۔ کہتے تھے جس شعر میں ایسے الفاظ ملتے ہیں، مجھے اس شعر سے نفرت ہوتی ہے۔ مرزا داغ جن دونوں کلکتے آئے ہوئے تھے مجھ سے بیان کیا کہ ایک محفل رقص و نشاط میں میری دعوت تھی۔ وہاں مغنی نے شرف کی غزل گائی، منزل عشق کا حال آپ میں آلوں تو کہوں۔ مجھے زمین اچھی معلوم ہوئی۔ میں نے بھی غزل گائی ہی پھر غزل نکال کر مجھے سنائی... انصاف یہ ہے کہ شرف کی غزل کا جواب نہ ہو سکا۔

شراب کا مضمون فارسی دارو کی شاعری میں معرکہ شعرا ہے۔ خواہ کوئی شراب پیے یا نہ پیے، ان مضامین کا کہنا ضرور ہے۔ لیکن انصاف یہ ہے کہ ایسے مضامین کہنا ضرور ہی کیا ہے۔ آغا، جو شرف مرحوم نے شراب، ساقی، پیرمیاں، مے خانہ، واعظ زائد، سب، زنا، مسجد، بت خانہ وغیرہ کا ذکر غزل سے ترک کر دیا تھا۔ کہتے تھے کہ آخر اس کے معنی کیا کہ شراب سے نفرت، واعظ سے عقیدت اور پھر اس کی تعریف کریں اور اس کی مذمت۔ اس قسم کے شعر سراسر غیر واقعی ہوا کرتے ہیں۔ مجھے اس سے کچھ نہیں ملتا۔ مرزا امداد علی یا در۔ تھے تو برق کے شاگرد مگر استاد کے رنگ سے الگ۔ کلام بہت شوخ اور بلا تصنع ہوتا تھا۔ بہت کم کہتے تھے اور مشاعرہ میں کم شریک ہوتے تھے مرزا داغ جن دونوں کلکتے آئے ہیں اور اس تقریب میں مشاعرے ہو رہے ہیں، ایک شاعرے میں یاد رہی آگئے۔ ان کے سامنے جب کھول آیا تو اپنی مشہور غزل کے شعر پڑھنے لگے۔

درد ساقی کہ مجھے لغزش متانہ ہے پاؤں تلو میں نہیں ہاتھ میں پیانا ہے

آج تک ناگنا اناجی کے گٹے میں بھٹنے سر اٹھائے ہوئے مضور کا افانہ ہے

ابھی دو ہی شعر پڑھے تھے کہ شاعرہ ٹھہری میں آگیا۔ داغ نے پکار کر کہا حضرت طرح میں کچھ کہا ہو تو پڑھیے۔ طرح تو انھوں نے کہی تھی، خاموش ہو گئے۔ ان کے دو شعر اور یاد آئے۔

لے کئی تذکرہ نویسوں نے یاد کرو مولوی محمد بخش شہید شاگرد ناسخ کا شاگرد لکھا ہے۔

رہ گئی بات کٹ گئی شب ہجر تم نہ آئے تو کیا سحر نہ ہوئی
 آنکھوں آنکھوں میں یوں وہ لے گئے دل کاؤں کان ایک کو خبر نہ ہوئی
 مرزا داغ مرحوم باد کو ذکر کرتے تھے کہ میں جب رام پور سے چلا تو لکھنؤ اور عظیم آباد وغیرہ
 میں بھرتا ہوا اور شاعروں میں حسب کہ شریک ہوتا ہوا کلکتے پہنچا۔ جو مرزہ مجھے مٹیا برج
 کے مشاعروں میں آیا وہ لطف لکھنؤ میں بھی نہ پایا۔

منظر علی ہنسر۔ بڑے بذلہ سنج اور خوش طبع شخص تھے۔ مرزا دلی عہد اور خاص محل اور
 محبوب محل کے استاد تھے۔ ایک مشاعرے میں ایک طرح ہوئی اشر پیدا ہوا، شریدا ہوا،
 دوسری طرح ہوئی، جفا ہونے کوئے، ادا ہونے کوئے، کسی نے ہنسر سے پوچھا کہ اب کی
 دہاں کی طرح کیا ہوئی۔ کہنے لگے، اک سیر پیدا ہوا، دوسرا ہونے کوئے، کلام ان کا
 بہت صاف اور بلا نقص ہوتا تھا۔ بڑے پر گوشا تھے۔

رائگاں ہو گا نہ ہرگز خاکاروں کا غبار
 کچھ زمیں لے جائے گی کچھ آسماں لے جائے گا

نساخ نے میر انیس در مرزا دبیر کے کلام پر اعتراضات شایع کیے منشی مظفر علی
 ہنسر شعراے سبعہ میں سے تھے اور مرثیے بھی کہتے تھے۔ مرزا اصحاب کے پرانے شاگردوں میں
 تھے۔ انھوں نے نساخ کی رد میں ایک کتاب لکھی۔ صولت نے اس کی تاریخ میں مادہ
 بہت بے تکلف نکالا، کامل کو جو ناقص کہے خود ہو گا وہ ناقص، منشی ہنسر نے وہ ساری
 کتاب ادل سے آخر تک مجھے بھی سنانی تھی۔ بہت ہی دندان شکن جواب تھے۔ افسوس کہ چھپی
 نہیں۔ اس کے تھوڑے دنوں بعد ان کے مکان میں آگ لگ گئی اور ساری محنت ان کی
 تلف ہو گئی۔

گلشن الدولہ مرزا علی بہار۔ ناسخ والوں میں کہنے مشق شاعر اور خوش فکر و خوش طبع سخن سنج
 تھے۔ غزل کی طرف توجہ کم تھی۔ مرثیہ کہنے میں مشاق تھے۔ کہتے بھی خوب تھے، پڑھتے بھی اچھا
 تھے۔ ان کے سلام کا یہ مطلع مجھے پسند ہے۔

باغ میں طرح کی بیتیں جو مرزا دیتی ہیں
ڈالیاں بھوم کے پھولوں کو گرا دیتی ہیں

ان کے مرثیوں کا، سلاموں کا، غزلوں کا سارا ذخیرہ تلف ہو گیا۔ ان کے شاگردوں میں
مانوس الدولہ بھی مرثیے کہتے تھے۔ مٹیابرج سے لکھنؤ جا کر مجلسیں پڑھتے تھے اور حسن سخن
کی داد لے کر آتے تھے۔

مالک الدولہ صولت۔ فتح الدولہ برق کے بھتیجے تھے۔... ناسخ کے دیوان کو ایمان سمجھتے
تھے۔ چوٹی کے شعر زبان پر تھے۔ عروض کے زحافات و علل کو ہمیشہ رٹا کرتے تھے۔ جو ان
مرگے اور مرتے ہوئے مشاعرہ کر کے مرے۔ دق میں مبتلا تھے، مگر صحبت احباب و محفل شعر
سخن میں اگر جان آجاتی تھی۔ آخری مشاعرے میں سبائے عروں کے بعد خود غزل پڑھی جس
کا ایک شعر یہ ہے :

ماتم میں میرے غم سے نہ کرنا تباہ حال تم شعبدے سمجھنا یہ لیل و نہار کے
اد پر کا مصرع تجھے اچھی طرح سے یاد نہیں ہے، مگر اس مصرعے نے تم شعبدے سمجھنا یہ
لیل و نہار کے، ایک شعر کا کام کیا اور پس پردہ کسی کے رونے کی آواز سنائی دی۔ لوگ اٹھ
کھڑے ہوئے، محفل برہم ہو گئی۔

مٹیابرج کے شعر امین ان کا دیوان مجھے ملا تھا۔ میں نے سارے دیوان کا انتخاب
کر کے رسالہ ادیب الہ آباد میں کئی قسطوں میں اپنے نقد و تبصرہ کے ساتھ شائع کر دیا تھا۔
ان کی ایک اچھی غزل کا مقطع یہ ہے :

یہ دل میں مانی ہے ہم نے منت وطن میں کس کو دکھائیں صورت

غیر شاہ اودھ کے صولت کبھی نہ اختر گنگو کو چلیے

بادشاہ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ لکھنؤ کا نام اختر گنگو بھی ہے اور اسی مناسبت سے
میں نے چاہا کہ اپنا تخلص اختر رکھوں مگر معلوم ہوا کہ اختر کسی کا تخلص ہے تو میں نے ان
سے تخلص مول لے لیا۔ جن سے بادشاہ نے تخلص مول لیا وہ قاضی محمد صادق خاں اختر ہیں۔

یہ بنگالے سے آکر لکھنؤ میں ایسا رہے کہ پورے لکھنؤی ہو گئے۔ یہیں تحصیل علم کی۔ یہیں فن شعر میں کمال پیدا کیا اور یہیں سے جاگیر دزد مال حاصل کیا۔ ان کا اہل زبان میں شمار ہے۔ لکھنؤ کی زبان ان کی اکتسابی نہ تھی بلکہ ان کے گھر کی زبان ہو گئی تھی۔ تعلق از دواج بھی انھوں نے اہل شہر میں کیا۔ میرے ایک عزیز مرحوم نواب یوسف حسین خاں ان کے نواسے اور ان کی جاگیر کے مالک تھے۔ اور یہ شخص سچا کچھ بادشاہ کی خاطر سے تھا در نہ انھوں نے کبھی اپنا تخلص نہیں بدلا۔ صیولت کی ایک غزل کے تین شعر یہ ہیں۔

خلات قاعدہ کیوں ہو خفا کہو تو ہسی قصور کوئی گنہ کچھ خطا کہو تو ہسی
ہمیں یہ سخت کلامی کی تاب لاتے ہیں کسی کو اور ہمارے سوا کہو تو ہسی
بیان کا دیش تیر مرثہ پہ وہ بولے کہاں کہاں ہونشان خم کا کہو تو ہسی
یہ زمین مخدرہ عظمیٰ نواب بادشاہ محل صاحبہ عالم کی نکالی ہوئی ہے۔

یہ حال عشق میں کس کے ہوا کہو تو ہسی! ہلا کیوں ہوئے لے مہ لقا کہو تو ہسی
نہ وہ مزاج نہ وہ چہچہ نہ وہ ہنسیاں اداس رہنے کا باعث ہو گیا کہو تو ہسی
عبث عبث نہ قسم کھاؤ کل کے آنے کی کیا ہے کون سا وعدہ وفا کہو تو ہسی
تھارا دل تو نہ عالم اسیر کیسو تھا یہ کس طرح سے ہوا مبتلا کہو تو ہسی
بیگم صاحبہ نے یہ غزل کہی اور خود اس کی دھن رکھی۔ گانوں کو حکم ہوا کہ یاد کریں۔ مجھے یاد ہے کہ اس غزل کا ایسا رنگ بندھا کہ اکثر لوگوں نے اس زمین میں طبع آزمائی کی۔ کسی نے ردیف میں تصرف کر کے سنو تو ہسی، کر دیا۔ 'سنیھا لوتیغ ادا کو ذرا سنو تو ہسی'۔

نواب مخدرہ عظمیٰ کی اس غزل پر نواب محبوب عالم صاحبہ نے مصرعے لگائے ہیں۔
یکایک آئی کہاں سے بلا کہو تو ہسی یہ کیوں اتر گیا منہ چاند سا کہو تو ہسی

لہ بادشاہ کی خاص محل۔ ان کی ایک مثنوی اور دیوان بیاض عشاق کئی مرتبہ چھپ چکا ہے۔
نوسیقی سے واقف تھیں۔ ان کے بنائے ہوئے گیت بادشاہ کی دو کتابوں ناجو اور دھن میں شامل ہیں۔

ہوئی ہے کاہشوں کی وجہ کیا کہو تو سہی یہ حال عشق میں کس کے ہوا کہو تو سہی

ہلال کیوں ہوئے لے مر لقا کہو تو سہی

ہیں یاد تم کو دغا بازیاں زمانے کی ہمیشہ سے یونہی عادت تھیں تمہیں کھانے کی

فقط یہ گھاسے پہلوئے ٹٹ کے جانے کی عبت عبت نہ قسم کھاؤ کل کے آنے کی

کیا ہے کون سا وعدہ دنا کہو تو سہی

ان دونوں بیگیوں کو منشی ہنر صاحب مشورہ تھا۔ دونوں صاحب دیوان ہیں۔ مگر محبوب محل کا دیوان شاید تلف ہو گیا۔

صوت کی ایک غزل کا مطلع ہے:

کہیں کلیں نہ یہ ابھی دل اگر پاؤں کے نیچے

کہ ہیں گیسو تمہارے سر کے اوپر پاؤں کے نیچے

یہ زمین بادشاہ کی طرح کی ہوئی ہے۔

ذیل کا مطلع بادشاہ سے منسوب کیا جاتا ہے:

زمانہ تھا پسا کرتے تھے گوہر پاؤں کے نیچے

پر اب ہے دھوپ سر پر اور نکھر پاؤں کے نیچے

اس زمین میں بادشاہ کی چھ شعر کی ایک غزل موجود ہے، مگر اس میں یہ مطلع نہیں ہے۔ (دیب) شاذ کا مطلع ہے:

بہار باغِ جنت ہو نہ کیوں کہ پاؤں کے نیچے

کہ رہتی ہے زمین کوئے دلبر پاؤں کے نیچے

شعراے سبعہ ستارہ اور تمام سخن سنجان دربار نے ٹوٹ ٹوٹ کر فکر کی تھی۔ میں شریک صحبت نہ تھا مگر غزلیں اکثر لوگوں کی سنیں۔ اگر وہ مشاعرہ چھپتا تو انتخاب میں اچھے اچھے

شعر آتے ۔

صوت کی ایک غزل کے چند شعر یہ ہیں :

خفا ہو چکے آدل جاؤ اب چلو بس جیس پر شکن پڑ چکی
سب شور کا گل نے پوچھا تو کب جب آواز مرغ چمن پڑ چکی
کبھی حکم اختر سے صوت غزل کہ شہ سے بنائے سخن پڑ چکی

ایسی کدھب زمیں بادشاہ ہی نکالا کرتے تھے۔ مگر مالک الدولہ نے اچھے شعر نکال لیے۔
بادشاہ کی طبیعت تصنع کو بہت پسند کرتی تھی۔ یعنی برق و سحر و خواجہ و وزیر
جس رنگ میں ڈوبے ہوئے تھے وہی رنگ بادشاہ کو پسند تھا۔ ان لوگوں کا شمار زبان
اردو کے اساتذہ میں تھا۔ میر انیس سے شاعر معجز بیان نے بحر کے ایک شعر پر مصرعے
لگائے اور سر منبر پڑھے۔

یہ رنگ غیر طبعی ہونے کے سبب کبھی عام پسند نہیں ہوا۔ لکھنؤ میں ہمیشہ آتش
و انیس و نسیم کے جرگے والے اس کا مضحکہ لگیا کرتے تھے۔ رشک کے اکثر اشعار
نقل محفل تھے۔

نواب انجم الدولہ بہادر مصلح السلطان پشتاپشت کے امیر تھے۔ دربار اردو
میں ان کا مرتبہ وزارت کے قریب قریب تھا۔ صورت پر امارت پرستی تھی۔ شاعر تو نہ تھے
مگر فارسی و اردو کے صدف شعر و بیانی کے یاد تھے کہ جس صحبت میں شعر پڑھنا شروع کرتے
تھے لوگ محو ہو جاتے تھے۔ پوشاک کی نفاست اور عطر کا شوق ان کے مزاج سے مخصوص
تھا۔ ۱۲۹۰ ہجری میں انتقال کیا۔ صوت نے قطعہ تاریخ کہا۔

انجم الدولہ مصلح السلطان پیش بگرفت راہ از ہستی
گفت صوت پنے سن رحلت بہ عدم رفت آہ از ہستی ۱۲۹۰ ہجری
نواب سید امیر علی خاں کو بادشاہ نے وزیر السلطان خطاب دیا۔ صوت نے
تاریخ بھی ۔

اے بر در تو شکوہ و حشمت نازد
بر خیز کہ بر تو نشان و شوکت نازد؟
صوکت نازد بہ مصرع سال خطا
حق این کہ بجاہ تو وزارت نازد
صوکت نے بادشاہ کے غسلِ صحت کی تاریخ بھی جس کے منتخب اشعار یہ ہیں۔
فلک جاہ و اجد علی شاہ اختر
رہیں تا قیامت صحیح و سلامت
حروف صحیحہ میں تا یخ نکلی
سپرِ عد و علت و حن علت
زحافات کو اس سبب نہ لایا
کہ ہو وزن سالم دلیل سلامت
لکھ لے خامہ فکر صوکت یہ مصرع

مبارک ہو سلطان کو یہ جتنِ صحت ۱۲۹۲ ہجری

حامد الدولہ برتر۔ جلیس الدولہ میرزایان شیراز میں سے تھے۔ عہد سلطنت میں اگر
بادشاہ کے ملازم ہوئے اور مرتے دم تک ان کی رفاقت میں رہے۔ ان کے فرزند اکبر
حامد الدولہ برتر کو ان کی خدمت عنایت ہوئی۔ وہ فارسی اور اردو دونوں میں اہل زبان
تھے اور دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ کلکتے سے مٹیاء برج جہاز میں آ رہے تھے۔ کناں
کے قریب پہنچ کر ایک دوسرے جہاز سے ٹک ہوئی غریب رحمت ہو گئے۔
صادق علی مالک۔ بادشاہی مرزہ کے نواسے خواجہ آتش کے بڑے پیروں میں
تھے۔ آتش کے دیوان کو اس طرح دیکھا کرتے تھے جیسے کوئی سبق لیتا ہے۔ اس کے ایک
ایک لفظ ایک ایک محاورے کو دہی آسانی سمجھتے تھے۔ کوئی مرید ہو تو ایسا ہو۔ بادشاہ کے
پاس انھوں نے اپنی غزلِ اصلاح کے لیے بھیجی۔ بادشاہ نے ایک آدھ لفظ بنا دیا اور کئی
شعر ان کی ستائش میں لکھ کر غزل کو واپس کر دیا۔ مالک نے مجھے بھی یہ بادشاہ کی اصلاحی
غزل دکھائی تھی۔ ان کا مصرع تھا 'بھگڑا چکا چکے کہیں قاتل لگا کے ہاتھ' بادشاہ
کی اصلاح یہ تھی 'بھگڑا چکا چکے کہیں قاتل لگا کے ہاتھ'۔

ان کی مدح میں جو شعر بادشاہ نے لکھ دیے تھے ان میں کا پہلا شعر مجھے یاد ہے۔
اے مشاعر نو سخن خدا را انداز سخن نے تیسے مارا

میں نے سنا کہ بادشاہ نے مائل کے ایک مطلع کو بہت پسند کیا، کئی دفعہ پڑھوایا۔ مطلع یہ ہے:
 تصور تھا جو رونے میں گلوئے یا ر مہ رد کا
 صراحی دار موتی بن گیا ہر قطرہ آنسو کا
 یہ تین شعر مائل کے اور مجھے یاد آگئے ہیں:

طریق گریہ تجھے چشم تر نہیں آتا کہ ساتھ ان کے خون جگر نہیں آتا
 خدا دکھائے نہ تاریکی شبِ فرقت کہ آسمان در میں کچھ نظر نہیں آتا
 نہ جانے کس کا یہ تیر نظر تھا آفت کا کہ الیام پہ زخم جگر نہیں آتا
 لکھنؤ میں ایک بڑا مشاعرہ ہوا تھا۔ مائل اس میں شریک تھے۔ ایک شعر ان کا حیدر آباد
 تک پہنچا۔

موتی کی آنکھ اور ہے میری نگاہ اور وہ جلوہ گاہ یا در میں بیکار ہے ہیں
 بادشاہ کے مرنے کے بعد ایک مائل تھے جو لکھنؤ میں زندہ پہنچے۔ ایک میں ہوں جو حیدر آباد
 چلا گیا اور ابھی تک زندہ ہوں۔

مرزا جہاں قدر نیر۔ بادشاہ کے داماد اور بھتیجے، جنہیں بادشاہ نے خود پرورش کیا،
 مرزا اسکر در حشمت کے فرزند کبھی کبھی مشاعرہ بھی کرتے تھے اپنا کلام مجھی کو دکھاتے تھے۔
 آغا جوتو شرف کا یہ شعر ان کو بہت پسند تھا۔

چمن میں جا کے جو دل کی تلاش کی میں نے

پھندا ہوا اسے اک ٹوک خار میں دیکھا

مرزا جہاں قدر بہادر کو مرثیہ کہنے کا بہت شوق تھا۔ شاہی راجہ باڑے میں نہایت اہتمام
 سے مجلسیں کرتے تھے اور خود منبر پر مرثیہ پڑھتے تھے۔ ان کے انتقال کے دس بارہ برس بعد
 کا ذکر ہے کہ پرنس مرزا میتم نے مجھے لکھا کہ حضور مرحوم کا کچھ کلام میں نے فراہم کیا ہے۔ آپ
 اپنی تصحیح سے اُسے حیدر آباد میں چھپوا دیجیے۔ چار مرتبے، چند سلام، نو حے، غزلیں، معلقہ
 کے دو قصیدوں کا اردو ترجمہ، میں نے یہاں مطبع شمسی میں چھپوا کر پان سو نسخے کلکتے

ردانہ کر دیے۔
مرزا آسمان جاہ انجم۔ یہ شہزادے عہد سلطنت میں پیدا ہوئے تھے۔ بادشاہ کے ساتھ
مٹیا بروج میں آئے، یہیں ہوش سنبھالا۔ طبیعت میں انتہائی موزونیت، زبان و محاورہ
گھٹی میں پڑا ہوا تھا۔ کلام اپنا بچھے دکھاتے تھے۔ میرے حیدر آباد آنے کے بعد دفترِ حشر
اپنا دیوان چھپوایا۔ اسی زمانے میں انتقال کیا۔

حامد علی مرزا کو کب دلی عہدِ اودھ۔ مظفر علی بہتر کے شاگرد تھے۔ دو دیوان ان کے
۱۲۹۰ ہجری کے بیشتر چھپ چکے تھے اور ہم سب لوگوں کو تقسیم ہوئے تھے ۹

شاہ زادہ فریدون قدر مرزا محمد بہر علی بہادر تخلص بہ ہزبر ۱۲۶۱ ہجری
میں پیدا ہوئے۔ بادشاہ کے ساتھ مٹیا بروج گئے۔ ۱۲۹۱ ہجری میں لی عہد
کے انتقال کے بعد بادشاہ کے فرزند اکبر قرار پائے۔ ۱۲۹۵ ہجری میں بادشاہ
کے ماہوار وظیفے ایک لاکھ روپے میں سے اپنے حصے کے پانچ ہزار سالانہ لگ
کر دالیے۔ یہ حرکت بادشاہ کو بہت ناگوار گزری۔ ان کے دیوان کا تاریخی نام
جودتِ عشق ہے۔ وہ ۱۲۸۳ ہجری میں مرتب ہوا اور ۱۲۹۴ ہجری
میں شیعہ نظامی کانپور میں چھپا۔ ادیب

ایک دفعہ ان شعرا میں سے جو لوگ مشاق اور اساتذہ تھے انھوں نے آپس میں اتفاق کیا کہ
عہد رسالت کے واقعات و غزوات کو سب مل کر اور دو میں شاہ نانے کے وزن پر نظم کریں۔
درخشاں نے عقد امیر المومنین و جناب سیدہ کو نظم کیا اور حشر کے جلسے میں پڑھا۔ مائل نے
فتح مکہ کے واقعہ کو نظم کر کے ایک محفل میں پڑھا۔ ان دونوں مثنویوں کو میں نے بھی سنا تھا۔
بہت خوبی سے نظم ہوئی تھیں۔ ہزبر ادب میں اور بہار نے بھی اس قسم کی مثنویاں لکھی تھیں

دلی عہد کو کب قدر مرزا محمد حامد علی کا دیوان شہبازِ عشق ۱۲۸۳ھ میں مرتب ہوا
۱۲۸۸ھ میں لکھے میں چھپا۔

ادبشن میں پڑھی گئی تھیں۔ یہ سب مثنویاں جمع ہو کر ترتیب واقعات کے ساتھ چھپ جاتیں تو اردو میں ایک نادر کتاب ہوتی۔ مٹیا برج جب تباہ ہوا تو ایک سال کے اندر اندر یہ سب لوگ مر گئے اور سارا کلام ان کا تلف ہو گیا۔ ان مثنویوں کا بھی پتا نہیں۔

مجھے ایک عرصے کے بعد شاہ زادہ مرزا محمد مقیم بہادر کے حسب طلب کلکتے خانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں ایک ایک سے پوچھا کہ عیش و بہار و ہنر و درخشاں وغیرہ کے دیوان کبھی کے پاس ہیں۔ ایک مصرع بھی نہ ملا۔ مستورات میں سے ایک صاحبہ کے پاس درخشاں کے چند شعر نکلے۔ دیکھا تو سب الف کی ردیف میں ہیں اور یہ معلوم ہوا کہ کسی نے فقط اپنی پسند کے شعر لکھ لیے ہیں۔ پوری غول کوئی نہیں ہے۔

تذکرہ شعرا بادشاہ کے قلم سے

بادشاہ نے اپنی کتاب بنی میں مشاعرے کی جو نقل لکھی ہے، اس میں اپنے اور چند باری شاعروں کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ یہاں اسی طرح بے ترتیب نقل کیا جاتا ہے۔

۱۔ "ہلال۔ یہ شخص نام زندگی راقم کے ملازموں میں رہا۔ فقیر کے عہد شاہی میں چھاپہ خانہ متعلق رہا۔ جب فقیر بعد از انتراع سلطنت دارد کلکتہ ہوا بہ اغوائے مغویان کوہ اندیش دہ برس دو مہینے تک قلعہ دہم فورڈ کلکتہ میں محبوس رہا۔ بعد ہوائی شخص تا انتقال میرا ملازم رہا۔"

۲۔ تدبیر الدولہ منشی مظفر علی خاں بہادر جنگ استیر۔ یہ شخص دس پندرہ برس کے سن میں راقم کا ہم پالہ اور ہم نوالہ رہا اور صحبت مشاعرہ کوئی ایسی نہ ہوتی تھی جس میں اس کے اور میرے ہمراہی نہ ہو۔

بلکہ یہ خطاب فقیر ہی کا عنایت کیا ہوا ہے۔ دمِ محبت بھرتا تھا اور خود کو عاشقوں میں گنتا تھا۔ اباً عن جد اس کے نمک خوار مسکے باپ دادا کے رہے۔ میرے عہد دلی عہد میں عاشق اور میر نے ان سلطنت میں مصاحب اور داروغہ کل زندان خانہ سرکار اودھ کا اور خلاصہ نویس تمام کچھ ریاتِ سلطانی کار کیا۔ اور یہاں تک مسکے مزاج میں خیل تھا کہ شبانہ روز حاضر خدمت رہتا تھا پینٹھ برس کے سن میں عقد کیا زوجہ سے نہایت مانوس رہا کرتا تھا۔ جب ادضاعِ فلکی سبّال ہوئے یعنی امرِ انتزاعِ سلطنت واقع ہوا میں مایوسِ جانبِ کلکتہ چلا۔ یہ ازبکے زوجہ کا مبتلا بہت تھا حقِ نمک مالکِ یکتا لم فراموش کر کے گھر میں جا چھپا۔ میں کلکتہ میں داخل ہوا۔ میں برس سے مجھ سے اس سے فراق ہے۔ طرفہ تریہ کہ اب دلی رام پور کو اپنا بادشاہ بنا کر یہ سید بنی فاطمہ ملکی ان کا نمک کھاتا ہے۔ فاعتر ویا اولی الالبصار۔ یہ مطلع اسی شخصِ نمک فراموش کلا ہے۔“

دل گنہ کرنے میں خیر ہو گیا

جو صغیرہ تھا کبیرہ ہو گیا “

۳۔ ”فتح الدولہ بخشی الملک مرزا محمد رضا برق استاد مرحوم و اقام ابن مرزا کاظم علی صلح جنہوں نے تادمِ مرگ گھر سے قدم باہر نہیں نکالا بخشی مذکور مسکے والد کے عہدِ سلطنت میں تمام فوج کے بخشی رہے اور میرے عہد میں استاد عاشق رہے اور بعدِ انتزاعِ سلطنت ہمراہ آئے اور زندانِ قلعہ ولیم فورڈ کلکتہ میں بھی میرے ساتھ قید ہوئے اور اسی زندان میں جاں بحق ہوئے اور وقتِ دم واپس یہ بیت اور یہ مطلع پڑھ کر وائے فردوس ہوئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔“

مطلع
برق جو کرنا تھا آخر وہی کر کے اٹھے
جان دی آپ کے دانے یہ مگر اٹھے

سائنس لینے میں ہر اک جاسے تنک جاتا ہے تن
بیت برق بدلو جامہ ہستی پرانا ہو گیا (بنی-۲۳۸-۲۳۹)
۴۔ ”کیتان مقبول الدلدہ مرزا محمد مہدی قبول۔ ہم مشورہ راقم اٹھاؤ
انیں برس کامیرا سن تھا جو میرا ان کا ساتھ ہوا۔ میرے ملازم رہے۔
میرے والد کے بھی ملازم تھے۔ میرے عہد میں خدمت چوکی پلنگ خاص د
ومصاحبت اور چھاپہ خانہ اور کتب خانہ اور کونسل رائن کا توپ خانہ۔ یہ سب ان
کے پانچ نام رہا۔ اور بعد انتراع سلطنت اودھ جب راقم قلعہ دلیم فورٹ کلکتہ
میں مقید تھا یہ حاضر کلکتہ ہوئے اور جب راقم نے رہائی پائی یہ میرے پاس
موجود تھے جسرت زیارات عتبات عالیات میں انتقال کیا“
۵۔ ”اختر شاہ اودھ۔ یہ فقیر حقیر راقم و صنف و مولف سراپا تقصیر ہے۔
پندرہ برس کے سن میں والدت مکان نے ولی عہد اور وزیر کیا۔ میں
برس کے سن میں تخت اودھ پر بجائے حضرت اعلیٰ قائم ہوا۔ تیس برس
کے سن میں بلا صدد و ظلم و نا انصافی دے آزار و عیت بے سبب تخت سے محروم
کیا گیا۔ میں برس سے کلکتہ محلہ موچہ کھولہ لقب بہنیا برج میں قیام ہے۔
پچاس برس کا سن ہوا چھپیس جیسے قلعہ دلیم فورٹ کلکتہ میں ناحق قید رہا۔
ساتھ سے اوپر اوپر ماشاء اللہ چشم بد دور اولاد کو دانات ہیں۔
پچاس برس کے سن میں اتنی جلدی کتابوں کی تصنیف کیں“

لے ”شاذ۔ داخل سبع سارہ“

لے ان کتابوں کی فہرست اور درج کی جا چکی ہے۔

- ۶۔ ” صدر محل صدر جو شمول محلات ہمراہ راقم ہیں بشورہ گلشن الدلہ مرزا علی بہار“
- ۷۔ ” ملکہ محضرہ عظمیٰ عالم آرا بیگم عالم منکوچہ کلات سلطان عالم والدہ ولی عہد حجت نشین“
- ۸۔ ” کوکت ولی عہد حجت نشین فرزند راقم منکوچہ مرقومہ بالا کے بطن سے جو سن بارہ سو اکانیس میں فوت ہو کر بسطین آباد امام باڑہ تعمیر کردہ راقم میں دفن ہوا“
- ۹۔ ” مشیر۔ یہ راقم کا بھی شاگرد ہوا اور سن بارہ سو نوے میں ملازم ہوا اور رحلت کی“
- ۱۰۔ ” ماہتاب الدلہ درخشاں تیس برس سے تا ایندم میرا ملازم ہے... اکتی مرد خوش گویا“
- ۱۱۔ ” تعیش الدلہ علیش۔ سات شخص ایک مرتبہ ہیکے شاگرد ہوئے۔ راقم کا ”بسع ستارہ“ لقب ہوا۔ ان میں سے ایک یہ بھی ہے۔ استعداد بہت اچھا۔ عرضی لا جواب۔ میرا ملازم بھی ہے“
- ۱۲۔ ” لائق الدلہ محمد جان شاہد۔ یہ بھی میرا شاگرد تیس برس کا ملازم ہے۔ موزون لطیف ہے۔ کلام اس کا میرے پاس موجود نہ تھا۔ اس سے قلم انداز ہوا“
- ۱۳۔ ” ہنتر۔ داخل ”بسع ستارہ“ کتب خانے کے داروغہ کی نالائقی کی جہت سے کلام اس کا دقت کتابت دستیاب نہ ہوا۔ مگر شاعر خوش گو میرا شاگرد و ملازم ہے“
- ۱۴۔ ” شاذ۔ داخل ”بسع ستارہ“

بادشاہ کے چند منتخب اشعار

اندھیرا بزم میں تھا تو جو انجمن میں نہ تھا
 بادۂ گل رنگ دیتا ہے مرا سر و مجھے
 ایک حسرت طور پر بھی بہرِ موسا رہ گئی
 غنچہ دل کھلے جو چاہو تم
 تری یاد کا دل میں وہ جوش ہے
 سوز دل جب گزرا کرتا ہے
 عشق سے کچھ کام نہ کچھ کوئے جاناں سے غرض
 عالمِ رحمت میں عریانی کا جامہ چاہیے
 دعبے پشب کو آیا دبیز حیان لگا ہے اور حیں
 غنچہ کھلتے ہیں اے گل خنداں
 کون سے ساتی کی چشم مست کا دھیان آگیا
 گم براے سیر آئیں گے کبھی گلزار میں
 نہ جلا خانہ صیتا نہ گل مر جھائے
 لالہ ردیوں کا ہے دیوانہ عبت لے دل زار
 تم ہر بان تھے تو سبھی ہر بان تھے
 دستِ صراحت ہے جو شخص کھلے زر کو عزیز
 ایک دن زلفِ تری دیکھی تھی پری
 داغوں کے گل کھلائے ہیں اختر ہزار ہا
 نہ تم سا ہنسنے والا ہے نہ ہم سا رونے والا ہے

جہن ادا اس تھا لے گل جو تو جہن میں نہ تھا
 اب انا الساتی کی آتی ہے صد اہر سوجھے
 ایسا کچھ دیکھا کہ آنکھوں کو متاثر رہ گئی
 گلشنِ دہر میں صبا ہو تم
 غم دین و دنیا فراموش ہے
 برق کو بے قرار کرتا ہے
 گل سے مطلب ہے نہ کچھ خارِ بیا باں سے غرض
 کام ہاتھوں کو گویاں سے نہ داماں سے غرض
 مہر لے دل میں ہے طالعِ نور دضیا ہے اور کہیں
 باغ میں تیرے مسکرانے سے
 بزمے میں ہو گئے بیزار جامِ حم سے ہم
 دیکھ لینا غنچہ دگل کو ہنساتے جا میں گے
 اب نہ کچھ ہو گا ان آہوں کا اثر دیکھ لیا
 کون سے گل سے تجھے بوئے دفا آتی ہے
 تم کیا خفا ہوئے کہ زمانہ خفا ہوا
 ہاتھ کی طرح سے دیکھا دل زردار سیاہ
 تب سے آتے ہیں نظر خواب پریشاں کیا کیا
 قابل ہے سیرِ حسن کے یہ لالہ زارِ دل
 ہمیں تم باغِ عالم میں تو نہیں جان گل و شبنم

زندہ گیو میں بیا ہے، نہ رخ میں وہ نور
 زرے جو چمکا کرتے ہیں تیر شید کی طرح
 ناتوس برہمن سے صد اے اداں سنی
 پھول کھلتے ہیں مگر بوے وقا دیتے نہیں
 کس سے ہم جھگڑیں نہیں اپنا کسی ملے سے میل
 رنگ کیا کیا نہیں اس شام دسحر کے بدلے
 صد ہا ہوئے ہیں صاحب حسن و جمال خاک
 مسجد سے میں نے قصد کیا سو منات کا
 جن کو گل سمجھے تھے گلشن میں ہی سب خاریں
 عشق کے بندے کو کیا گبر و سماں سے غرض

بادشاہ کی کتابوں کا سرسری جائزہ

واجد علی شاہ کی تصنیفات و تالیفات کی تعداد اور منظومات کی مقدار اتنی زیادہ ہے کہ ان کا تفصیلی جائزہ ایک ضخیم دفتر میں سہاے گا۔ یہاں بادشاہ کی بیشتر کتابوں کا مختصر جائزہ پیش کیا جا رہا ہے۔ جہاں کہیں کوئی خاص دلچسپی کی چیز نظر آئے گی وہ لکھ دی جائے گی۔ اس سے ہر کتاب کے بارے میں ضروری معلومات حاصل ہو جائے گی اور اس کی نوعیت کا بہت کچھ اندازہ ہو جائے گا۔

دستور واجدی (فارسی) یہ نہایت اہم کتاب جس کو واجد علی شاہ کا آئین حکومت سمجھنا چاہیے، میری نظر سے نہیں گزری۔ لیکن اس کی نوعیت، مطالب اور سبب تالیف پوری تفصیل کے ساتھ کتاب وزیر نامہ میں درج ہے۔ مصنف وزیر نامہ کا بیان ہے کہ بادشاہ انتظام سلطنت میں ہمہ تن مصروف تھے۔ اسی اثنا میں تخییر قلبی و دماغی کا مرض لاحق ہو گیا اور سلطنت کا کاروبار کسی معتد خاص کو تفویض کرنا واجب ہو گیا۔ لہذا ”وزیر باوقیر خود را کہ بشرف نسبت مصاہرت معزز و مفتخر بود۔ بہت اس کا اختیار کر دو۔۔ احکام و قوانین انتظامی را کہ وقتاً فوقتاً تجویز و نافذ فرمودہ بود بطور دستور العلے برائے کاروائی ہائے سلطنت بہ یک جا ترتیب فرمودہ بہ دستور واجدی موسوم نمودہ بہ دے سپردنا۔۔ یہاں دستورات۔۔ کا رہند شدہ باشد۔“

ترجمہ: اپنے وزیر باوقیر کو جو بادشاہ کے خسر ہونے کا شرف بھی رکھتے تھے، اس کام کے لیے

منتخب کیا اور جو انتظامی احکام و قوانین وقتاً فوقتاً تجویز اور نافذ فرمائے تھے، ان کو کجا مرتب کر کے اور دستور واجدی نام رکھ کے ان کے سپرد کیا تاکہ انھیں دستورات پر کاربند رہیں۔

بادشاہ نے وزیر کو حکم دیا کہ ان احکام و قوانین سے ذرا سا بھی اختلاف داخل نہ کریں۔ اکثر اوقات اپنے علم و اطلاع کے موافق وزیر کو زبانی ہدایت بھی کرتے رہے۔ دستور واجدی میں چھیا سٹھ دستور ہیں، جن کی تفصیلی، فہرست مضامین و ذریعہ نامہ میں درج کر دی گئی ہے۔ اس کے علاوہ نو نے کے طور پر گیارہ دستور لفظ بلفظ نقل کیے گئے ہیں۔ فہرست مضامین کا اردو ترجمہ پیش نظر کتاب کے ضمیمہ الف میں دیکھیے۔

جواب آؤدھ بلو بک (اردو) مطبوعہ۔ صفحات ۱۳۲۔ مطبع کا نام اور طباعت کی تاریخ درج نہیں ہے۔

کرنل سلیم نے آؤدھ بلو بک (oude blue book) نام کی کتاب میں سلطنت آؤدھ کی خرابی اور بد انتظامی کا بیان تفصیل سے لکھا تھا۔ یہ اسی کا مفصل اور مدلل جواب ہے۔ اصل کتاب اسی زبان میں لکھی گئی تھی۔ اس لیے کہ دربار آؤدھ اور سرکار کمپنی کے درمیان مراسلت کی زبان فارسی تھی۔ اس فارسی کتاب کا ایک لمبی نسخہ جو ”سٹیابرج لشکر واجد علی شاہ“ میں ۸ رجب ۱۲۴۸ھ کو لکھا گیا تھا، پٹنہ یونیورسٹی کے سابق پروفیسر ڈاکٹر عظیم الدین احمد مرحوم کے پاس تھا اور ان کی عنایت سے ۱۹۴۰ء میں اس کو دیکھ کر میں نے ایک تفصیلی یادداشت لکھ لی تھی۔ کتاب کی ابتدا میں یہ عبارت ہے :-

”ایں رسالہ ایست مبنی برا جو بہ مقولات اہالی سرکار کمپنی کہ در ۱۲۴۳ھ بہ سواد کلکتہ تسوید یافتہ روانہ دار السلطنت لندن گشت“

ترجمہ : یہ رسالہ مبینی ہے سرکار کمپنی کے اہل کاروں کی باتوں کے جوابات پر جو ۱۲، ۱۳، ۱۴ میں نواح کلکتہ میں لکھ کر دار السلطنت لندن کو بھیجا گیا۔

اس کتاب کا انگریزی ترجمہ اس نام سے شایع کیا گیا تھا۔ *Reply to the charges Against the King of Oude*
اس کتاب کے اردو ترجمے کا ایک مطبوعہ نسخہ میرے کتب خانے میں موجود ہے۔ کتاب میں سات باب ہیں جن کے مضامین کی فہرست درج ذیل ہے :

پہلا باب۔ دربار اودھ اور سرکار کمپنی کے درمیان مصالحت کے وقت سے سرکار کمپنی کی اطاعت و انقیاد کے حقائق دوسرا باب۔ وہ امور جو سرکار کمپنی کے اہل کار عہد ناموں کے مقتضیات سے چشم پوشی کر کے عمل میں لائے۔ تیسرا باب۔ ان مقدمات کی کیفیت جن پر کرنل سلیمین اور جنرل ادٹرم نے اس ریاست کی بدنامی کی بنیاد رکھی۔ چوتھا باب۔ وہ اختلافات جن سے لارڈ ڈالموڈی، جنرل ادٹرم اور صاحبان کونسل کی تحریریں بھری ہوئی ہیں۔ پانچواں باب۔ ملک اودھ کے حسن انتظام کی دلیلیں۔ چھٹا باب۔ اس بات کی دلیلیں کہ جو عہد نامے دونوں سرکاروں میں بہت توثیق اور استحکام کے ساتھ لکھے گئے ہیں ان کا توڑنا کسی طرح جائز نہیں ہے۔ ساتواں باب خوں ریزی کی واردات اور دوسری طرح کے فسادات جو سرکار کمپنی کی عمل داری میں بھی ہوتے رہتے ہیں۔

اس کتاب کی تہمید یا دیباچہ جو داجہ علی شاہ نے لکھا ہے، اس کے ضروری اقتباسات کتاب کے اردو ترجمے سے ذیل میں نقل کیے جاتے ہیں :-

”آگے ہم نے برخوردار سعادت اطوار مرزا دلی عہد بہادر اور اپنے چھوٹے بھائی مرزا اسکندر شہت بہادر کو بہ امید دادیالی روانہ دار السلطنت لندن کیا ہے۔ بعد اس کے اودھ بلوہک کہ چھپکے ہندوستان میں آئی اور ترجمہ ہو کے ہماری نظر سے گزری، معلوم ہوا کہ

بعض لوگوں نے ناحق بربادی اور تباہی ہمارے ملک کی شہور کر کے
 موسٹ فیل مار کوئٹس ڈلہوزی صاحب بہادر گورنر جنرل ہند اور صاحبان
 کورٹ آف ڈائریکٹرس تک پہنچا کے یہ آتش افروزی کی ہے۔ چونکہ ہم کو
 خدا کے فضل اور عدالت پسندی اور انصاف گستری حضرت ملکہ معظمہ
 رفیع الدرجۃ انگلستان اور صاحبان والا شان پارلیمنٹ سے امید
 قوی ہے کہ بعد دریافت حقیقت راست براست کے ہم اپنے حق کو
 پہنچیں گے اور بدستور اپنے ملک پر قابض ہوں گے، اس واسطے کیفیت
 مفصل بطور جواب بلو بک کے لکھوا کے حضرت ملکہ معظمہ کی خدمت
 میں بھیجتا ہوں۔

”اس کتاب میں اصل دو امر ہیں۔ ایک یہ کہ بدستور صلح نامے
 بہت مضبوط اور مصرح درمیان مورثوں ہمارے اور سرکار کمپنی انگریز
 بہادر کے موثق ہوئے ہیں۔۔۔ بہت تعجب ہے کہ بادصف اقرار صحت
 استواری عہد نامے کے پھر اہالی سرکار کمپنی واسطے توڑنے اس عہد
 پیمان کے کوشش کرتے ہیں۔۔۔ ہم امید رکھتے ہیں کہ حضرت ملکہ
 معظمہ یہ مقتضائے انصاف اہالی کورٹ آف ڈائریکٹرس کو توڑنے عہد نامے
 ۱۸۵۷ء سے باز رکھیں اور ہمارا ملک بدستور ہمارے قبضے میں کر دیں۔

”دوسرا امر یہ ہے کہ اظہار بربادی اور بد انتظامی ہمارے ملک
 کی بالکل غلط، شہر اور قصبے اور گاؤں سب آباد، بلکہ آبادی روز بروز
 بڑھتی جاتی ہے اور آمدنی اسی طرح سے جیسا کہ چین برس سے تھی۔
 خدا نخواستہ اگر ملک برباد ہوتا، آمدنی دوچار برس میں موقوف ہو جاتی۔
 یہی ایک دلیل کافی ہے واسطے ثبوت اس بات کے کہ ہمارے ایام
 سلطنت میں کوئی نقصان نہیں ہوا۔ ہم دعویٰ کر کے کہتے

ہیں کہ اگر اضلاع قریبہ یعنی کانپور، شاہجہان پور، فرخ آباد وغیرہ کو جو کہ عمل داری سرکار کمپنی میں ہیں، ساتھ ہمارے ملک کے مقابل کیا جائے، بے شک رونق اور سرسبزی ہمارے ملک کی سب باتوں میں ان اضلاع سے زیادہ ہوگی۔

”انھیں دونوں باتوں کی توضیح ابواب اس کتاب خصوصاً باب پانچویں اور چھٹے میں مندرج ہے۔ جو کچھ سوال زائد اس کتاب سے بہ نسبت ہمارے عائد ہو تو قریبہ کے معرفت سے ان عزیزوں کے ہمارے پاس پہنچے، کہ ہم اس کا جواب مفصل بھیجیں گے۔ پہنچے جواب تک مقدمہ دائر دفتر پارلی منٹ رہے۔“

واجد علی شاہ نے اس کتاب کی ایک بہ تکلف جلد ملکہ معظمہ انگلستان کو ایک محبت نامے کے ساتھ بھیجی، جس میں یہی لکھا کہ اس کتاب کو صاحبان پارلی منٹ اور ارکان دولت بہ نظر انصاف ملاحظہ فرمائیں۔
بادشاہ نے ایک خط جنرل سکندر خیمت کو لکھا، جس کا ایک اقتباس درج ذیل ہے :

”جواب کتاب بلیو بک بہت تصریح و توضیح سے لکھ کر بھیجا ہے۔ چاہے کہ موافق تحریر مقدمات مندرجہ کے ہر مقدمے کو انجام پہنچانا اور اگر احیاناً کسی مقدمہ خاص میں جواب دہی سے عاجز ہو، اسے حضور اقدس پر محفل رکھنا۔ یہاں سے اس کا جواب ثانی جائے گا۔“
محبت نامہ اور ایک جلد کتاب جناب ملکہ معظمہ ام القیاس کو بھیجی ہے، وزیر اعظم کے واسطے سے گزرا تھا۔ اور ایک جلد خود وزیر اعظم

کو اور ایک شاہ زادہ پرنس کو دینا۔ اور تین سو جلد اور بھی ہیں۔ جسے
قابل اور شائق دیکھنا دینا ہے

”ایک انگریز جلیل القدر، عالی خاندان مترجم زبان و ناسی و
اردو کمال متدین اور امین مقرر کردہ جو اپنی طرف سے کہیں طرح کا دخل
تصرف نہ کر سکے“

جواب آفدہ بلوہات کے اردو ترجمے کا ایک دوسرا مطبوعہ نسخہ لکھنؤ کے عاشق اور لکھنوی
تہذیب کا مثالی نمونہ نواب سید ذکی علی خاں ہائفت مرحوم کے کتب خانے میں تھا جو کتابت
اور طباعت میں پیش نظر نسخے سے بہت بہتر تھا۔ اس کا خط نسبتاً خفی تھا۔ اس لیے صرف
بہتر صفحوں میں لگایا تھا۔ اس کے سرورق پر کتاب کے نام کی جگہ پر ایک دائرے کے اندر
خط طغرائیں ’افوض الی اللہ واللہ بصیر‘ بالعباد چھپا ہوا تھا اور کسی نے
اپنے قلم سے کتاب جواب بلوہات اور ”نزعۃ ربیع الاول ۱۲۷۲ھ مطابق ۱۸۵۷ء چھپا
گردیدہ بود“ لکھ دیا ہے۔ میں نے اپنے نسخے کا اس نسخے سے مقابلہ کر کے پہلے صفحوں کی
عبارت جو میرے نسخے میں نہ تھی نقل کر والی اور بعض مقامات کی تصحیح کر لی۔

ارشاد خاقانی (اردو)۔ مطبع سلطانی لکھنؤ ۱۲۶۹ھ صفحات ۱۲۳

اس کتاب کے مضامین میرس الدین فقیر کے ناسی رسالہ عروض سے
ماخوذ ہیں۔ بادشاہ نے جگہ جگہ توضیحی عبارتوں کا اضافہ اور اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔
کبھی کبھی دوسرے عروضیوں کے اقوال نقل کر کے محاکمہ کیا ہے۔ (دیکھئے صفحہ ۲۴) فقیر کی
رائے سے کئی کہیں کہیں اختلاف کیا ہے۔ مثال کے طور پر ذیل کی عبارت پیش کی جاتی ہے۔
”اس جگہ میرس الدین فقیر خود جو کہ ہیں کہ اجتماع وقف اور
کف مفعولات میں لکھا ہے۔ ہر چیز پہلے خود لکھ گئے ہیں کہ کف سبب خفیف

میں آتا ہے۔ اس جگہ سبب خفیف کہاں ہے کہ جس میں کھٹ آیا۔ بہتر یہ تھا کہ کھٹ کے معنی یہ لکھتے کہ تائے مفعولات کو گرا دیتا ہے بعد

دقت کے " (ص ۳۸-۳۹)

تمام سالم اور مزاحمت بحروں کی مثالوں میں بادشاہ نے ایسے شعر پیش کیے ہیں۔ اس سے ان کی قدر و قیمت کا ثبوت ملتا ہے۔ کتاب کی تاریخ تصنیف طبع قبول اور اسیر نے ذیل کے قطعوں میں بھی ہے۔

شمس الدین در عرض کردہ تحریر از ترجمہ شاہ فردوس توقیر
تاریخ رقم کرد چنیں ملک اسیر از شاہ زمانہ زندہ شد نام فقیر ۱۲۶۸ھ

آس میر شمس دین کہ تخلص فقیر داشت در شعر یادگار جلال اسیر را
کردہ عرض قافیہ در فارسی رقم تا فائدہ دہد شعرا کے نجیر را
شاہ بلند سر پر نفع خاص عام اور دود نمود آس رقم دل پذیر را
تاریخ طبع کرد قبول اس چنیں رقم ملبوس دادہ نوشہ قدس فقیر را۔ ۱۲۶۹ھ
بادشاہ نے اس کتاب کے پانچ تاریخی نام نکالے ہیں۔ ارشاد خاقانی، تربیت نامہ سلطانی، تسویم الاذہان، تہذیب الاصل، حکم اختر۔ پہلے دو ناموں سے تاریخ تصنیف ۱۲۶۸ھ اور باقی تین ناموں سے تاریخ طبع ۱۲۶۹ھ نکلتی ہے۔ اور دیباچے کے خاتمے پر لکھا ہے نام اس کا حکم اختر رکھا گیا اور تاریخ اس کی اس سے نکلتی ہے۔ قبول نے بھی قطعات تاریخ کے عنوان میں کتاب کا نام حکم اختر بتایا ہے۔

بادشاہ کے منظوم کلام میں لغزشوں کے امکان کا ذکر کر کے مولانا شمس لکھتے ہیں :-

”کبھی کوئی مصرعہ غیر موزوں رہ جائے یا بحر سے الگ ہو۔ ادبیہ ان کے کمال موزوں طبع کی دلیل ہے“

بادشاہ میں فطری موزوں طبع تو تھی ہی، اسی کے ساتھ انھوں نے علم عروض و قافیہ کی بخوبی تحصیل کی تھی۔ وہ اس علم کو شاعروں اور شعراء سے دل چسپی رکھنے والوں کے لیے ضروری سمجھتے تھے۔ فرماتے ہیں:

”شعر کے مشتاقوں کو علم عروض اور قافیہ کا بھی ضرور چاہیے اور موزوں کرنے والوں کو خبر ان دونوں فنون کی واجبات سے ہے“

جوہر عروض نمبر ۱۔ مطبع سلطانی کلکتہ ۱۲۹۰ھ صفحات ۱۹

کتاب کا نام تاریخی ہے۔ اس کے مختصر دیباچے میں لکھا ہے
”بحر سالم مع قدیم و تازہ بلا زحمت ہر آن چہ از عقل ناقص خود
حاصل ساخته، ہدیہ کا ملان این فن می سازد“

جوہر عروض نمبر ۲۔ مطبع سلطانی کلکتہ ۱۲۹۲ھ صفحات ۳۵

اس کتاب کے دیباچے میں لکھا ہے۔

”ایں اوزان نو بحر بازی موزون الطبعان مشتمل دنیا بہ جوہر عروض

موسوم ساخته پیش کش می سازد یک صد و پیل و سہ وزن حاضری آورد“

ان دوہم نام اور ہم موضوع رسالوں کے تقابلی مطالعے سے حسب ذیل باتیں معلوم ہوتی ہیں۔

نمبر ۱ میں گیارہ بحر وں کے دو دو نام ہیں اور ان کے صرف مشتمل اوزان ہیں۔
نمبر ۲ میں یہی بائیس نام بائیس مختلف بحر وں کے ہیں اور ان کے مسدس اور مرتب اوزان بھی ہیں جن کی مجموعی تعداد تیس ہے۔

نمبر ۱۲-۱۹ میں جو چونتیس بحریں ہیں وہی نمبر ۲ میں ص ۱۲-۳۵ میں ہیں لیکن نمبر ۱۱ میں ان کے صرف تین اوزان ہیں۔ نمبر ۲ میں تین کے علاوہ سوس اور مربع اوزان بھی ہیں اور ان سب کی مجموعی تعداد تین ہے۔

نمبر ۱۸ میں نئی بحریں ایسی ہیں جو نمبر ۲ میں نہیں ہیں اور نمبر ۲ میں پانچ نئی بحریں ایسی ہیں جو نمبر ۱۸ میں نہیں ہیں۔

نمبر ۱۹ میں تیس پرانی بحریں بھی ہیں جو نمبر ۲ میں نہیں ہیں۔

نمبر ۱۸ میں باون نئی بحریں اور تیس پرانی بحریں ہیں۔ نمبر ۲ میں ایک سو سینتالیس نئی بحریں ہیں۔ نئی بحروں میں چونتیس دونوں میں مشترک ہیں۔

اس طرح دونوں رسالوں میں مجموعاً ایک سو اکٹھ نئی بحریں ہیں جو بادشاہ کی ایجاد ہیں۔ ان کے علاوہ انیس پرانی بحریں بھی ہیں یعنی کل ایک سو اسی بحریں ہیں۔ یہ کل بحریں اردو میں غیر مانوس اور ہشت کل ہیں۔ بادشاہ نے ان سب بحروں میں مثال کے طور پر ایک ایک مصرع موزوں کر دیا ہے اور مختلف بحروں کے ارکان کو نئی نئی طرح ترتیب دے کر ایک سو اکٹھ نئی بحریں ایجاد کی ہیں۔ اور ہر ایجاد پر بحر کا ایک نیا نام رکھا ہے اس سے علم عروض میں واجد علی شاہ کی غیر معمولی ہمارت کا ثبوت ملتا ہے۔

جو مصرع ہر وزن کے مطابق نظم کیے گئے ہیں وہ دونوں رسالوں میں تقریباً یکساں ہیں۔ ایک خاص فرق یہ ہے کہ نمبر ۱۸ میں جہاں جہاں پڑھ کا لفظ ہے نمبر ۲ میں وہاں کہہ کا لفظ ہے۔

بادشاہ نے جوہر عروض نمبر ۲ کا ایک نسخہ علامہ مفتی میر محمد عباس صاحبہ کو بھیجا۔ اس کی رسید میں مفتی صاحب نے جو عریضہ بادشاہ کو لکھا اس کی ابتدائی چند سطریں نقل کی جاتی ہیں :-

”حضرت ظل سبحانی بحر مواج جو دو کرم ماحی اسم حاتم از حاتم
حالم اعداد اللہ ملکہ واجری فی بحر الفضل نالک
Chandigarh, Punjab, India

سخن دانی از پیش گاہ خاقانی بہ عطائے گوہر گراں بہائے جوہر عروسی
 سراپا دہر و دوش مرصع پوش گشتہ دایں دوشعر ہر باہم گزشتہ
 شاہ چوں جوہر عروص نوشت در شہوار شد عطا مارا
 چہ قدر بحر ہا بہ نظم آورد جمع در کوزہ کرد دریا را
 الحق کہ فقیر باد صفہ کہ رسالہ ہائے دافرا از نظم گزشتہ و ہر کلام عروسیا
 شعرا کمال واقف گشتہ لیکن در این مدت مدید چہین سالہ نظم نہ سید
 نضالِ اختری (فارسی) مطبع نول کشور لکھنؤ ۵، ۱۲۴۵ صفحات ۱۵

اس مختصر رسالے میں چار فصلیں ہیں ۱۔ در آداب کہ خرداں را از بزرگان باید۔
 ۲۔ در آداب مجلس شایان۔ ۳۔ در تادیب زن و فرزندان۔ ۴۔ در آداب تخلیہ
 ہم صحبتان۔

اس کے دیباچے کا ضروری اقتباس نقل کیا جاتا ہے :

”بندہ خاکسار بے مقدار، نقش پایے اہل عالم، علی ابن ابیجد
 ملقب بہ سلطان عالم شاہ اودھ، المتخلص بہ اختر، تراب اقدام موبین
 خاک راہ صاحبان یقین ہر اخیرہ در عالم یاس و قید و ہراس کہ از شومی
 بخت نارسیدہ بجائے سیاہی آب دیدہ صرف نمودہ و در فرط بیقراری
 و حالت آہ و زاری کہ نصیب دشمنان باد، یعنی در زندان فرنگستان کہ
 موسوم بہ قلعہ ولیم فورڈ کلکتہ است ہر قدر تحفہ کہ برائے مبتدیان نزد خود
 داشت بے تکلف از نوک خامہ ریختہ۔ امید اظالیان این فن مبارک
 چنان است کہ عیوب راقم الحروف را از خلعت صلاح بہ پوشانند“
 وزیر نامہ میں یہ پورا رسالہ نقل کر دیا گیا ہے یہ

جہادِ اخترى ۔

اس رسالے میں بادشاہ نے فوجی قواعد کے قاعدے لکھے ہیں۔ اس کتاب کا ذکر مرزا حاتم علی بیگ تھر کے ایک قطعہ تاریخ میں ملتا ہے جو مع عنوان ذیل میں نقل کیا جاتا ہے :

یہ وہ رسالہ شہ انجم سپاہ ہے جس سے ہے پلٹنوں کی قواعد کا نظام
اے تھر تو حضورِ معلیٰ میں عرض کر تالیف کا ”جہادِ اخترى“ ہے نام
تھرنے اس رسالے کا نام ”جہادِ اخترى“ تجویز کیا ہے جس سے اس کا سال
تصنیف ۱۲۶۹ھ نکلتا ہے ۔

مجموعۂ واجدِیہ سلطانی (فارسی)

رسالہ واجدِیہ سلطانی (اردو)

ان دو کتابوں کا ذکر ایک ساتھ اس لیے کیا جا رہا ہے کہ پہلی اصل کتاب فارسی میں ہے اور دوسری اس کا لفظ بلفظ اردو ترجمہ ہے۔ اصل فارسی کتاب کا جو نسخہ میرے کتب خانے میں ہے اس کے شروع آخر اور درمیان سے کچھ ورق غائب ہیں۔ اردو کتاب کے دیباچے میں کتاب کی حقیقت یوں بیان کی گئی ہے۔

”سلطان عالم محمد واجد علی شاہ بادشاہ تخلص اختر نے یہ چاہا
کہ تھوڑے کاغذ اُن کاغذوں سے کہ بچپن میں جب پڑھنے لکھنے کا بہت
چرچا تھا ایک جاکے تھے، مگر سب وہ بکھرے ہوئے تھے، انھیں کاغذ
کو تاریخ اور حدیث کی کتابوں سے خلاصہ لکھ۔ بے بس ہو کے بہت
نہ لکھا مگر ایک رسالہ کہ نام اس کا مجموعۂ واجدِیہ سلطانی رکھا

ہے لکھا میں نے... ستائیں افسر اس رسالے میں ہیں کہ سننے والوں
 کو ان سے مزہ ملے اور شاعروں کو شعر کہنا آدے اور مالوں کو بہرہ نصیب
 ہو اور نئی بات پیدا کرنے والوں کو لطف اور بیماریوں کو تندرستی ہو۔“
 غالب کے فارسی کلیات میں مثنوی نغم اس کتاب کا منظوم دیباچہ ہے۔ اس کے
 عنوان کی عبارت حسب ذیل ہے:
 ”دیباچہ نثر موسوم بہ ہفت افسر تصنیف حضرت فلک رفیع
 شاہ اودھ“

اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ واجد علی شاہ کی ایک نثری کتاب کا نام ہفت
 ہفت افسر ہے لیکن حقیقت میں غالب کی مراد یہی مجموعہ واجد علی سلطانی ہے۔
 اس کتاب میں ستائیں فصلیں ہیں جو ستائیں افسروں کے نام سے یاد کی گئی ہیں غالب
 کی اس مثنوی میں تینتیس شعر ہیں۔ وہ کتاب کی تعریف میں کہتے ہیں۔

بنام ایندو ہے مجموعہ راز	شگفت آذر تر از نیرنگ اعجاز
تعالیٰ اکثر کتابے مستطابے	غلط گفتم فرداں آفتابے
بیاضے کا ندراں میں السطور است	تو گوئی موج از دریائے نور است
مگر خود چشمہ نور است و از دے	بہر سو موج می خیزد پیالے
ستودم لیک و صفش نے زمین پر	ہم از سلطان انجم انجم پر
کہ راز دہر در دستہ نگار	ہمایوں بست و ہفت افسر نگار
شہ فرزند چندین افرش میں	بہر افسر جهان دیگرش میں
ہمانا ہم چشم سلطان عالم	ہم آ میختہ ارکان عالم

طلسمے بستہ اندر آفرینش

کہ افزاید فروغ چشم بینش

واجد علی شاہ کی طرح میں کہتے ہیں

بجھت ابرو بدل دریا ست سلطان
 کند رطلے جم بار گاہے
 بدارائی خود مستد یگانہ
 پیر از راز دو عالم سینہ اد
 کفش از پیچہ خود زرفشاں تر
 نگارستان معنی ہیں کہ دانی
 چو بینی این نقوش دل نشیں را
 سزد گزیر عظم ہنی نام
 کہ از نامش برآید سال اتمام

دگر باید ازین خوش تر گہر سفت

ریاض ملک معنی می تو اس گفت

آخری دو شعر بتاتے ہیں کہ غالب نے اس کتاب کے دو تاریخی نام نکالے ہیں 'نیر عظم' اور
 'ریاض ملک معنی' ان دونوں ناموں سے کتاب کا سال تالیف ۱۰۲۷ھ نکلتا ہے۔
 کتاب کے ستائیس افسروں کے موضوع مختصر حسب ذیل ہیں۔

- افسر ۱۔ چہار دہ معصومین کے مختصر حالات۔ افسر ۲۔ نیک و بد تاریخیں۔ افسر ۳۔
 سورہ یسین کی تلاوت کا فائدہ۔ افسر ۴۔ نکاح اور آداب مباشرت افسر ۵۔ ۱۳۔
 ادعیہ و اعمال و نقوش جن سے طرح طرح کے فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ افسر ۱۵۔ جنات کو
 حاضر کرنے کی تدبیریں۔ افسر ۱۶ و ۱۷۔ نیک و بد کام جن سے فراغت یا فلاکت حاصل
 ہوتی ہے۔ افسر ۱۸۔ شہداء کے کربلا اور ان کے قاتلوں کے نام۔ افسر ۱۹ و ۲۱۔ مختلف
 طرح کے نسخے۔ افسر ۲۰۔ آتش بازی بنانے کے نسخے۔ افسر ۲۲۔ سلاطین مغلیہ کی بادشاہی
 کی مدت۔ افسر ۲۳۔ الفاظ کے تلازمے۔ افسر ۲۴۔ پہیلیاں، کہ مکرمیاں، معنی۔
 افسر ۲۵۔ ہندی اور فارسی مثلیں۔ افسر ۲۶۔ فوجی قواعد کے لیے فارسی اصطلاحیں۔
 افسر ۲۷۔ اچھی اچھی حکایتیں

مجموعہ واجدیه اور رسالہ واجدیه دونوں کتابوں کے ص ۳ پر
 واجد علی شاہ کی دو مختلف اچھی تصویریں ہیں۔
 ملاذ الکلمات۔ مطبع سلطانی کلکتہ، ۱۲۹۴ھ، صفحات ۲۶،

بنی کی فہرست کتب میں اس کتاب کو لغت ہفت زبان کہا گیا ہے اس
 میں کئی زبانوں کے متجانس الفاظ یکجا کر دیے گئے ہیں۔ مثلاً لفظ باری کے ساتھ
 یاری، تازی، بازی، طاری، ناری، تاڑی، باڑی، ٹھیک، بھیک، بھیک، بھنگ
 خرم، جرم، جرم، خرم۔ سبب، سبب، مشیت، گبر، کبر، کفر، کثر، نانا، نیا، ٹپا
 سٹایا۔ ہر لفظ کا تلفظ بتا دیا گیا ہے اور اس کے مختلف معنی لکھ دیے گئے ہیں۔ کہیں کہیں
 سند کے لیے کوئی شعر بھی لکھ دیا گیا ہے۔ یعنی اکثر تفصیل سے لکھ گئے ہیں اور لغت کی
 مستند کتابوں کے حوالے بھی اکثر دیے گئے ہیں۔ ہر حرف کا ایک باب ہے اور وہ حرف
 جس دو سے حرف سے ملتا ہے اس کو فصل قرار دیا ہے۔ جو لوگ اس لغت کی نوعیت
 سے واقف نہیں ہیں ان کو اس میں الفاظ کی ترتیب بہت ناقص معلوم ہوگی۔ ایران
 کے مشہور عالم شاعر ملا جامی نے اسی نوعیت کی ایک مختصر منظوم فرہنگ اپنے فرزند
 ضیاء الدین یوسف کے لیے تجنیس اللغات کے نام سے لکھی تھی۔ کتاب کے دیباچے میں
 حمد خدا کتب لغات کے تلامذے میں لکھی گئی ہے، اس میں فارسی اور عربی لغت کی
 چوبیس کتابوں کے نام آگئے ہیں۔

ملاذ الکلمات اس لغت کا ناریخی نام ہے جس سے اس کا سال تدوین
 ۱۲۹۳ھ نکلتا ہے۔ کتاب کے آخر میں کئی قطعات تاریخ ہیں جن میں ہمارا جہ ہے پال
 ثاقب کا قطعہ سب سے بہتر ہے۔ ثاقب نے کتاب کی تصنیف اور طباعت کے مسن
 اعجاز اختر، اور اعزاز اختر، سے نکالے ہیں۔ صدر محل کے نطن سے شہزادے
 ۱۲۹۳ھ ۱۲۹۴ھ

مرزا جمال شاعر تھے انھوں نے یہ کتاب پھر حلال تخلص اختیار کیا۔ ملاذ الکلمات کے

آخر میں ایک قطعہ تاریخ ان کا بھی ہے۔

ضمیمہ ملاذ الکلمات میں چند غزلیں، ایک طولانی منظوم خط اپنی بہن فرسید بیگم کے نام، قطعات، رباعیات، مخمس، مثنوی، چٹھل اور چوٹھم بند کا ایک ہر سہ ہے۔
ضمیمہ صفحہ ۶۹ سے ۷۲ تک ہے، جو مسیکر نسخے سے علیحدہ کر لیا گیا ہے۔
۷۲-۷۶ میں قطعات تاریخ ہیں۔

قطعہ تاریخ تالیف و طبع از ہمارا حاجے لویال ناقت

خاقان عدل گستر سلطان بجزو	زیب سر یعظت اکیلی سردری
سلطان عالم شرف شاہ کامراں	بالا نشین سدا جلال قیصری
واجب علی خدیو جہاں قیصر زماں	دار انسان و مظهر ذہ سکندری
نادر لغات ہفت باں جمع ساخته	تسخیر ہفت ملک نمود از سخن دری
مانند این نہ بیج لغت جمع گشتہ بود	ابھی کہ ختم گشت بریں نسخہ بزری
ناقت چو سال نام لغت نوشتہ غیب	گودیش بر دلم اعجازاخری ۱۲۹۳ھ

باردگر چو دگر بتاریخ طبع شد
آواز غیب آمدہ داعرا از آخری ۱۲۹۴ھ

قطعہ تاریخ طبع از شاہزادہ مرزا محمد جلال بہادر

حبذا رتبہ شاہ اختر	فخر نفور و جم و یکا دوس
لغے از سر تحقیق نوشت	شد بہ نیم علم اس رائس
نام نامیش ملاذ الکلمات	صیتش از ہند برونفت بطوس
زیور طبع چو آراست بہر	گشت آراستہ مانند عروس

از سر ادج رقم زد صاحب
۱۲۹۴ھ

عشق نامہ (فارسی) قلمی

اس کتاب میں واجد علی شاہ نے اپنی عمر کے ابتدائی چھبیس برس تک یعنی شہزادگی اور دلی عہد کی زمانے میں اپنے عشق و محبت کے تفصیلی حالات ایک سو بیس داستانوں میں بیان کیے ہیں۔ انھیں داستانوں میں شرافت نفس، پاس مذہب، اطاعت والدین، خدا ترسی، رحم و کرم، عدل و انصاف کے غیر معمولی مظاہر بھی جگہ جگہ نظر آتے ہیں اور بعض عمارتوں، باغوں، میلوں اور رسم کے حسبِ حال بھی ملتا ہے۔ عشق و محبت کی یہ داستانیں اپنی نوعیت میں واجد علی شاہ سے مخصوص نہیں ہیں۔ اس عہد کے دلیان ملک، روم و اعرامیں ہر ایک کی نجی زندگی سے ایسی ہی داستانیں لے کر بہت سے عشق نامے مرتب کیے جاسکتے ہیں۔ لیکن اردو کے یہاں ان داستانوں پر دیر پردے ڈال کر پارسی کی بھونٹی نمائش کی گئی ہے اور واجد علی شاہ نے ان کو بے کم و کاست اپنے قلم سے لکھ کر ایسے عجیب و سترے نقاب کر دیے ہیں۔ اس کتاب کی حیثیت *confessions* (اعترافات) کی ہے جس میں بعض نامور اشخاص نے اپنی زندگی کا کچا چٹھا پیش کر دیا ہے۔

عشق و محبت کی یہ داستانیں جن واقعات پر مشتمل ہیں وہ آٹھ برس کی عمر سے چھبیس برس کے سن تک اٹھارہ سال کے طویل عرصے میں پیش آتے رہے۔ جو چون چوں کہ ایک سلسلے میں مربوط کر دیے گئے ہیں۔ اس سے یہ غلط فہمی پیدا نہ ہو کہ یہ واقعات درمیانی وقفوں کے بغیر ایک کے بعد ایک مسلسل پیش آتے رہے اور یہ غلط نتیجہ نہ نکالا جائے کہ واجد علی شاہ کی ساری زندگی صرف عشق و محبت کی داستان ہے۔ واجد علی شاہ امیر سلطنت بھی انجام دیتے تھے، اہم مقدمات کا فیصلہ بھی کرتے تھے۔ وہ نہایت پر گوشاعر اور بہت زود نویس مصنف اور فنون لطیفہ کے بہت بڑے سرپرست تھے۔

اس کتاب میں مصنف نے اپنی زندگی کا صرف ایک پہلو پیش کیا ہے۔

دوسرے پہلو جو کتاب کے حدود سے خارج تھے ان کا ذکر کمزور کے خلط مباحث نہیں کیا ہے۔ کسی کتاب میں موضوع کتاب کے علاوہ دوسری چیزوں کی تلاش کو نا مصنف کے ساتھ بے انصافی ہوگی اور کسی کی کتاب زندگی کے ایک باب کو پوری زندگی قرار دینا اس سے بڑی نا انصافی ہوگی۔

یاد رکھنا چاہیے کہ ان داستانوں میں مصنف کی حیثیت ایک عاشق کی ہے، کسی جابر و قاهر فرماں روا کی نہیں ہے۔ اگر وہ احمد علی شاہ معاملات عشق پر شاہی اختیار اختیار و اقتدار سے کام لینے لگتے تو یہ عشق و محبت کی داستانیں نہ رہتیں، جبر و تشدد کی داستانیں بن جاتیں۔

ان داستانوں میں بیگم کا لفظ اور بیگم کی شان دار خطاب ان کے خاندانی وقار کے ثبوت نہیں ہیں۔ وہ صرف بادشاہ اور شاہی محل سے ان کا تعلق ظاہر کرتے ہیں۔ مولانا شہر لکھنوی کا چشم دید بیان ہے کہ ”شاہی محل کی بھشتن تک نواب آئے۔ بیگم تھی اور ہتھرنی نواب مصفا بیگم یہ عورتیں جو بیگمیں کہلاتی تھیں اکثر و بیش تر گانے ناچنے کی خدمت پر ملازم تھیں اور انھیں طبقوں سے تھیں جن کا کام ہی ناچنا گانا تھا۔ واجد علی شاہ نے تقریباً تمام بیگموں کے بارے میں خود کھ دیا ہے کہ وہ کن طبقوں اور کن خاندانوں سے تھیں۔“

اس کتاب کے دلی نسخے میں نے دیکھے ہیں، ایک وہ جس کا اردو ترجمہ مرزا فدا علی خٹہ نے محل خانہ شاہی کے نام سے شائع کیا اور دوسرا وہ جو بیاست محمود آباد کے کتب خانے میں تھا اور جس کی خوش خط نقل میرے کتب خانے میں موجود ہے۔ اس نے آخر میں تین قطعات تاریخ ہیں۔ پہلے قطعے پر یہ عنوان ہے ”قطعہ تاریخ آئینہ کلام اللہ“ اٹک کید گئی عظیمی، وہ قطعہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

لے حزن اختر مقدمہ صلا

چو از حال مکرزناں شد فراغ کشودم بشکر الہی زباں
رقم سال تاریخ اختر نمود ”بہیں حال کید عظیم زناں“
اس قطعے کے عنوان میں قرآن کی جو آیت درج کی گئی ہے اور قطعے کا پہلا اور آخری
مصرع بتاتا ہے کہ اس کتاب میں عورتوں کے شدید مکر کا بیان ہے۔ باقی دو قطعے
حسب ذیل ہیں :

چوں کتاب عشق نامہ شد تمام کردش تالیف خود بادولتے
گفتم اختر مصرع تاریخ آں ”کردم از احوال نسواں فرصتے“

برالفہ دود صد بہ شصتہ دینچے ز ذی قعدہ آمدہ دود بہ صورت
بتاریخ این گفتہ مصرعے اختر ”از احوال نسواں کردیم فرصت“
ان تینوں قطعوں سے کتاب کا سال اختتام ۱۲۲۵ھ نکلتا ہے۔ آخری قطعے سے سال
کے علاوہ ہینا اور تاریخ بھی معلوم ہو جاتی ہے۔ یعنی ۱۲ ذی قعدہ ۱۲۶۵ھ۔ لیکن
کتاب کی آخری داستان میں ایک ایسے سانحے کا ذکر ملتا ہے جو اس تاریخ سے پانچ
ہفتے بعد ۱۹ ذی الحجہ ۱۲۶۵ھ کو پیش آیا۔ ظاہر ہے کہ یہ واقعہ کتاب ختم کرنے کے بعد
بڑھا دیا گیا ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ ابتداءً عشق نامہ ایک سوانحیویں داستان پر ختم کر دیا
گیا تھا، کیونکہ اس میں کتاب کی تصنیف کا مقصد یا حاصل بیان کر دیا گیا ہے۔
مصنف نے اپنے عشق و محبت کی مفصل داستانیں لکھ کر یہ دکھایا ہے کہ عورتوں پر زلفہ
ہونے میں کیا کیا صدمے بھیلنا پڑتے ہیں۔ ان کا دل بٹھانے کے لیے اپنی خود داری
کے خلاف کیا کیا جتن کرنا پڑتے ہیں۔ ان باتوں کو ناظرین کے دل نشین کرنے کے لیے
نوجوان مصنف نے اپنے ذاتی تجربات اپنے آپ پر گزورے ہوئے حالات بے کم و کاست
بیان کر دیے ہیں۔ طرز بیان اس اختیار کیا ہے جس سے عشق بازی کی ترغیب نہیں

ہوتی بلکہ اس کے برے نتیجے سامنے آجاتے ہیں۔ مصنف نے خود بہت وضاحت کے ساتھ بتا دیا ہے کہ کتاب کس مقصد سے لکھی گئی ہے اور اس سے لوگوں کو کیا سبق لینا چاہیے۔ مصنف کا یہ نہایت اہم بیان ذیل میں نقل کیا جاتا ہے۔ اس کو غور سے سننا چاہیے۔

”امید آں دادم کہ اندیس بے دفائی نامہ ہر کہ ملاحظہ سازد دل خود را از محبت نسوان باز داند و زرت خود را در مقدمہ اینہا بمعرض تلف نیارد؛ چرا کہ انجام کار اینہا آنچه می شود بدست ایشان اگر حضرت یوسف را ہم بیابند از بے دفائی خود دست برندارند۔ لہذا از ایشان کنارہ نمودن بسیار خوب است۔۔۔ ہم چوین بادشاہ خوبصورت خوش سیرت را کہ کتب ما از صفت و ثناء کے من ملواند با وجود اطاعت نہ ترسند۔ پس بدیگے چہ خواهد رسید“

ترجمہ۔ میں امید کرتا ہوں کہ جو کوئی اس بے دفائی نامے کو ملاحظہ کرے گا اپنے دل کو عورتوں کی محبت سے باز رکھے گا اور اپنا رویہ ان کے معاملے میں برباد نہ کرے گا، کیوں کہ اس کا انجام جو ہوتا ہے وہ بُرا ہے۔ یہ لوگ اگر حضرت یوسف کو بھی پائیں تو اپنی بے دفائی سے ہاتھ نہ اٹھائیں۔ لہذا ان سے دور ہی رہنا بہت اچھا ہے۔۔۔ میرے ایسے خوبصورت اور خوب سیرت بادشاہ سے جس کی ثناء و صفت میں کتابیں بھری پڑی ہیں، ناز برداری کے باوجود نہ دیں تو کوئی دوسرا ان سے کیا پائے گا۔

عشق نامہ فارسی کا اردو نشر میں ترجمہ مرزا فدا علی خاں نے محل خانہ شاہی

لے محل خانہ شاہی کا پہلا ایڈیشن ۱۹۱۴ء میں جی۔ پی۔ دربارداران پریس لکھنؤ میں چھپا تھا۔ اس کے بعد دو ایڈیشن نامی پریس لکھنؤ میں چھپے، ایک ۱۹۳۶ء (بقیہ اگلے صفحہ پر)

کے نام سے اور تحسین سردری پری خانہ کے نام سے کیا ہے۔ ان دونوں ترجموں نے اپنی اپنی کتاب کے آخر میں وہ قطعہ تاریخ نقل کر دیا ہے جس کا پہلا شعر یہ ہے۔

چوں کتاب عشق نامہ شد تمام
کردش تالیف خود باد دہلے

اس شعر میں مصنف نے اصل کتاب کا نام عشق نامہ خود بتا دیا ہے۔ مگر خجھر نے اس کا نام محل خانہ شاہی اور تحسین نے پری خانہ بتایا ہے۔ معلوم نہیں نصف کے متاعے ہوئے نام سے اختلاف کس بنیاد پر کیا گیا ہے۔

اس کتاب میں واجد علی شاہ نے جس اخلاقی جرات اور راست گوئی کی ہمت کا مظاہرہ کیا ہے۔ بعض مصنفین نے اس کی دل کھول کر داد دی ہے۔ نجم الغنی رام پوری تاریخ اودھ میں لکھتے ہیں :

”چھ دیوان اور مثنویوں کے علاوہ ان کے مکتوبات وغیرہ دیکھ کر

(حافظ ۱۵۵ء پرست) میں اور ایک ۱۹۳۲ء میں۔ اس کتاب میں ایک سوسائٹس بیان میں اس کی بیان کا مضمون دہی ہے جو اصل کتاب کی آخری یعنی ایک سو بیسیوں داستان کا محل خانہ کے پہلے اڈیشن کی ابتدا میں ”ڈیکیشن“ کے عنوان سے ایک صفحے کی عبارت ہے جس میں کتاب لکھنے کے ایک معزز رئیس یوسف حسین خاں بیرسٹر کے نام معنون کی گئی ہے در کتاب کے آخر میں دو صفحوں میں مقدمہ کتاب شہزادہ مرزا محمد انجم قدر انجم لکھنوی کے قلم سے ہے یہ کے اڈیشنوں میں یہ دونوں تحریریں شامل نہیں کی گئی ہیں۔

۱۵ پری خانہ پہلی مرتبہ ۱۹۵۵ء میں کراچی سے اور دوسری مرتبہ ۱۹۶۵ء میں لاہور سے شایع ہوئی۔ اس میں محل خانہ شاہی کا بیان ۹۹ دھنوں میں تقسیم کر کے ان ۹۹ نمبر ۱۰۰ ڈال دیے گئے ہیں۔ یہ ایک غیر کافرق آخر تک چلا گیا ہے۔ اس طرح محل خانہ شاہی کے آخری بیان کا نمبر جو ۱۲۷ تھا وہ پری خانہ میں ۱۲۸ ہو گیا ہے۔

ایک عجیب اور قابل قد بات یہ معلوم ہوئی ہے کہ شاہ اختر ایک ایسے بے دھڑک اور سچے شاعر تھے جنہوں نے اپنے خفیت رازوں، دلی بھیدوں اور خانگی باتوں کو اس طرح صاف صاف الفاظ میں نہ صرف اپنی خاص مجلس اور چند محرم راز لوگوں میں بیان کیا بلکہ ان خیالات کو زیور طبع پہنا کر ملک کے سامنے بھی پیش کر دیا۔ ان کی یہ اخلاقی جہات واقعی اس خاص روش میں تمام شوئے میں بحال سے بڑھ گئی ہے ^{۱۱۰}

بحر ہدایت (فارسی) - مطبع سلطانی لکھنؤ - صفحات ۱۱۲
بادشاہ نے اس کتاب کی نوعیت یوں بیان کی ہے :

”تراب اقدام مومنین، نیک خواہ متقین، المفتاح الی عنایہ
النشر سلطان عالم و امجد علی بادشاہ... خواست کہ مسائل فقہ کہ درین
طفولیت حسب الارشاد والد ماجد نور اللہ مرقدہ استفادے آں آفاق
شدہ بود و اجوبہ آں سلطان السلام جناب مجتہد العصر
والزمان تحریر نموده بودند و پریشان افتادہ بودند آں را در
سلک انضباط کشد تا از تفرق و تشتت مصنون و محفوظ ماند۔ یقین کہ
نمائندہ ایں بخاص و عام عاید گردد و در اتم و مصنف داخل حنات اجر
عظیم شوند و چون اجزا پریشان بودند ہذا تقسیم ابواب نہ نمودم و رسوم
بہ بحر ہدایت سلطانی کردم“

اس کتاب میں ایک سو ترسمہ ملے ہیں اور ان کتابوں کے حوالے دیے گئے ہیں۔
حدیقت المتقین، جامع عباسی، حیات المقلوب، مقنع، الائی تھذیب الحکام

کتاب الاشراق والاختیار، مفاتیح، شہاب ثاقب، جامع المقاصد، شرح
لمعدن، تنقیح، شرائع الاسلام وغیرہ۔ کتاب کے سرورق پر اس کا نام جو محمدؐ
بنی کی فرست کتب میں بحوالہ ہدایت اور کتاب کے دیباچے میں بحوالہ ہدایت
سلطانی لکھا گیا ہے۔

مباحثہ بین النفس والعقل (فارسی)۔ مطبع سلطانی کلکتہ۔ ۱۲۹۱ھ۔ صفحہ ۱۱۳
کتاب کا منظوم دیباچہ چار سو صفحوں میں پھیلا ہوا ہے۔ اڑھتیس صفحوں
میں حمد و نعت و منقبت اور بارہ صفحوں میں ”سبب تالیف و تصنیف“ ہولہ صفحہ
سے ۱۱۰ تک اصل کتاب ہے۔ آخر میں منظوم خاتمہ اور قطعہ تاریخ ہے۔ حمد کے ذیل
میں کہتے ہیں :

بہ آیاد اجداد من اے کریم	رساندی زرد سلطنت بالنعیم
بہ دہ سال این خستہ جان بے شعور	نمودہ ز فضل تو حکم دغور
دلے فزودہ سال این نیم جان	رسانید خود را تہ امتحان
کجا، آمد حنیض بادو آود	کجا حاصل یک لک درود

دریغاکہ عمرم بہ پیغمبر رسید

مگر اندر تو نیم نا امید (صل)

اولاد کی کثرت پر خدا کا شکر کیا ہے اور بے زاری کی وجہ سے ان کی شادی بیاہ
میں جو وقتیں ہو رہی ہیں ان کا بیان کر کے خدا سے امداد چاہی ہے۔ اور آگے بڑھ
کر اپنے گناہوں کا اعتراف کر کے بخشش کی دعا مانگی ہے۔ اس سلسلے میں کہتے ہیں
کہ میں نے نماز روزہ جو کچھ کیا وہ خوف سے کیا اور جو نیکی کی وہ بادل نا خواستہ اور
جنت کی حرص میں کی، لہذا میری عبادت اور خیرات کا کوئی اعتبار نہیں۔

نعت رسول بہت طویل لکھی ہے۔ اس میں پھر اپنی گنہ گاری کا اقرار کر کے
رسول سے شفاعت کی درخواست کی ہے۔

منم شرمسار دمنم عذر خواہ منم آں کہ کرم دم ہمیشہ گناہ
 منم آں کہ امید وارم بہ تو گناہان خود می سپارم بہ تو (ص ۲۵)
 منقبت بھی طویل ہے اور اس میں بھی اپنے کو گنہ گار قرار دے کر یہ درخواست کی ہے:
 شہا از کرم بر ملائم ننگ بہ عصیاں بین و بحالم ننگ (ص ۲۶)
 سبب تالیف و تصنیف کے تحت میں اپنا سبب نامہ تفصیل سے بیان کیا ہے اور
 لکھا ہے کہ باپ کی طرف سے میرا سبب امام موسیٰ کاظم تک اور ماں کی طرف سے
 امام حسین تک پہنچتا ہے۔ اس سلسلے میں لکھتے ہیں کہ صفدر جنگ دزیر آدھ کے جد علی
 قراوسف تھے، ان کے بیٹے شاہ بدیع، ان کے حسن علی میرزا، ان کے ناظر میرزا،
 ان کے بیٹے منصور میرزا تھے، جن کو شاہ عباس ثانی نے تبریز میں قید کر کے ایک لاکھ
 درم ان کے گزراے کے لیے مقرر کر دیے تھے۔ عجیب اتفاق ہے کہ بادشاہ انگلستان
 نے میسرے لیے بھی اتنا ہی گزراہ مقرر کیا ہے۔

آگے چل کے لکھتے ہیں کہ میں چھبیس عینے قید رہا۔ انیس سال سے مٹیا برج
 میں مقیم ہوں جس کا ایک نام موجی کھولا بھی ہے۔ تین سال سے ماہ رمضان میں
 نمازیں، دعائیں اور تلاوت قرآن ایک مجمع کے ساتھ کرتا ہوں۔ ان تینوں مضامین
 میں نفس نے جو سوال کیے اور عقل نے جو جواب دیے وہ میں نے لکھ لیے۔ انھیں اولوں
 اور جوابوں کا مجموعہ یہ کتاب ہے جو ۱۲۸۹ھ میں تمام ہوئی۔

بہشتا دوزخ یک ہزار دودصد سن ہجرت احمدی ازابد
 نمود من این بحث اہتمام علیہ الصلوہ و علیہ السلام (ص ۲۷)
 اسی سبب تالیف کے تحت میں دو شعر بھی ہیں، جن میں بادشاہ کہتے ہیں کہ مجھ کو
 شاعری یا نقاری کا دعویٰ نہیں ہے۔

منم آں کہ از نظم گویاں نیم زہم تفکر مشبک تنم
 نہ از شر گویاں ذی اعتبار نہ از کاتبان ثریا نگار (ص ۲۸)

اس کتاب میں تین باب ہیں جن میں ۱۲۸۴ھ د ۱۲۸۸ھ د ۱۲۸۹ھ کے رمضان کے سوال و جواب درج کیے گئے ہیں۔ کل سوالوں کی تعداد اٹھائیس ہے۔ یہ سب سوال مذہبی مسائل سے متعلق ہیں اور اکثر قرآن یا کتب تفسیر و حدیث کو دیکھ کر پیدا ہوئے ہیں۔ بعض سوالوں کے جواب لکھنے کے بعد جب وہی جواب مستند کتابوں میں دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی اور خدا کا شکر ادا کیا۔ اس سلسلے میں لکھتے ہیں۔

”اڑیں جا ظاہر شد کہ استکشاف عقل سلیم مولف از معنی آید“

مذکورہ مطابقت بامقول ہم نمود۔ پس حمد خدا کرامت کہ بنور عقل

صواب اندیش رہ نمونی و ہدایت بندگان خویش فرمود“ (ص ۹۱)

نفس کا پچھواں سوال اور عقل کا طولانی جواب ملاحت کے قابل ہے۔ اسے مصنف کی علمی قابلیت بخوبی ظاہر ہوتی ہے

اس کتاب میں بادشاہ نے جن کتابوں کا حوالہ دیا ہے اور جن کی عبارتیں نقل کی ہیں ان میں قرآن کے علاوہ کتب ذیل بھی شامل ہیں۔ تفسیر فخر الدین رازی، تفسیر کبیر، تفسیر مولا فتح اللہ، تفسیر صافی، علل الشرائع، منہج الصادقین، خلاصہ الحج، مجالس المتقین، عیاشی، عیون اخبار الرضا، حدیقہ سلطانہ، مسند الفردوس کہ از عمدہ کتب احادیث اہل سنت است۔

قطعہ تالیخ از ہمارا بھجے گویاں ثاقب

نحیط اسن دامان جلوہ فروغ جہاں	ملاذ دین ستین و معاون اسلام
خدیو عصر سلیمان نگیں سکندر جاہ	بلند اختر ادرج سخن ذوی الاکرام
رقم نمود کتابے یہ بحث عقل و نفس	زہے کتاب کہ آئینہ حقیقت تام
زہے کتاب کہ سر دفتر ارباب خاص	زہے کتاب کہ سرمایہ فیوض عام

نہے کتاب کہ مشحون ز آیت است حدیث
نہے کتاب کہ ملو ز قول پاک امام
بوصف آن نبود بکہ ثنائی تا نام
ہمان بہ است کہ تاریخ آن کتم ارقام

بوقت فکر پے سال گفت ہاتف غیب

’بلے مباحثہ عقل و نفس را انجام‘ ۱۲۹۰ھ

صحیفہ سلطانیہ (فارسی) مطبع سلطانی کلکتہ، ۱۲۸۹ھ صفحات ۱۰۵

ماہ رمضان ۱۲۸۹ھ میں تلامذت قرآن مجید کی حالت میں بادشاہ کو خیال ہوا کہ وہ تمام آیتیں جن میں خدا کو لفظ ’رب‘ سے خطاب کیا گیا ہے اردو ترجمے کے ساتھ یکجا کر دی جائیں اور یہ بتا دیا جائے کہ دعا کرنے والے کون کون ہیں، اور یہ آیتیں کس سورہ اور کس رکوع میں واقع ہیں اور ان کے اسناد اور نفع و ضرر بھی لکھ دیے جائیں۔ اس خیال کی بنا پر یہ کتاب تالیف کی گئی ہے۔ آیتوں کی تعداد چھتر ہے اور مکورات کو حذف کرنے کے بعد دعا کرنے والوں کی تعداد آیتیں، پاروں کی ایکس، سوروں کی پچیس اور رکوعوں کی پینتالیس ہے، اور ان سب کی فہرست شروع میں دے دی گئی ہے۔ آیتوں کے آخری حرف کو ردیف قرار دے کر ہر ردیف کا ایک باب قائم کیا ہے۔ ان بابوں کی تعداد آٹھ ہے جو پشتوں کی تعداد کے برابر ہے۔ اس بنا پر کتاب کا لقب یعنی دوسرا نام ہشت بابیہ جنانیہ رکھا گیا ہے۔

کتاب کے آخر میں تین تقریطیں ہیں جن کے کھنے والوں کے نام ان کی ہروں میں یوں لکھے ہوئے ہیں ’پیر و آئمہ معصومین قائمہ الدین جناب مولوی مرزا محمد علی صاحب؛ رفعت الدولہ رفیع الملک کاتب الملوک منشی سید محمد شفیع الرضوی فضل الاطبا قاری ہمدی حسن‘

مٹیابر ج میں امام باڑہ سبطین آباد کے ذخیرہ کتب میں اس کتاب کا ایک قلمی نہایت مطلق نسخہ موجود ہے جس میں دیباچے کے کل پندرہ صفحات کی زمین طلانی ہے اور حاشیوں پر طلانی کبلیں ہیں۔ ہفتہ کل صفحات میں حدود لیں اور عنوانات طلانی ہیں۔

ریاض القلوب (اردو) مطبع سلطانی کلکتہ، ۱۳۰۲ھ، صفحات ۲۲۳، تقطیع کلاں

یہ علامہ محمد باقر مجلسی کی کتاب حیات القلوب کی جلد اول کے ایک حصے کا

فارسی سے اردو میں آزاد ترجمہ ہے اور اس میں حضرت آدم سے حضرت ہود تک پیغمبروں

کے حالات ہیں۔ کتاب کے مختصر منظوم دیباچے کے چند شعر درج کیے جاتے ہیں:

مرے دل میں اک روز یہ آگیا کہ ہوا فائدہ عام کا رہ منا

جو ہے فارسی میں حیات القلوب جو اردو میں ہوتو نہایت ہے خوب

دہیں ترجمہ اس کا کرنے لگا نے نیک پیالوں میں بھرنے لگا

رکھا نام اس کا ریاض القلوب نہ ہو جس سے اختر کا طالع غروب

جواب بارہ سو پر ہیں اٹھا نوے سن ہجری لے خوش سیر جان لے

اسی سن میں کی اہستہ انشرفی

خدا مشعل دل میں دے روشنی

آخر کے دو شعروں سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۲۹۸ھ میں یہ کتاب شروع کی گئی۔

بادشاہ نے محض ترجمے پر اکتفا نہیں کی ہے بلکہ جگہ جگہ حالات و واقعات کا

اضافہ بھی کیا ہے۔ اپنا ایک ایک شعر حسب موقع سیکڑوں جگہ لکھا ہے اور بعض جگہ

دس بارہ جگہ سب سے پیشین شعری نظم کہہ دی ہے۔ ایک جگہ یہ لکھ کر کہ حضرت نوح اور حضرت

ہود نے اپنی قوم کی بد اعمالیوں سے تنگ آکر اس کے لیے نفرین اور بد دعا کی لیکن

امام حسین نے اپنا پورا گھر تیغ کر ڈالنے والوں کے لیے ایک کلمہ بد بھی نہ فرمایا اور واقعات

کو بلا کے بیان میں ایک سو سولہ سبب بندوں کا ایک مرتبہ کہہ کر کتاب میں شامل

کر دیا ہے۔ کہیں کہیں دو سے شاعروں کے شعر بھی نقل کیے ہیں مثلاً ص ۱۶۱ پانچ کا شعر:

مرتبه کم تر حص رفعت سے ہمارا ہو گئی پ آفتاب اتنا ہوا ادچا کہ تارا ہو گئی

اور ص ۱۶۲ پر ہوس کے یہ دو شعر:

اخذ رکھو اسے دادِ یوم الحشر
تجھ کو کوئی نہیں ہے بوسِ مضطر کا
بارغمِ سر پہ ہے پشتارہ عصیانِ دوش
حسرتیں زادِ سفر تو شہِ جرم و خطا
کتاب کی عبارت بالعموم شرعاً ہی ہے۔ مگر کہیں کہیں مقفیٰ اکثر بھی لکھی ہے مثلاً حضرت
ادریسؑ پیغمبر کی دعا سے بیخبر برسنے کا ذکر یوں کیا ہے :

”درگاہِ ارحم الراحمین میں دعا کی۔ پہلے خدا کی ثنا کی۔ پھر
عرض کی اے خالقِ بارانِ کرم نمایاں کر اس شہرِ دنواری میں پانی برسا۔
اب کم تو جی سے ان خشک دلوں کو نہ ترسا۔ اس وقت ایک ابر تیرہ د
تار مثل رنگِ زلفِ مشک بار گھنگھور پر شور مع برقِ درخشندہ دصاعقہ
بہندہ کھٹکتا ہوا گڑگڑاتا ہوا، جس کی بجلی کی چمکے آنکھوں میں چمکا چونہ
آئے، سیاہیِ سحاب دیدہ حور العین میں کا جل لگا جائے، آسمان
پر نظر آیا، جلوہ خالقِ الدجی کا دکھایا۔ جھم جھم پانی برسنے لگا، طافِ اوس
چمنِ دیم اٹھا کر بدن کو کسنے لگا۔ بارغِ اہلہانے لگے، مورچلہانے لگے۔
پیپے کی آواز کوئل کی دم ساز، مینڈھکوں کا زور، بھینگرؤں کا شور ہوا
سوکھے دھانوں پانی پڑا۔ اور اس درجہ بڑھا گمان ہوا ہیسا آئے گی۔
کیا کشتی عمر آبِ رحمت ہی میں ڈوب جائے گی؟“

کتاب کے آخری صفحے پر اطلاعِ ضروری کے ذیل میں یہ ہدایت نظر آتی ہے ”کوئی صاحب
اس کو خرید نہ کریں۔ یہ کتاب مطبع شاہی سے چھپ کر مفت تقسیم ہوئی ہے۔“ اس عبارت
کے نیچے داجد علی شاہ کے کتب خانے کی ہر ہے۔

صوت المبادک (فارسی) مطبع سلطانی، لکھنؤ ۱۲۶۹ھ صفحات ۱۶۳
اس کتاب میں ایک مقدمہ اور چھ باب ہیں۔ کتاب کے موضوع کی مناسبت سے

مقدمے کو قانوں اور باب کو حجاب کے لفظ سے یاد کیا گیا ہے۔ مضامین کی فہرست حسب ذیل ہے :

”مقدمہ در سبب تالیف۔ حجاب اول در بیان حالات سر و قدم۔
حجاب دوم در ذکر تال و لے حجاب سوم در بیان بناءے ساز ہا۔
حجاب چہارم در مقدمہ قص۔ حجاب پنجم در نقل حکایات مغنیان و
کلا و ننان گزشتہ۔ حجاب ششم در قص ایجاد دی کہ آں را ہر سلاطانی
گویند۔“

مصنف نے نغمے کی تعریف یوں کی ہے ”نغمہ تابع نمودن نفس امارہ خود است برائے مرد و جوان
نہ برائے عتین“ سازوں کے بیان میں کہا ہے ”سازے بہ از باب خلق نہ شدہ و تقلید لگو
مثل ایں ساز دیگر نمی سازد ہم چنین مین“

بادشاہ نے موسیقی کے منظوم رسالے چنچل میں اس کتاب کا ذکر یوں کیا ہے :

اگر موسیقی کا بڑھ شوق ہاں تو صوت اللہ بارک کو دیکھ لے جو اں
اسی علم میں وہ کہی ہے کتاب مگر اب ہے نایاب مثل سراب
مرے عہد میں تھی وہ ہر جا عیاں چھپی جسے لوٹا گیا کارواں
کتب خانے میں سیر موجود ہے دگر نہ زمانے سے مفقود ہے

اس کتاب کا سبب تالیف بادشاہ نے یہ بیان کیا ہے :

”مولف بچپن سے موسیقی میں ایک شش محوس کرتا تھا لیکن اس
کے کتساب کی صورت نظر نہ آتی تھی۔ اس فن کے جاننے والے لاکھ
اور تنگ حوصلہ اور اس فن پر لکھی ہوئی کتابیں مثل نغمات آصفی، خلاصۃ
العیش اور سنگیت در دین وغیرہ تشفی بخش نہ تھیں۔ سلسل ریاض اور
نفس کشی سے آخر کار اثر آفرین شت اس فن میں بہم پہنچائی۔ اور یہ کتسا
اس غرض سے لکھی گئی کہ جسے کبھی ہتفیض ہوں“

امیر علی خاں ہلال نے اس کتاب کی تاریخ اتمام بھی جو حسب ذیل ہے :

لکھی کس قسطنطنیہ سے صوٹ المبارک شاہ نے
نہرودنا ہید گردوں کو یہ ہے دردِ زباں
کیا طبیعت نور کی ہے اختر ذی جاہ کی
چاندنی سے ہے سوا پُر نور اس کا ہر حجاب
نغمہ زن منقار مرغان معانی کیوں نہ ہو
ہر نو استخ اس کو پڑھ کر قائل اعجاز ہے
کوچہ نائے گلو سے دل کے اندر راہ کی
ہے جو اک ادنیٰ قدیمی خانہ زادوں میں ہلال
مصرغ تاریخ میں جب فکر خاطر خواہ کی
گوشش دل میں پردہ ہائے غیب آئی ندا

”محسن داؤدی ہے یہ صوت المبارک شاہ کی“ ۱۲۶۹ھ

بادشاہ نے صوت المبارک کو سراب کی طرح نایاب اور زمانے سے مفقود
لکھا ہے۔ لیکن اس کا ایک مطبوعہ نسخہ رضا لائبریری رام پور میں موجود ہے۔ اس
کا کاغذ بالکل بوسیدہ ہو گیا ہے اور اس کے علاوہ کسی دوسرے نسخے کے وجود کا
مجھے علم نہیں ہے۔ سناتے کہ اب اس نسخے کی مرمت بہت عمدہ کر دی گئی ہے۔
بہی۔ مطبع سلطانی کلکتہ ۱۲۹۵ھ۔ صفحات ۴۰۸

اس کتاب میں چھ باب ہیں پہلے تین بابوں میں سُرِ تال اور ناچ کا بیان ہے۔
چوتھے باب میں زہر کے ناچ کی چھتیس صورتیں اور رادھا کھنیا کے دو طرح کے قصے ہیں۔
پانچویں باب میں بھنڈتیاں اور مضحک نقلیں ہیں۔ اس باب میں ہیلیاں، شعبے اور
لطیفے بھی ہیں۔ چھٹے باب میں سلیموں، محلوں، شہزادوں، شہزادیوں، بہودوں، دامادوں
مرشد زادوں، صاحبانِ عالم پسند یعنی بادشاہ کے بلند مرتبہ ملازموں اور باغوں کے اڈوٹاؤں
کے خطابات ہیں۔ اسی باب میں جانوروں، چڑیوں، مچھلیوں، درختوں، کوٹھیوں، کمروں،
تالابوں کے خطاب اور نام بھی ہیں۔ خطابوں کی تعداد کم و بیش بارہ سو تک پہنچ گئی ہے۔
داعبد علی شاہ کو نام رکھنے اور خطاب دینے کا غیر معمولی ملکہ تھا اور ان کا حافظہ اتنا قوی تھا

کہ وہ ان سب ناموں اور خطابوں کو یاد رکھتے تھے اور ہر چیز کا اس کے نام یا خطاب سے ذکر کرتے تھے۔ اسی باب میں مردوں اور عورتوں کی حفظ عصمت کے لیے 'قانون اختری' اور بیگیوں اور ملازموں کے لیے ہدایتیں بھی ہیں۔

تیسرے باب میں ناپاکی کی اکس گنتوں کی تصویریں بنائی گئی ہیں۔ یہ امر قابل لحاظ ہے اور بادشاہ کی محتاط طبیعت کا ثبوت ہے کہ یہ سب تصویریں مردوں کی ہیں، حالانکہ کئی گشتیں ایسی ہیں جو عورتوں ہی پر زیب دیتی ہیں مثلاً 'ناز گت'، 'غمرہ گت'، 'پیشوا زگت'، 'رادھا گت'، 'گھو گھٹ گت'۔

پانچویں باب میں بھانڈوں کے لیے جو نقلیں لکھی گئی ہیں ان میں ایک نقل شاعر کی ہے۔ اس نقل میں چھپیس شاعر اردو کے اور چھپیس فارسی کے کل باون شاعروں کے نام اور ہر شاعر کا ایک مطلع لکھا گیا ہے بعض شاعروں کے بارے میں ایک دو باتیں بھی لکھ دی گئی ہیں اور بعض کے متعلق یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ان کی نقل کس طرح کرنا چاہیے۔ فریاد اور خیالی مشاعرے کئی آدمیوں نے لکھے ہیں، جن میں مرزا فرحت اللہ بیگ کا "۱۲۶۱ھ کا ایک یادگار شاعرہ" ایک شاہکار کی حیثیت رکھتا ہے۔ ان سب شاعروں کی بنیاد و اجداد علی شاہ کے اسی مشاعرے پر قائم ہے۔

دوسرے علی شاہ نے جو بھنڈ تیاں اور نقلیں لکھی ہیں ان میں بعض غیر سنجیدہ اور فحش ہیں۔ بھانڈوں کو ہر طرح کی محفلوں میں جانا اور ہر طبقے کے لوگوں کو خوش کرنا ہوتا تھا۔ کبھی کبھی دہات میں گنواروں کی محفل میں نقل کرنا ہوتا تھا اس لیے ان کے واسطے ہر طرح کی نقلوں کی ضرورت ہوتی تھی۔ یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ غیر سنجیدہ اور فحش نقلیں لکھنے کی سنجیدہ محفلوں میں دکھائی جاتی تھیں۔ مشاعرے کی نقل کے آخر میں جرات کی آمد جس طرح دکھائی گئی ہے وہ اس وقت کے سنجیدہ ذوق پر گراں ہے۔ مگر سنجیدگی کا محل اور معیار بدلتا رہا ہے۔ شیخ سعدی، امیر خسرو، ملا جامی کے سنجیدہ و درویش منش بزرگوں کی تصنیفوں میں ایسی ایسی چیزیں ملتی ہیں جن کو دیکھ کر آج کی تہذیب

انکھیں بند کر لیتی ہے۔

ناجو (اردو) مطبع سلطانی کلکتہ ۱۲۸۶ھ صفحات ۲۷۸
یہ کتاب مختلف راگوں اور راگینوں میں بادشاہ کی خاص محل عالم کے بنائے ہوئے گیتوں کا مجموعہ ہے۔ اس کتاب میں پندرہ باب اور ایک سو چالیس فصلیں ہیں۔ موضوع کی مناسبت سے باب کے لیے صدا اور فصل کے لیے آواز کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ کتاب کے مختصر دیباچے میں مصنف نے لکھا ہے کہ جو چیزیں میری تصنیف سے ہیں یا جو مجھ کو یاد تھیں ان کو ۱۲۸۵ھ میں لکھ دیا تاکہ مبتدیوں کو گانے میں آسانی ہو۔ میرا تخلص اردو اور فارسی میں اختر ہے لیکن اس کتاب میں جو کہ ہندی، بھاکا اور سنسکرت سے ملو ہے اختر کو اختر کر دیا کہ ان زبانوں کے لہجے سے بے ربط نہ معلوم ہو۔ مصنف نے اپنا نام ”علی بن امجد شاہ اودھ“ لکھا ہے۔ کتاب کی تالیف ۱۲۸۵ھ میں شروع ہوئی اور ۱۲۸۶ھ میں یہ تمام ہو کر بھپی۔

عالم کے گیتوں کی تعداد اختر کے گیتوں سے زیادہ ہے۔ دو چار گیت دوسرے مشہور ماہرین موسیقی کے بھی ہیں۔ اختر کے دو گیت نقل کیے جاتے ہیں ایک دادرا

لے عالم۔ نواب محزرہ عظمیٰ عالم آرا بیگم معروف بہ نواب بادشاہ محل صاحبہ کا تخلص عالم تھا۔ ان کا دیوان بیاض عشاق کے تاریخی نام سے پہلی بار کلکتہ میں ۱۲۸۲ھ میں چھپا۔ اس کے بعد لکھنؤ میں مطبع ناعمی اور مطبع ثمر ہند میں بھی چھپا گیا۔ یہ تینوں ایڈیشن میرے کتابخانہ میں موجود ہیں۔ عالم کی ایک مثنوی بھی بہت مقبول ہوئی۔ اس کا پہلا اور سب سے اچھا ایڈیشن کلکتہ میں چھپا تھا۔ اس کا ایک ناقص الطرفین نسخہ میرے ذخیرہ کتب میں موجود ہے۔ اس کے علاوہ اس کے دو اور ایڈیشن بھی موجود ہیں جو مثنوی عالم کے نام سے مطبع ناعمی لکھنؤ میں ۱۸۸۵ء ۱۳۰۲ھ اور ۱۸۹۱ء مطابق ۱۳۰۹ھ میں چھپے تھے۔ آخری بادشاہ اودھ کی یہ عالی خاندان ملکہ عالم موسیقی کی بھی ماہر تھیں جیسا کہ ان کے بنائے ہوئے سیکڑوں گیتوں سے ظاہر ہے۔

کلکے میں لکھنؤ کی یاد میں کہا گیا ہے :

آستانی۔ بالمشتر بن کے بستیا آن پرے سب سے دور
انتر۔ توہ سے کہوں اکھتران لے ہماری لکھنؤ چلیو جردر (ص ۱۳۹)
دوسرا گیت ایک ٹھمری ہے :-

آستانی۔ سب راہ باٹ میں ڈھونڈ پھری بندرا بن میں ہوسا زور یہ جنگل جنگل
بھیوسن پائی اسی بانسریہ۔

انتر ایک دھرت دھرت لٹ پٹ گیوین گھٹواگا گراٹ کیو کر پکرت گنگن اچٹ گیوچل
پھاٹڈ دے اکھتر بانگریہ۔ (ص ۱۴۰)

گیتوں میں کھنیا کا نام اکثر آتا ہے، جن کو پیار میں کاتھ اور کاتھا بھی کہا جاتا
ہے اختران لفظوں کو بغیر ہائے مخلوط کے کان اور کانا لکھتے ہیں۔

دھن (اردو) مطبع سلطانی کلکتہ ۱۲۹۰ھ صفحات ۱۳۸

اس کتاب میں بھی داجد علی شاہ اور ان کی خاص محل عالم کے گیت ہیں عالم
کے گیت تعداد میں اختر کے گیتوں سے زیادہ ہیں۔ اس کتاب میں بارہ تصویریں یعنی
فصلیں ہیں۔ ۸۲ صفحوں میں اصل کتاب اور ۵۶ صفحوں میں قطعات تاریخ ہیں۔ اس
طرح صفحات کی مجموعی تعداد ۱۳۸ ہے۔ یہ کتاب ۱۲۸۹ھ میں تالیف اور ۱۲۹۰ھ
میں طبع ہوئی۔ کتاب کے مختصر دیباچے میں بادشاہ کہتے ہیں کہ اس سے پہلے گیتوں
کی ایک کتاب ناجو کے نام سے علم موسیقی کے نکتہ سنجوں کو پیش کر چکا ہوں۔
وہ کتاب اس قدر راقم کے زیرِ بحث رہی ہے کہ تین چار سو بے زبان اشخاص بڑے
خوش بیان ہو گئے ہیں۔ اس درس و تدریس میں جو چیزیں یاد آئیں یا نئی تصنیف ہیں
ان کو ۱۲۸۹ھ میں ان ادراقی میں مرتب کر کے دھن نام رکھا۔ امید ہے کہ صاحبانِ بصیر
الفاظ کے قبح پر نظر نہ کریں گے اور رقموں کی ترکیبوں کو سننے کے بعد پند کریں گے، غرض
نامر بوط الفاظ دیکھ کر مدح و اس نہ ہو جائیں گے۔

عالم کے بعض گیت گھروں میں اب تک گائے جاتے ہیں مثلاً
 ہے موسم برسات سیتاں بن گھٹا ڈراتی ہے (ص ۵۷)
 میرا ہریالا بنا آ بیٹھا دالان کے بیچ (ص ۶۷)

عالم کا ایک گیت یہ ہے :

آستانی - ہل مل دنیا کو جائے ری نندیا۔
 انتر - گگری میں چھوڑ آئی کنویں کی جگت پر پتی کمر بل کھائے ری نندیا (ص ۵۷)
 اکبر الہ آبادی کے مندرجہ ذیل شعر کی بنیاد یہی گیت ہے :-
 اب نہ ہل مل ہے نہ اب دنیا کا دم بول ہے
 اک نندیا تھی سو وہ بھی داخل اسکول ہے
 اختر نے ایک گیت میں فرنگیوں کے مظالم کی طرف اشارہ کیا ہے :-
 آستانی - پھرنگی بہت دکھ دینو اکھتر
 انتر - لوٹا مارا دارا اُجارا کون جن سکھ دینو اکھتر (ص ۶۵)
 ایک گیت میں بادشاہ نے سلطنت جانے پر غم کا اظہار کیا ہے :-
 آستانی - ساجن آن بن ناہیں پرت موہے چین
 انتر - اکھترنگو اکھتر کلے گنواو کیسے کٹے دن رین (ص ۳۶ حاشیہ)
 پیارخان کا ایک گیت ہے جو بادشاہ کی شادی میں گایا گیا تھا۔ دھیر پور کھاج پرتالہ
 آستانی - تکھت بکھت بلی دا جڈلی سا ہنزا کو بیاہ وچو جگ مگ بھی سب سو
 ہل گاؤں۔

سین چائی - بنا بنی کو سنجوگ سلطان عالم کے سنگ (ص ۷۱)

چنچل نازنین (اردو) مطبع سلطانی کلکتہ ۱۲۹۷ھ

موسیقی اور اس کے متعلقات اس منظوم کتاب کا موضوع ہے۔ یہ ۱۲۹۵ھ
 میں تصنیف ہوئی اور دو برس کے بعد واحد علی شاہ کی کتاب ملاذ الکلمات کے ساتھ

۱۲۹۰ھ میں چھاپی گئی۔ اس میں اٹھاسیس عنواؤں کے تحت میں دوسو تانے شعر ہیں۔ اس میں ناجو، دھن اور بنی کا ذکر موجود ہے۔ کتاب کے ابتدائی حصے میں بادشاہ نے اپنی خانگی پریشانیوں کا ذکر بے حد تلخ لہجے میں کیا ہے۔
رسالہ موسیقی۔ منشی مظفر علی ہستیر کے دیوان گلستان سخن میں ذیل کا قطعہ تاریخ اس عنوان سے ہے "تاریخ رسالہ موسیقی تصنیف حضرت سلطان عالم"

طرفہ رسالہ کہ یہ علم غناست رنجہ خامہ شاہ جہاں
سال رقم کرد رقم خامہ ام "زمزمہ بلبیل باغ جنان"
اس سے رسالے کا سال تصنیف تو معلوم ہو گیا، مگر اس کا نام معلوم نہیں
گلستانہ عاشقان (اردو)۔ مطبع محمدی لکھنؤ ۱۲۵۹ھ، صفحات ۲۳۱

یہ غزلیات کا ردیف دار دیوان بادشاہ کی دلی عہدی کے زمانے میں مرتب ہوا اور تقریباً بیس برس کی عمر میں شائع ہوا۔ اس کے سرورق پر خط طرز میں مصنف کا نام یوں لکھا گیا ہے "ابو المنصور سکندر قدسلیماں چشم صاحب عالم دلی عہد مرزا محمد واجد علی خاں بہادر دام اقبالہ" گارساں دناسی اور بعض دوسرے لکھنے والوں نے اس دیوان کا نام 'فیض بنیان' بنایا ہے۔ اس لیے کہ اس کے سرورق پر 'دیوان فیض بنیان' کے الفاظ موجود ہیں۔ لیکن یہاں 'فیض بنیان' دیوان کا نام نہیں ہے بلکہ اس کی صفت ہے۔ اس غلط فہمی کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ دیوان کے سرورق پر نمایاں طور پر اس کا نام نہیں لکھا گیا ہے بلکہ مصنف کے نام کے گمراہ ایک حلقے میں کرامت علی اظہر کا یہ قطعہ درج کیا گیا ہے:

چوں صاحب عالمی سکندر قدس
فرمود کلام فیض آگین مطبوع
اظہر نبوشت خوش بوقت طبعش
"گلستانہ عاشقان کلام مطبوع"

۱۲۵۹ھ

بادشاہ نے بنی کی فہرست کتب میں اپنی ایک کتاب کا نام "گلستانہ عاشقان"

بتایا ہے اور اظہر کے قطعہ تاریخ سے ظاہر ہے کہ یہ اسی دیوان کا نام ہے۔
اس دیوان کی متعدد غزلیں بعض دو سکر شاعروں کی طرح میں بھی گئی ہیں
اور مقطعے میں اس شاعر کا تخلص بھی آگیا ہے۔ ایک غزل کے مقطعے میں میر خلیق کے
سلاموں کا ذکر بھی آگیا ہے۔

حاصلہ سے روئے جو اختر تو کیا عجب

رتبہ ملے غزل کو سلام خلیق کا

ایک غزل کا مقطع نہایت اہم ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ صاحب علی شاہ کو نو عمری ہی
میں اس کا احساس تھا کہ ادھر کی بادشاہی بہت دن چلنے والی چیز نہیں ہے فرماتے ہیں:

ٹٹ پونجیوں کا اخترے خالے میں دورہ ہے

دگان اٹھا ڈالو بازار نہ ٹھہرے گا

یہ دیوان مصنف کی فرمائش اور مرزا احمد علی خاں قبول کی وساطت سے چھاپا
گیا تھا۔ ہر غزل پر اس کی بحر اور حاشیے پر اس کے ارکان درج ہیں۔

دیوان دوم (اردو) مطبوعہ صفحات ۲۸۸ بہت بڑی تقطیع $15\frac{1}{4} \times 10\frac{1}{2}$

یہ غزلوں کا ردیف دار مجموعہ ہے۔ اس کا پہلا صفحہ سادہ ہے۔ دوسرے صفحے
میں ایک تصویر ہے، جس میں بادشاہ تخت شاہی پر رونق افروز ہیں اور پہلو میں اہل
دربار کھڑے ہیں۔ تیسرے صفحے سے دیوان شروع ہوتا ہے۔ پہلا شعر حب فیل ہے۔

تری الفت میں ہر سلطان کو رتبہ ہے گدائی کا

سوا تیرے کسے زمیندہ ہے دعویٰ خدائی کا

دوسرے صفحے پر تصویر کے اوپر ایک سطر اور نیچے دو سطریں کتاب چھپنے کے بعد رخ و دشانی
سے لکھی گئی ہیں۔ اسی طرح پوری کتاب میں ردیفوں کے نام اور بادشاہ کا تخلص خنی
سے لکھا گیا ہے۔ مطبع کا نام اور طباعت کا سال کہیں درج نہیں ہے۔ لیکن کتاب کا
کاغذ، کتابت کا انداز، بین السطور فاصلہ اور سب سے بڑھ کر اس کا سائز یہ سب

چیزیں بتاتی ہیں کہ یہ دیوان عہد شاہی میں لکھنؤ کے شاہی مطبع میں چھاپا گیا۔
 ہر صفحے کے حاشیے پر حیرت اور تاج کے نیچے ایک حلقہ میں ہر غزل کی بحر اور مطلع
 کے مصرعوں کے درمیان میں غزل کے شعروں کی تعداد درج کی گئی ہے۔ آخر میں یہ عبارت
 ہے ”باہتمام شیخ مد علی خانہ زاد قدیم امین الدین تحریر نمود“
 بادشاہ کے ایک دیوان کا نام سخن اشرف ہے۔ بعض فرینوں سے معلوم ہوتا ہے
 کہ سخن اشرف ہی دیوان ہے۔

دیوان ثالث (اردو) مطبوعہ صفحات ۱۴۱

یہ نو اسی غزلوں کا ردیف دار دیوان ہے۔ ایک غزل میں نواب اختر محل کا کہ
 ایک میں محبوبہ عالم کی تعریف کی گئی ہے۔ پہلا صنف سادہ ہے، دوسرے پر تحریر ہے۔
 ”دیوان ثالث تصنیف مبارک حضرت... سلطان عالم محمد واجد علی شاہ اودھ غازی خلد اللہ علیہ السلام
 مطبع کا نام اور سال طباعت درج نہیں ہے اور کوئی قطعہ پایہ
 بھی نہیں ہے۔

نظم فامور (اردو) مطبع سلطانی کلکتہ ۱۲۸۷ھ صفحات ۳۰۶

نظموں کے اس مجموعے میں تین دفتر ہیں دفتر اول میں بیش تر منظوم، قطع اور
 خط ہیں جن سے بادشاہ کی خانگی زندگی کا حال معلوم ہوتا ہے۔ دفتر دوم میں محسن،
 رباعیاں، سلام اور نوحے ہیں۔ اس کے ابتدائی حصے میں ایک رباعی فارسی اور ایک
 عربی زبان میں ہے۔ ایک ایک شعر حبشی، انگریزی، بنگالہ، پنجابی، بجا کا اور کشمیری زبانوں
 میں اور تین چار جملے ترکی زبان میں ہیں۔ دفتر سوم ۳۸ غزلوں کا ردیف دار دیوان ہے
 اس کا سال ترتیب ”کا کل پریشاں خیالی“ سے ۱۲۸۵ھ اور سال طباعت ”نظم نامہ“
 سے ۱۲۸۷ھ نکلتا ہے۔ اس دیوان میں کئی غزلیں آتش، میر، حافظ اور دوسرے اساتذہ
 کی مشہور غزلوں کی زمین میں کہی گئی ہیں۔ میم کی ردیف میں اکثر بیگمات کے نام ہیں۔
 ایک شعر میں بادشاہ نے اپنی زوجہ کوئی کی اور ایک شعر میں اپنی زبان کی تعریف کی ہے

اس قدر جلدی غزل کہنا بہت دشوار ہے ۔ کب کوئی دنیا میں اختر آپ سا پیدا ہوا

بولتا ہے بادشاہ اردے بازار خاص ۔ اختر خوش لہجہ داہے یزباں بے مثال
 صد ۲۸۰-۲۹۵ پر قطعات تاریخ ہیں، صد ۲۹۶-۳۰۳ میں بادشاہ کے مصرعوں پر درخش
 اور قانع کی تضمین ہے، صد ۳۰۵ پر نواب امیر علی خان امیر کی ایک غزل بادشاہ کی طرح
 میں ہے اور صد ۳۰۷ پر عیش کا قطعہ بہ مدح سلطان صنعت اظہار المصنوع تنسیق الصفات
 میں ہے ۔

دیوان بے نام (سخن اشوت) صفحات ۲۸۸، بہت بڑی تقطیع
 یہ غزلیات کا ردیف دار دیوان ہے۔ اس کا پہلا صفحہ سادہ ہے۔ دوسرے صفحے
 پر ایک تصویر ہے جس میں بادشاہ تخت شاہی پر رونق افروز ہیں اور پہلو میں اہل دربار کھڑے
 ہیں۔ تیسرے صفحے سے دیوان شروع ہوتا ہے۔ پہلا شعر حسب ذیل ہے :

تری الفت میں ہر سلطان کو رتبہ ہے گدائی کا

سو اتیکے کسے زیندہ ہے دعویٰ خدائی کا

دوسرے صفحے پر تصویر کے اوپر ایک سطر اور نیچے دو سطر کی کتاب چھینکے کے بعد سرخ روشنائی
 سے لکھی گئی ہیں۔ اسی طرح پوری کتاب میں ردیفوں کے نام اور بادشاہ کا تخلص سرخی سے
 لکھا گیا ہے۔ مطبع کا نام اور طباعت کا سال درج نہیں ہے۔ لیکن کتاب کا کاغذ، کتابت
 میں اسطورنا فاصلہ اور سب سے بڑھ کر کتاب کا سائز، یہ سب چیزیں بتاتی ہیں کہ یہ دیوان عہد
 شاہی میں لکھنؤ کے شاہی مطبع میں چھاپا گیا۔ حاشیے پر تاج اور حیر کے نیچے ایک حلقے میں
 ہر غزل کی بحر اور مطلع کے مصرعوں کے درمیان میں غزل کے شعروں کی تعداد درج کی گئی
 ہے ۔

آخر میں یہ عبارت ہے ”باہتمام شیخ مد علی خان زاد قدیم امین الدین تحریر نمود“
 بادشاہ کے ایک دیوان کا نام سخن اشوت معلوم ہے۔ قیاس کہتا ہے کہ یہ نام اسی

بے نام دیوان کا ہے۔

فصل مضمون (اردو) مطبع سلطانی، کلکتہ ۱۲۸۱ء صفحات ۴۷۶ تقطیع کلاں۔
بادشاہ کی نظموں کے اس مجموعے میں تین دفتر ہیں۔ دفتر اول میں وہ نظمیں
ہیں جو خاص موقعوں پر کہی گئی ہیں۔ ان میں زیادہ تر سبکیوں کے نام منظوم خطبہ شکل مثنوی
ہیں، جن سے بادشاہ کی خانگی زندگی پر بہت روشنی پڑتی ہے۔ ایک نظم میں ایک شاعر
سے خطاب ہے جس کا تخلص ماہی ہے۔ اس نے ایک مدحیہ قصیدہ پیش کیا تھا جس کے
کے بارے میں بادشاہ نے کہا ہے کہ میں اس تعریف کا مستحق نہ تھا اور معذرت کی ہے
کہ اپنی محدود آمدنی میں ایسی اچھی نظم کا کافی صلہ نہیں دے سکتا۔

دفتر دوم میں رباعیاں، خمس، سلام، نوے اور مرثیے ہیں جن کا موضوع بالعموم
واقعہ کربلا اور شہادت امام حسین ہے۔

دفتر سوم میں ایک سو بائیس غزلیں ہیں، جن میں چند غزلیں فارسی زبان میں
ہیں اور چند غزلیں میں سبکیوں کے نام ردیف قرار دیے گئے ہیں۔

فصل مضمون اس کتاب کا تاریخی نام ہے، جس سے اس کا سال ترتیب
۱۲۷۶ ہجری نکلتا ہے۔ ہمارا حاجے گویاں ثاقب نے اس کا حسب ذیل قطعہ تاریخ کہا ہے:

بہر تصنیف قمر مضمون توجہ ساختہ	ظہر حق داجہ علی سلطان عالم میں پناہ
حکم طبعش ادب باصر غلام دولہ زود تر	تا کہ فیض درجہاں باشد چو نور ہر ماہ
در زمان سعد شد تعمیل آل امر رافع	چوں بہ تائید ائمہ وز عنایات الہ
صبح دم ثاقب ندائے غیب در گوشم رسید	باد مروح و جان دل روشن کلام بادشاہ

۱۲۸۱ ہجری

لے ضغالم الملک مرزا احمد حسن خاں بہادر خلف علی رضا خاں خواہر رقم خوش نویسیوں کے سر دفتر تھے۔
بادشاہ کی اکثر کتابیں ان کے اہتمام میں چھپیں لے زبدۃ الکوائف (قلمی)

اس کتاب میں داہد علی شاہ کی ایک غزل قابل ملاحظہ ہے۔

میسے دم سے ہوئی دنیا میں بنائے غربت
ملک مال و زن و فرزند و ریاست چھٹا
مرض ہجر وطن کی نہ ہوئی کچھ تدبیر
زلفت تہمت پھنسنے آن کے کلکے میں
شہر کس کا ہے وطن کس کا مرانا نام ہے
یہ تمنا نہ ہے زیت میں لے بار خدا
ظلم ظالم سے نہ مفلس کوئی بے گھر ہوئے
یاد آتا ہے وطن امن صحرا سے مجھے
ہاں وطن دیکھوں تو شاداں ہو دل اور مرا
وسعت بخل سے بڑھ کر ہے کہیں حب وطن
ہے وطن خواب کہ منزل بنی جائے غربت
مجھے مظلوم بھی کہتے ہیں دوائے غربت
خضر عشق بتائے گا دوائے غربت
ہم نے زندان بھی دیکھا ہوئے غربت
بندہ درگاہ اللہ گدائے غربت
لکھنؤ پھر مجھے دنیا میں دکھائے غربت
کسی مظلوم کو یا رب ستائے غربت
جنگلوں میں مجھے بھاتی ہوئے غربت
یہ بھی ممکن ہے کہ ردوئوں کو ہنسائے غربت
تنگی گور سے بدتر ہے فضاے غربت

یوں تو شاہان جہاں پر ہے پڑا وقت مگر
ختم ہے اختراے کس پہ جفاے غربت

ملک اختر۔ (اردو فارسی) مطبع سلطانی ملکہ، ۱۲۹۶ھ۔ صفحات ۲۰۴

مصنف نے بتایا ہے کہ ملک اختر کتاب کا تاریخی نام ہے، جس کے عدد ۱۲۹۱ ہوتے ہیں۔ اس کے ساتھ یہ بھی کہا ہے کہ ماہ محرم ۱۲۹۵ھ میں میں نے اپنی متفرق نظم و نشر کو مرتب کیا اور اس مجموعے کی تالیف کا یہی سنہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔ کتاب کے نام کی مناسبت سے ہر باب ایک صوبہ قرار دیا گیا ہے۔ یہ صوبے چھ ہیں جن کے شمولات حسب ذیل ہیں۔

صوبہ اول میں وہ بکورد اوزان جمع کر دیے گئے ہیں جو ماتمی نظموں کے لیے مناسب ہیں اور ہر ایک کی مثال کے لیے مصنف نے دو دو شعر کہہ دیے ہیں۔ اکثر صورتوں میں اس راگ یا راگنی کا نام بھی لکھ دیا ہے جس میں کسی خاص بحر یا وزن کی ماتمی نظم کو پڑھنا چاہیے۔ ان بکورد اوزان کی مجموعی تعداد چوالیس ہے۔

صوبہ دوم میں ایک سو ایک رباعیاں اور قطعے ہیں۔ بچا نوے رباعیاں آئمہ اور شہدائے ذکر میں ہیں۔ ان میں چند قطعے ایسے ہیں جن کی رویتیں بیوں کے نام ہیں۔ صوبہ سوم میں فردیں، سطلے وغیرہ ہیں اور آخر میں ایک شخص ہے۔ شاہ ایران ناصر الدین شاہ قاجار کے ایک فارسی مرثیے کو اردو کے مصرعے لگا کر محسن کر دیا ہے اس مرثیے کا مطلع یہ ہے۔

خنجر شمر بخون شہ خوباں تشنہ : خنجر شہ بہ دم خنجر براں تشنہ
صوبہ چہارم میں سترہ سلام اور چوبیس غزلیں ہیں۔ ایک سلام میں ایک سوا دون شعر ہیں اور اس میں عربی کے غیر مانوس لفظوں کو قافیہ کیا ہے۔ مثلاً ماطلہ، مصادلہ، معافہ، معائزہ، معاسرہ، مفاعمہ، مقاسطہ، مقارعہ اور حاشیے پر ان لفظوں کے معنی لکھ کر لغت کی کتابوں کا حوالہ دے دیا ہے۔ ایک سلام میر انیس کے اس شہور سلام کی زمین میں کہا ہے جس میں زمینوں، جبینوں، حسینوں وغیرہ قافیہ اور گور دلیف ہے اور جس کا یہ شعر بہت مشہور ہوا۔
یہ چھڑیاں نہیں ہاتھوں چنیعت پیر نے : چٹائے جامہ اصلی کی آستینوں کو

اس سلام کی شہرت بادشاہ تک پہنچی اور رفعت الدولہ نے ان سے اس زمین میں سلام کہنے کی درخواست کی جس کو بادشاہ نے قبول کیا، جیسا کہ ذیل کے مصرعوں سے ظاہر ہے۔

کیا یہ رفعت دولت نے عرض وقت سحر

کہ اس زمین میں اختر بھی سیر فرمائے

یہ بلکہ مصرع فکر انیس عرض کیا

”چٹائے جامہ اصلی کی آستینوں کو“

پسند آیا یہ مصرع کہا کر دنگی فکر
 کمال طبع دکھاؤں گلا خردہ میوں کو
 بادشاہ نے اس زمین میں پچاس شعر کا سلام کہا ہے جس میں اس شعر آستینوں کے قافیے میں
 ہیں مگر ان میں کوئی شعر قابل ذکر نہیں ہے۔ اس سلام کے تین شعر درج کیے جاتے ہیں۔
 مناسب ایسا ہے دنیا کے درمیوں کو
 کہ پاس آن کے جا چیں مئے نگینوں کو
 مہ سپہر امامت کا حال کر کے بیاں
 فلک بنادیا اختر نے ان زمینیوں کو
 مری طرح سے تردد کریں تو حاصل ہو
 اجارہ لیتے ہیں شاعر اگر زمینیوں کو
 ان میں سے پہلے شعر میں 'دور' اور 'پاس' میں صنعت تضاد ہے۔ دوسرے شعر میں مہ، سپہر،
 فلک، اختر میں صنعت مراعاة النظیر ہے۔ تیسرے شعر میں تردد، حاصل، اجارہ، زمینیوں میں
 رعایت لفظی ہے، جو مراعاة النظیر کا دوسرا نام ہے۔ ان صنعتوں کے علاوہ ان شعروں میں
 بھی کوئی خوبی نہیں ہے۔

چند منتخب شعر اور سنیے :

کماں میں تیروں کو رکھ کر ہوئے جو لیس شریہ
 سکینہ ہسم گئی دیکھ کر لعینوں کو
 عجب نہیں ہے زرا ناخداے عالم سے
 شکن سے صاف رکھے بحر کی جبینوں کو
 صحابہ عرض یہ کرتے تھے روز عاشورا
 سپر کریں گے دم جنگ اپنے سینوں کو
 ہوانہ حضرت عیسیٰ کو یہ عروج نصیب
 وہ کون ہے جو کرے طے ستم گزریوں کو
 صوبہ ہیرام میں جو غزلیں شامل ہیں ان میں بعض غیر مانوس بجدوں میں اور بعض بادشاہ
 کی ایجاد کی ہوئی بجدوں میں ہیں۔ ایک غزل کا مطلع ایسے حسب حال کہا ہے :
 مصیبت میں، الم میں، رنج میں، آفت میکا ہش میں
 رہے گا بخم اختر تا کجا اے جو رخ گرد شبنم میں
 صوبہ پنجم میں ایک فارسی مثنوی اور چند منظوم خطوط وغیرہ ہیں۔ ان نظموں کی تعداد تیرہ ہے۔

صوبہ ششم میں فارسی اور اردو کی کئی نثر تحریریں ہیں۔ ایک میں قانون بحری^۱ یعنی شاہی ماہی خانے کے ہتھم کے فرائض، جرمانہ اور برطانی وغیرہ کے احکام ہیں ایک میں اپنے کارندے اور دوست کے مخصوص فرائض بتائے ہیں جن میں یہ بھی ہے کہ "بارہ سے طاؤس دسی ہر دقت تیار رکھے" ایک تحریر میں یہ بتایا ہے کہ خردوں کو بزرگوں سے کس طرح پیش آنا چاہیے۔ اس تحریر کا عنوان 'اندز اختری' اور اس میں اٹھارہ دفعات ہیں۔ ایک تحریر میں اپنے جانور خانے کی دیکھ بھال اور صفائی وغیرہ کے بارے میں ذمہ دار جعدار کو ہدایتیں کی ہیں۔ اس تحریر میں ضمناً جانور خانے کے چند شعبوں کے نام بھی آگئے ہیں یعنی طوطا خانہ، میمون خانہ، خرس خانہ، شیر خانہ، فیل خانہ، مینڈھے خانہ، تازی خانہ، باز خانہ، کبوتر خانہ، چھتے خانہ۔ آخری تحریر شہ زادہ جہاں قدر میرزا محمد واجد علی ہمدانی کی عرضداشت کا جواب ہے۔ اس میں بادشاہ نے ان بے پردائیوں، زیادتیوں، وعدہ خلافیوں، حق تلفیوں اور دل آزاریوں کا ذکر کیا ہے جن کا انگریز اس کتاب کیا کرتے تھے بادشاہ کا یہ بیان نہایت اہم ہے۔ اس فارسی تحریر کا ملخص اردو ترجمہ کتاب کے ضمیمہ ۸ میں لکھ دیا گیا ہے۔

کتاب کے اسی حصے میں وہ شرعی مسائل بھی ہیں جو بادشاہ کے استفسار پر ان کے درباری عالم دین قائمۃ الدین مولوی مرزا محمد علی صاحب نے بیان کیے تھے۔ ان کی تعداد سینتالیس ہے۔

اس کتاب کے فارسی دیباچے میں بادشاہ نے اپنی چودہ پشتوں کے نام لکھے ہیں۔ بادشاہ کی کتاب بنی اور امیر علی خاں کی کتاب وزیر فاضلہ میں زیر نظر کتاب کا نام اختتام ملک بتایا گیا ہے لیکن کتاب کے سرورق پر اور دیباچے میں اس کا نام

۱۔ بنی کی فہرست مکتب میں غالباً اسی قانون بحری کو ماہی نامہ کا نام دیا ہے۔
۲۔ بادشاہ نے یہ شکایتیں ریاض القلوب کے ضمیمے میں بھی بیان کی ہیں۔

ملک خاتم ہے۔

قصائد مبارک (اردو و فارسی) - مطبع سلطانی، کلکتہ - ۱۲۷۸ھ ص ۳۲۰ بہت بڑی تقطیع "۱۵" x "۹ ۱/۲"۔

دیوان مبارک اول (اردو) - مطبع سلطانی، کلکتہ - ۱۲۷۸ھ ص ۹۹۲ بہت بڑی تقطیع "۱۵" x "۹ ۱/۲"۔

بادشاہ کی نظموں کے یہ دو مجموعے ایک جلد میں جلد ایک ساتھ شائع کیے گئے۔ دونوں کی منقش لوحیں الگ الگ ہیں اور دونوں کے صفحوں پر شمار کے ہند سے جدا جدا ہیں۔ یعنی یہ دو مستقل کتابیں ہیں، جن کو ایک جلد میں مجلد کر دینے سے ایک کتاب نہیں سمجھا جاسکتا۔ پہلے مجموعے میں دو قصیدے ہیں، ایک بہت طولانی قطعہ ہے اور ایک سندس منقبت میں ہے۔ قصیدے حضرت علی کی مدح میں ہیں، ایک اردو میں ایک فارسی میں قطعہ عراق کے روضہ کاظمین کی تعریف میں ہے اور منقبت میں حضرت علی سے حاجت روائی اور مشکل کشائی کی درخواست کی گئی ہے۔ یہ دونوں نظمیں اردو میں ہیں۔ فارسی قصیدہ دزیم نامہ ص ۳۰۲-۳۰۳ میں نقل کر دیا گیا ہے۔

دوسرا مجموعہ نہایت ضخیم ہے ۸۹۹ صفحوں میں ردیف و داغ لیں ہیں اور تیرا نوے صفحوں میں رباعیاں، مطلع، فردس، متفرق نظمیں، منظوم خطوط وغیرہ اور آخر میں قطعات تاریخ ہیں۔ مرزا سیتا عیش کے قطعہ تاریخ کے عنوان میں یہ الفاظ بھی ہیں "تاریخ طبع ثانی دیوان مبارک سلطانی" اور قطعے کا پہلا اور آخری شعر حسب ذیل ہے۔

نظم سلطان کہ از عطاء سلطان
ہاقت فرمود سال طبعش اینک
اس خلعت طبع باز چوں پوشیدہ
"صبا بے دو آتشہ کنوں پوشیدہ"

عنوان میں طبع ثانی، پہلے شعر میں 'باز' اور آخری شعر میں دو آتشہ کے الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ اس مجموعے کا دوسرا ایڈیشن ہے معلوم نہیں پہلا ایڈیشن کب شائع ہوا۔ اس مجموعہ غزلیات میں یہ ظاہر چار دیوان شامل ہیں۔ ردیف الف کی غزلیات ان

عنوانوں کے تحت درج کی گئی ہیں۔ ردیف الف دیوان مبارک اول صد ۵۰، ردیف الف دیوان مبارک دوم، صد ۵۰-۱۳۱، ردیف الف دیوان مبارک سوم، صد ۱۳۲-۱۷۸، ردیف الف دیوان مبارک چہارم، صد ۱۷۹-۱۹۹۔ ردیف بائے مؤحدہ میں یہ عنوان ملتے ہیں، ردیف بائے مؤحدہ دیوان مبارک اول، صد ۱۹۹-۲۸۹، ردیف با دیوان مبارک دوم، صد ۲۸۹-۲۹۷۔ اس کے بعد ہر ردیف کا نام لکھ کر اس ردیف کی کل غزلیں لکھ دی ہیں۔ صد ۹۹۰ کے آخر میں تمام شد لکھا ہے۔ اس کے بعد چار صفحوں میں کچھ اور قطعات تاریخ شامل کر لیے گئے ہیں۔ مثنوی گستاخی اس مجموعے میں شامل ہے۔ صد ۹۵۷-۹۷۶۔ یہ ضخیم کتاب بادشاہ نے فورٹ ولیم میں بہ حالت نظر بندی مرتب کی۔

قصائد مبارک اور دیوان مبارک کا یہ مجموعہ درالامہام، لسان السلطان، محمود الدولہ، حمید الملک منشی محمد صفدر علی خاں بہادر کے اہتمام میں چھپا۔ دیوان مبارک کے آخر میں متعدد قطعات تاریخ ہیں۔ جن سے اس کا سال طبع ۱۲۷۸ھ نکلتا ہے لیکن دیوان کی آخری نظم قطعہ منظوم ابجد جس میں حروف ابجد کے اعداد بتائے گئے ہیں اس کے آخر میں یہ عبارت ہے ”بتاریخ دوم شہر جمادی الثانیہ ۱۲۷۹ھ“ ایں حساب منظومہ رقم گردید یہ ظاہر ہے کہ یہ نظم قطعات تاریخ کئے جانے کے بعد دیوان میں شامل کر دی گئی ہے۔

مجموعہ مبارک مسمیٰ بہ شیوع فیض (اردو فارسی)۔ مطبع سلطانی کلکتہ ۱۲۷۷ھ۔ صفحات ۲۵۰+۲۲۶=۸۷۶۔ بہت بڑی تقطیع "۱۵"×"۹½"۔

اس مجموعے میں چار باب ہیں۔ پہلے باب صد ۱-۳۲۷ میں مثنویاں ہیں جو پیش تر بیگات کے نام منظوم خطوط ہیں۔ بعض خطوط بیگات کی طرف سے بادشاہ کے نام ہیں جو

فہرٹ ولیم میں نظر بندی کے زمانے میں موصول ہوئے اور بادشاہ نے ان کو نظم کر دیا۔ ان خطوں سے وہ الم ناک حالات تفصیل کے ساتھ معلوم ہو جاتے ہیں جو غدر و عداوت کے نتیجے میں اہل لکھنؤ کو پیش آئے۔ درختوں میں لکھنؤ سے کلکتے تک بادشاہ کے سفر کے حالات بڑی تفصیل سے مل جاتے ہیں۔ ایک خط کا عنوان ہے 'شفہ عتاب آمود بنام شفاء الدولہ' ایک منظوم خط کے پیشرو بہ کے قابل ہیں۔

اشائے کیے ظلم کے اس لیے کہ راقم کو اس کی کوئی داد دے
دگر نہ زمانہ کہاں ہم کہاں ہو ادین عیسیٰ وہ عالم کہاں
زمانے میں پوچھے گا کون اب ہنر نہ عربی نہ اُردو کی لے گا خبر
وہ ہم تک یہ سامان سارا گیا

کہ اب کسب تک بھی ہمارا گیا ص ۱۲۲ باب اول
اس باب میں حتی نظمیں ہیں وہ اپنی بحر وں کے اعتبار سے آٹھ فضلوں میں تقسیم کر دی گئی ہیں۔

دوسرے باب ص ۳۲۵-۳۰۹ میں زیادہ تر مفرق اور مختصر نظمیں ہیں جو قصیدہ 'خمیس' مسدس اور قطعے کی شکل کی ہیں۔ چند سلام اور فوج بھی ہیں۔

تیسرے باب ص ۴۰۹-۳۵۰ میں علم عروض کا ایک منظوم رسالہ ہے۔ یہ رسالہ ناتمام ہے۔ آخری شعر کے ابتدائی دو لفظ کیڑوں کی نذر ہو گئے۔ باقی الفاظ یہ ہیں...

کا یہ قول ہے زحافوں کے معنی کا پھر ڈول ہے
زحافات کا بیان جن دونوں میں تھا وہ اس نسخے میں غائب ہیں۔ بادشاہ نے اس علم کی بہت سی کتابیں دیکھنے کا دعویٰ کیا ہے۔

بہت میں نے دیکھی کتاب عروض سو اس کے لکھی جواب عروض
پوچھا ص ۲۲۶ غزلیت کا ضخیم ردیف دار دیوان ہے۔ بہت سی غزلوں کی ردیف کسی بیگم یا محل کا نام ہے۔ اس دیوان کے صفحات ایک سے شروع ہو کر چار سو پچیس پر

تمام ہوتے ہیں۔
اس مجموعے کے بہت سے منظوم خطوط اور بعض غزلیں نظر بندی کی حالت میں لکھی
گئی تھیں۔ ایک ایسی غزل کے چند شعر پیش کیے جاتے ہیں۔

ایسے گم گشتہ ہیں ہم راہِ وطن بھول گئے بلبلو! راہِ منا ہو کہ چین بھول گئے
سال بھر قید کو گزرا نہ لگی آنکھ سے آنکھ ایسے لوٹے گئے ہم لطفِ وطن بھول گئے
مایہ علم جو تھا صرف ہوا زنداں میں کسے تعلیم کریں اپنا ہی فن بھول گئے
جگ قیدی ہوا کلکے میں آکر اختر
شاعر ہند بہت لطفِ سخن بھول گئے

ص ۳۶۴-۳۶۵ باب چہارم

مجموعہ مبارک کے دوسرے حصے کے کتب خانے میں ہیں۔ ایک میں شروع کے ۳۴ اور
آخر کے ۱۸ صفحے (۳۰۹-۳۲۶) اور درمیان سے ص ۳۶۹-۳۷۶ و ص ۳۹۱-۳۵۰ غائب
ہیں۔ آخری حصہ کرم خوردہ ہے۔ دوسرا نسخہ مکمل مگر بہت کرم خوردہ ہے۔ اس کے شروع
میں ایک سادے ورق پر بادشاہ کے کتب خانے کی مہر ہے۔

مٹیابرج میں مجموعہ مبارک کا ایک قلمی نہایت خوش خط مطلقاً اور مذہب نسخہ
شیوع فیض کے نام سے موجود ہے۔ اس کی جلد بھی نہایت عمدہ اور طلا کار ہے۔ پتے پر
ایک جگہ "مجموعہ مبارک حضرت ۱۲۷۱ھ" اور دوسری جگہ "نہک خوار قدیم ذوالفقار علی"
لکھا ہوا ہے۔ راقم حدود ۱۹۴۰ء میں کلکتہ گیا اور نو دن مٹیابرج میں امام بارگاہِ بسطین آباد
کے ذخیرہ کتب کی سیر کرتا رہا۔ اور وہیں کے ایک فوٹو گرافر سے شیوع فیض کے ابتدائی
دو صفحوں کا عکس تیار کروایا۔

تیسرے باب کے آخر میں مشنوی در علمِ عرض کا خاتمہ ہے جو عبد اللطیف
خوش نویس کاتب مشنوی نے چار صفحوں میں لکھا ہے۔ عبد اللطیف ۱۲۷۶ھ میں شاہی
خوش نویس مقرر ہوئے تھے۔ دیوان غزلیات محمد امیر ابن علی رضا خاں جو اہر رقم نے لکھ

کر ۲۹ ربیع الثانی ۱۲۷۶ھ کو تمام کیا۔

مجموعہ منظومات اختر - مطبوعہ - صفحات ۳

اس کتاب میں ایک طویل اردو تصدیقہ فارسی ہفت بند کا پہلا بند تین سلام،
دو رباعیاں، تین مرثیے اور ایک نوحہ ہے۔ مسکے نسخے میں پہلا ورق غائب ہے تیسرے
صفحے کا پہلا شعر یہ ہے۔

تجلی نے تجھ کو تکبر دیا تجھی سے ہو کام ترے ہی فیض سے ہوتا ہوں ات دن مغرور
اس مجموعے کا نام معلوم نہیں ہے اس کے مشمولات کی بنا پر اس کو منظومات اختر کہا
گیا ہے۔

مجموعہ رباعیات و اشعار متفرق وغیرہ - مطبوعہ - صفحات ۲۴

اس مجموعے کا کوئی نام نہیں ہے۔ اس کی پہلی رباعی کا پہلا مصرع یہ ہے۔
'اے کج کلمہ نہ کج کلمہ سر پہ رکھو'

حزن اختر (اردو) مطبع سلطانی، کلکتہ، ۱۲۷۶ ہجری - صفحات ۱۵۴ - تقطیع
کلاں - ہر صفحے کے حاشیے پر نئی وضع کی چوڑی بیل۔

داجد علی شاہ کے قیام کلکتہ کو صرف تیرہ مہینے ہوئے تھے کہ لکھنؤ میں غدر ہو گیا
اور داجد علی شاہ فوراً دہلیم میں نظر بند کر دیے گئے۔ یہ نظر بندی یا قید ۳ ذی قعدہ
۱۲۷۳ھ سے ۷ ذی الحجہ ۱۲۷۵ھ تک (۱۵ جون ۱۸۵۷ء سے ۹ جولائی ۱۸۵۷ء تک)
رہی۔ اس مدت میں ان کو جو حالات پیش آئے اور جو تکلیفیں پہنچیں وہ انھوں نے اس
مثنوی میں بیان کی ہیں۔ یہ مثنوی اسی قید کی حالت میں لکھی گئی جیسا کہ ذیل کے شعروں
سے ظاہر ہے۔

عجب وقت یہ داستاں ہے لکھی کہ تھا قید میں بخت بد محقق
قلم نہ سیا ہی نہ کاغذ و اوت کہ نایاب ہو جیسے آب حیات
بس اس وقت خوش میں کہی داستاں دل و جاں کا عالم یہ تھا الاماں

نہ قابو میں دل تھا نہ میرا دماغ وہ کج نفس پانچ خانے کا باغ
 بادشاہ کے مندرجہ ذیل شعر میں اسی قید کی طرف اشارہ ہے
 ابر تجھ پر کبھی گمراہ ہوا تھا شو ہوا گھر بھی خانہ زندان ہوا تھا شو ہوا
 اس مثنوی کا شاہی ادیشن بڑے سائز پر بہت خوش خط چھاپا گیا ہے اور اس کے
 ہر صفحے کے حاشیے پر طرح طرح کی خوبصورت سلیس بنائی تھیں ہیں مثنوی کا نام خاتمے
 پر ان شعروں میں ملتا ہے :

بس اختر کمر اب ترک طرز بیاں ہوئی ختم یہ مثنوی گلستاں
 رکھا حزن اختہ جو شعروں کا نام یہی نام رکھ کر کیا ہے تمام
 مثنوی کے ایک بیان کے عنوان میں ہے ”مثنوی انداکہ موسوم بہ حزن اختہ است“
 ہتم مطبع نے خاتمۃ المطبع کے طور پر جو عبارت لکھی ہے اس میں بھی اس کا نام حزن اختہ
 ملتا ہے۔ ”مثنوی مبارک سمنی بہ تاریخ حزن اختہ“
 بنی میں بادشاہ کی کتابوں کی جو فہرست شامل ہے اس میں ایک کتاب کا نام
 حزن اختہ لکھا گیا ہے جو صحیح نہیں ہے۔

مطبع کے کاتب عبدالرحمن حسن نے اس کی تاریخ طبع یہ کہی ہے :
 حضرت سلطان عالم دیں پناہ اختر آج کمال و برتری
 حزن اختہ مثنوی تصنیف کرد واقعی خوش داد داد شاعری
 الغرض مطبوع شد حسن از حکم گفتش تاریخ ”حزن اختہ“
 اس قطعہ تاریخ سے صاف ظاہر ہے کہ مثنوی کا نام حزن اختہ ہے اور اس کا
 سال طبع حزن اختہ سے نکلتا ہے۔

۱۱ حزن اختہ ص ۱۲-۱۳ ۱۲ حزن اختہ ص ۱۵۲-۱۵۳ ۱۳ حزن اختہ ص ۱۵۴

۱۴ حزن اختہ ص ۱۵۳ ۱۵ بنی ص ۲۲۲ ۱۶ حزن اختہ ص ۱۵۴

۱۸۳

اس مشنوی کا دوسرا ایڈیشن چھوٹے سے سرائی پور نول کشور پریس میں چھپوا کر دائرہ
ادبیہ لکھنؤ نے ۱۹۲۲ء میں شائع کیا۔ اس میں مولانا شمس الدین لکھنوی کا لکھا ہوا مقدمہ
اور واجد علی شاہ کی بڑھاپے کی تصویر بھی شامل ہے۔
نثبات القلوب (اردو) ثقلی

یہ علامہ محمد باقر مجلسی کی کتاب حیات القلوب کا منظوم ترجمہ ہے۔ اصل
کتاب تین جلدوں میں ہے۔ پہلی جلد میں حضرت آدم سے انبیاء غیر نبی اسرار میں
تک کے حالات ہیں، دوسری جلد میں پیغمبر اسلام کے اور تیسری جلد میں ائمہ معصومین کے
حالات ہیں۔ بادشاہ نے پہلی جلد کا ترجمہ ۱۳۲۵ھ میں شروع کیا۔ اس وقت ان
کی عمر ۶۳ سال کی تھی جیسا کہ اس شعر سے ظاہر ہے۔

سُن اب تیرہ سو ہجری ہیں اے پسر تو ترسٹھ برس کا ہے سن بے ہنر
نثبات القلوب اس کا رکھا ہے نام خدا یا ہوا انجام اس کا تمام
۱۳۰۲ھ میں ساڑھے تین برس محنت کر کے اسی کتاب کا ترجمہ نظم میں کر ڈالا مشنوی
کے خاتمے پر فرماتے ہیں :

یہ ہے جلد اول نثبات القلوب زباں ہے یہ اردو نہایت ہی خوب
سہ سال اور نیم اس کی کی فکر ہے مضامین ہیں عمدہ یہ ہے خوب شے
ہیں اب سیرہ صدیہ چار اے ہواں سُن ہجری اے ختم یہ داستان
بہت میں نے کھایا ہے خونِ جگر تو ڈورے میں گوندھے ہیں یہ لعلِ تر

وسیلہ پوچخش کا شاید یہی

ہوں درگاہ اللہ سے ملتی

اصل کتاب کی طرح اس کے منظوم ترجمے میں بھی اڑتیس باب ہیں۔ مقدمہ مشنوی
حسب ذیل مضامین پر مشتمل ہے :

دیباچہ در حمد، مقدمہ از ملا باقر مجلسی مصنف کتاب، تعریف سخن، مناجات

کچھ اپنے امور خیر کا ذکر، اپنے اجداد کا حال، نسب نامہ پوری مصنفہ فتح الدولہ برق، اپنے حالات۔ یہ سب مضامین نظم میں ہیں۔ مثنوی کے ہر باب کا عنوان بھی منظوم ہے۔ ثبات القلوب جلد اول کا ایک معمولی نسخہ کلکتہ کے ایک بہت چھوٹے سے کتب خانے 'اتحادیہ لائبریری' میں موجود ہے۔ اس کا صرف پہلا ورق غائب ہے۔ میں نے اس نسخے کا سرسری مطالعہ کیا ہے۔ پوری کتاب میں ۱۰۶۱ صفحے اور ہر صفحے میں ۴۲ شعر ہیں۔ اشعار کی مجموعی تعداد ۱۰۶۱ × ۴۲ یعنی ۴۴۵۶۲ ہے۔ اتنی بڑی کتاب کو صرف ساڑھے تین سال میں نظم کر دینا بادشاہ ہی کا کام تھا۔ سچ فرمایا ہے:

کہ میں نے تو ارد کیا ہے۔ اسے ۛ دلا ہیں یہ اختر ہی کے حوصلے

ترجے میں بادشاہ نے جا بجا بعض حالات کا اضافہ کیا ہے۔ ہر بیان کی ابتدا میں ساقی نامہ بعض بیانون میں تمہید اپنی طرف سے شامل کر دی ہے۔

ثبات القلوب جلد اول کا ایک بہت اچھا نسخہ مٹیا برج کے شاہی امام بارے میں ہے۔ ہر صفحے کے حاشیے پر طلائی اور زمردی دہری جداول ہے اور صفحے کے درمیان میں جانوروں اور چڑیوں وغیرہ کی بہت چھوٹی چھوٹی خوبصورت رنگین تصویریں ہیں۔ کتاب کی تزئین کا یہ بالکل نیا طریقہ ہے۔ انوس ہے کہ اس نسخے کا بہت سادہ تعلق ہو گیا ہے۔ باب ہفتم کا صرف آخری صفحہ اور باب ششم قصہ حضرت لوط سے باب سیزدہم قصہ حضرت موسیٰ و ہارون تک باقی رہ گیا ہے۔ آخری باب ناتمام ہے۔ صفحات کا شمار یہ ہے صفحہ ۵۴۳ سے ۸۲۴ تک اور ۹۲۱ سے ۹۲۴ تک۔ تقطیع بڑی ہے اور ہر صفحے میں پندرہ شعر ہیں۔

ثبات القلوب جلد دوم کا بھی کچھ حصہ موجود ہے یعنی صفحہ ۳ سے ۱۶۰ تک۔ تقطیع اور کتابت جلد اول کی سی ہے۔ اس کے صرف آخری چند صفحوں پر جلد اول کی سی نقاشی کی گئی ہے۔

ثبات القلوب اردو کی سب سے زیادہ اور بہت زیادہ ضخیم مثنوی ہے۔ بادشاہ نے

اس کو ستائیس برس میں شروع کیا اور صرف ساڑھے تین سال میں ۳۰۴۷ میں ختم کر دیا۔ اس کے تھوڑے دن بعد ۳۰۵۱ء کو بادشاہ نے انتقال کیا۔ بادشاہ نے غزل میں اپنی زد و گونی کا دعویٰ یوں کیا تھا:

اس قدر جلدی غزل کہنا بہت ثنوارے کب کوئی دنیا میں اختر آب سایدار ہوا
لیکن یہ مثنوی ان کی زد و گونی کا ایسا کارنامہ ہے جس کی نظیر نہیں مل سکتی
ہیبت حیدری (اردو) طبع اول مطبع سلطان لکھنؤ سنہ نامعلوم صفحات
۲۵۱ بہت بڑی تقطیع "۱۵ $\frac{1}{2}$ x ۱۵ $\frac{1}{4}$ "

یہ مثنوی فارسی کی مشہور زمیہ مثنوی حلاج حیدری کا ملخص اردو ترجمہ ہے۔ اس میں مولیٰ کی ہجرت کے پہلے سال تک کا بیان ۲۲۳۳ پر تمام ہو کر ۳۲۳۳ سے ہجرت کے دوسرے سال کا بیان شروع ہو گیا ہے اور ۵۱۶ پر یکایک بے موقع ختم ہو گیا ہے۔ آخری صفحہ سادہ ہے۔ ابتدا میں بادشاہ نے کچھ اپنا اور اپنے بزرگوں کا حال بھی لکھا ہے۔ یہ مثنوی بادشاہ نے شدید بیماری کے بعد اپنا دل بہلانے کے لیے لکھی۔ ریڈینٹ سلیم لاارڈ ڈلہوزی کے نام اپنے خط مورخہ ۶ ستمبر ۱۸۳۹ء میں لکھتا ہے کہ بادشاہ کو جسمانی تکلیف نہیں ہے، مگر خفقان ہے اور خاموشی اور اندر کی کے طویل درد سے پڑتے ہیں۔ آج کل وہ شرکی ایک ضخیم تاج کو جو حیدری کہلاتی ہے نظم کرنے میں مصروف ہیں یہ

ظاہر ہے کہ حیدری سے اس کی مراد حلاج حیدری ہے جو شر میں نہیں نظم میں ہے۔ سلیم کے اس خط سے معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ نے اپنی تخت نشینی کے ڈھائی سال بعد یہ مثنوی نظم کی۔

لے ملا یون علی راجی کی مثنوی حلاج حیدری میں تقریباً تیس ہزار شعر ہیں یہ سفر نامہ
اردو بہ زبان انگریزی جلد اول ص ۳۷

اسعد الاخبار اگرہ شمارہ ۱۱۸، ۱۲۶۵ء میں ہے :
 ”ان دنوں حضرت سلطان کی توجہ سخن گوئی کی طرف بہت ہے۔

چاہتے ہیں کہ کتاب منظوم حیدری کو اپنی فکر رسا سے اردو ترجمہ
 کریں۔ چنانچہ بعض علمائے دانش مند اور خوش نویس جو اس پر رقم مامور
 ہوئے ہیں کہ ہر وقت حاضر رہ کر مسودہ صاف کرتے رہیں :

ہیبت حیدری کے سبب تالیف کے ذیل میں واجد علی شاہ لکھتے ہیں :

کبھی نظم میں نے لے نکلتے سنج	تو ہجرت تھے بارہ ہوشیاری و سنج
طبیعت مری تھی نہایت علیل	کہا دل نے کہ عاقبت کی سبیل
نہ لگتا تھا دل بوستاں میں کبھی	سنبھلتا نہ تھا یہ مکاں میں کبھی
طبیعت کا بے رنگ سامان تھا	کہ آنکھوں میں صحرا گلستان تھا
نہ کچھ دل لگی تھی ترانے میں آہ	بہلتا نہ تھا آنے جانے میں آہ
نہ کچھ ملک کی فکر نے مال کی	نہ تھی کچھ خبر اپنے احوال کی
نہ کھاتا تھا کھانا نہ پیتا تھا آب	حرارت سے دل کی جگر تھا کباب
اسی طرح جب کٹ گئے ہفت ماہ	طبیعت بھی کچھ ہو چلی رد براہ
لگاتا تھا میں نظم میں اپنا دل	کہ یہ ہو نہ جائے کہیں مضحل
اسی فکر میں اور بجان تیاں	گماں آگیا دل میں یہ ناگماں
کہ وہ کمر جو ہو بعد نام آوری	لگا دیکھنے حملہ حیدری
زبیں نہ اسی نظم تھی بے شمار	دکھاتا تھا باغ امامت ہیکار
مرے دل میں تجویز یہ نہ آگئی	اکیلے طبیعت جو گھبرا گئی
مضامین خوش اس میں بھر لیجیے	اسے نظم اردو میں کر لیجیے

لے معاصر، پٹنہ جلد ۱۲، ۱۹۲۲ء

مروج زمانے میں ہو یہ کلام
مژہ جب اس کو سنیں خاص عام
مجھے نام کی شکر جب نہ لگئی
کہا دل نے ہے ہیبت حیدری

شکسیر کا مشہور قول ہے *unhappy lies the head that wears a crown* یعنی جو سر تاج پہنتا ہے وہ بے چین رہتا ہے۔
داجد علی شاہ سمجھتے تھے کہ اودھ کا تاج پہننے والے سر پر یہ قول بخوبی صادق آئے گا اور اسی سبب سے وہ موجودہ حالات پر نظر کر کے بادشاہی کے خواہش مند نہ تھے جیسا کہ اشعار ذیل سے ظاہر ہے :

یہ دنیا جو سنتے ہیں تخت سرا	حقیقت میں ہے یہ ہی نکت سرا
مجھے دوستی اس سے حاصل نہ تھی	طبیعت حکومت پہ مائل نہ تھی
بچار رہتا تھا اس سے اکثر فقیر	کہ ہے جاے دنیا فقط دار دیگر
ہیں مجھ کو تقدیر کب چھوڑتی	میں ہٹتا دے وہ نہ منہ موڑتی
فقیری کا جہنم اڑھا یا بہت	حکومت کے یہ منہ چھپایا بہت
وے کاتب پاک نے لکھ دیا	عنایت سے رتبہ دے بالا کیا
دہی ہو گیا جس سے تھا احتراز	میں باز آگیا پر نہ آئی وہ باز
مقرر ہو تھا وقت وہ آگیا	جسے چھوڑتا تھا وہی پاگیا
ہوا مسکے زیر نگین یہ جہاں	ملی مجھ کو میراث جنت مکاں
خدا نے مرے سر پہ لکھا یہ بار	سمجھتا ہے وہ خوب انجام کار
پھر اب کیا کروں سخت ناچار ہوں	کہ دنیا کے بس میں گرفتار ہوں

دلے جیسا ہے شکر آغاز کا
کرے نیک انجام بھی وہ خدا

ہیبت حیدری (اردو)، طبع دوم۔ مطبع سلطانی لکھنؤ، ۱۲۹۲ھ صفحات ۲۹۶
تقطیع اوسط۔

یہ شہنشی سال تصنیف سے ستائیس برس بعد ۱۲۹۲ھ میں دوسری مرتبہ
چھپی۔ مصنف نے پہلے ایڈیشن پر نظر ثانی کر کے دوسرے ایڈیشن میں کثرت سے لفظی
ترمیم کر دی ہے۔ اس ایڈیشن میں رسول کی ہجرت کے صرف پہلے سال کا بیان ہے۔
اصل کتاب ۲۹۲ صفحوں میں تمام ہوئی ہے۔ اس کے بعد چار صفحوں میں قطعات تاریخ
ہیں۔ آخر کے چند صفحے غائب ہیں۔

شہنشی کے طبع اول سے جن دو مقاموں کے اشعار اور پرکھے جا چکے ہیں، انہیں
مقاموں کے اشعار طبع دوم سے یہاں درج کیے جاتے ہیں۔ ان شعروں کے تقابلی
مطالعے سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ستائیس برس کی طویل مدت میں بادشاہ نے
نظم کے فن میں کتنی ترقی کی۔

شہنشی کا سبب تالیف

ہوئی جب یہ تالیف اے نکتہ سیخ
تو ہجرت سے تھے بارہ سو شصت و پنج
۱۲۶۵ھ

طبیعت مری تھی نہایت علیل	نہکتی نہ تھی بسط کی کچھ سبیل
نہ لگتا تھا دل بوستاں میں کبھی	نہ گل چیں رہا گلستاں میں کبھی
طبیعت کا بے رنگ سامان تھا	کہ آنکھوں میں صحران گلستان تھا
نہ کچھ لطف باقی ترانے میں تھا	نہ نغمہ سراؤں کے گانے میں تھا
نہ کچھ ملک کی منکر نہ مال کی	نہ تھی کچھ خبر اپنے احوال کی
نہ کھاتا تھا کھانا نہ پیتا تھا اک	حرارت سے دل کی جگر تھا کباب
اسی طرح جب کٹ گئے ہفت ماہ	طبیعت بھی کچھ ہو چلی رد براہ

کہ یہ ہونہ جائے کہیں مضحل
خیال آگیا دل میں یہ ناگہاں
لگا دیکھنے حملہ حیدری
دکھاتا تھا باغ امامت بہار
الم سے طبیعت جو گھبرا گئی
اسے نظم اُردو میں کر لیجے
مزعہ جب ہے اس کو پڑھیں خاص عام
کہا دل نے کہہ ہیبت حیدری

نہیں بلکہ کہیے مصیبت سرا
طبیعت حکومت پہ اٹل نہ تھی
کہ ہے جاے دنیا فقط دار دیگر
دیا ساتھ ہرگز نہ تدبیر نے
حکومت سے منہ کو چھپایا بہت
لیا نور خور سے رخ ماہ نے
عطا ہو گیا عدل کج شک دباڑ
پکڑ کر سر تخت پہنچا گئی
ہوا قبضہ دہلک میں اب آدھ
نگر دیکھے اس کا انجام کار
کہ زنجیر غم میں گرفتار ہوں

لگاتا تھا میں نظم میں اپنا دل
اسی فکر میں اور بجان تیاں
کہ وہ کر جو ہو بعد نام آوری
زبس فارسی نظم تھی بے شمار
مرے دل میں تجویز یہ آگئی
مضامین خوش چُن کے بھر لیجے
مروج زمانے میں ہو یہ کلام
تجھے نام کی فکر جب آگئی
خواہش کے خلاف چند روزہ بادشاہی :

یہ دنیا ہے مشہور سخت سرا
مجھے دوستی اس سے حاصل تھی
بچار ہتا تھا اس سے اکثر فقیر
نہ چھوڑا ذرا مجھ کو تقدیر نے
فقیری کا جبہ دکھایا بہت
مقدّر کیا تھا جو اللہ نے
عنایت ہوا جس سے تھا احتراز
مقرر جو تھا وقت وہ آگیا
بنا سیکر زیر قلم سب آدھ
خدا نے مرے سر پہ رکھا یہ بار
مقدّر سے اس درجہ ناچار ہوں

مگر شکر ہے شکر ہے اے خدا
ابھی تک ہے حاصل وہی مرتبہ

مثنوی عشق نامہ (اردو)

یہ عشق نامہ شرفارسی کا آزاد منظوم اردو ترجمہ ہے۔ اصل فارسی کتاب کی نوعیت تفصیل کے ساتھ اس کتاب کے سلسلے میں بیان کی جا چکی ہے۔ یہاں اس کی تکرار کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن مثنوی کا مطالعہ کرتے وقت اس بیان کو نظر میں رکھنا بہت ضروری ہے۔ اس مثنوی کے پانچ نقلی نسخے میں نے دیکھے ہیں۔ ایک نسخے سے مدت ہوئی میں نے ابتدائی تین صفحے نقل کر لیے تھے۔ اس کی تصنیف کی تاریخ اور داستانوں کی تعداد اب یاد نہیں۔ ایک نسخہ ریاست محمود آباد کے کتب خانے میں تھا جس میں ایک سو اکتیس داستانیں ہیں۔ ایک خوش خط بوسیدہ نسخہ میسر کتب خانے میں ہے۔ اس میں بھی داستانوں کی تعداد ایک سو اکتیس ہے۔ اس نسخے میں پہلے ورق کے بعد ایک ورق کا زیادہ حصہ اور چھ ورق پورے غائب ہیں۔ آخری داستان کے ابتدائی دو شعر نہیں ہیں۔ آخری تین شعر یہ ہیں:

حکایات مکر زناں تا کجا کہ حکم پیمبر ہے یاد خدا
یہ ہے سال ہجری دم اختتام ”کیا عشق سنواں کا نامہ تمام“
ہو جب کہ مد نظر خاتمہ کہی دل نے تاریخ ”مکر خاتمہ“

دوسرے شعر کا دوسرا مصرع اور تیسرے شعر میں ”مکر خاتمہ“ مادۂ تاریخ ہیں جن سے اس کتاب کا سال اتمام ۱۲۶۶ھ نکلتا ہے۔ ایک ناقص نسخہ انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ کے کتب خانے میں ہے، جس میں شروع کی پچیس داستانیں غائب ہیں اور چھٹی داستان کے صرف آخری دس شعر موجود ہیں۔ اس کے بعد تائیسویں سے ایک سو انتیسویں داستان تک ہیں۔ آخری داستان کے ایک سو سولہ شعر موجود ہیں، لیکن داستان

ابھی تمام نہیں ہوئی ہے۔ مثنوی کا ایک خوش خط مطلقاً نسخہ تھا، جس کے شروع، آخر اور درمیان کے بہت بہت سے ورق کم تھے۔ اس ناتمام نسخے میں آخری داستان کا نمبر ۱۸۵ اور آخری سن ۱۲۴۰ھ تھا۔ واجد علی شاہ ۲۶ جمادی الاول ۱۲۴۲ھ (۲۴ فروری ۱۸۵۶ء) تک اودھ کے بادشاہ رہے۔ اس لیے گمان غالب ہے کہ اس نسخے میں ان کی بادشاہی کے خاتمے تک کا حال ہوگا اور یہ اس مثنوی کا مکمل نسخہ ہوگا۔

اس مثنوی کا ایک مطبوعہ نسخہ بھی مجھ کو ملا جو شروع سے تھوڑا اور آخر سے بہت کم ہے۔ پھر اس کا ایک دوسرا نسخہ نظر آیا جو اس سے بہت زیادہ ناقص تھا۔ غالباً یہی نسخہ بعد کو بھوپال پہنچ گیا۔ یہ دونوں نسخے شروع اور آخر سے ناقص تھے۔ اس لیے مطبع کا نام ان میں درج نہیں تھا۔ مگر کتابت اور طباعت کی شان سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ مطبع سلطانی میں چھپے تھے۔

مثنوی عشق نامہ۔ قلمی اور مطبوعہ ناقص نسخے جو مجھ کو وقتاً فوقتاً ملتے رہے ان کی مدد سے میں اس مثنوی کی تکمیل کو تار ہا۔ ان نسخوں کی نقل اور مقابلہ کئی برس تک ہوتا رہا اور ایک ایسا نسخہ تیار ہو گیا جس میں داستانوں کی تعداد ایک سو پچاس تک پہنچ گئی۔ مگر مثنوی اب بھی ناتمام ہے۔

مثنوی کے مختلف نسخوں کا مقابلہ کرنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ واجد علی شاہ اصل فارسی عشق نامہ میں کچھ کچھ مدت کے بعد اس مدت میں پیش آنے والے واقعات کا اضافہ کرتے رہتے تھے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ اضافے اس کے منظوم ترجمے ہی میں کیے گئے ہوں۔ اس مثنوی کے جتنے نسخے میری نظر سے گزرے ہیں ان میں سے کسی میں اس کا نام درج نہیں ہے۔ وزیر السلطان نواب امیر علی خاں امیر نے اپنی کتاب دذیرنا میں واجد علی شاہ کی تصنیفات میں سے ایک کا نام عشق نامہ مبارک بتایا ہے اور اس کے سر شعر نقل کیے ہیں: "یہ سب شعر اس مثنوی میں موجود ہیں۔ اس طرح معلوم ہوا

لہ دذیرنا ص ۳۱۱-۳۱۶

کہ اصل فارسی کتاب کی طرح اس کے منظوم ترجمے کا نام بھی عشق نامہ ہے۔
 مثنوی عشق نامہ کا قلمی نسخہ جو مسیکر کتب خانے میں ہے اس کی داستان
 یک صد و سی و یکم پر مثنوی ختم کر دی گئی تھی، جیسا کہ اشعار ذیل سے صاف ظاہر ہے۔

لکھی ہے جو میں نے یہ بہتر کتاب	مضامین اس کے ہیں سب انتخاب
نہیں جھوٹ کا نام اس میں ذرا	جو گزرا تھا سب بے تکلف لکھا
کریں چشمِ عبرت سے عاقل نظر	خبر شرط ہے میں نے کر دی خبر
نہیں ہے فقط قصہ درد و داغ	یہ ہے راہ بھولے ہوؤں کو چراغ
غم انگیز یہ داستانِ زناں	محک تھی پے ر استخوانِ زناں
کرے دیدہ غور سے جو خجالی	نہ اس دام میں پھنس کے کھینچے ملاں
نہ جنبش کرے ان کی تحریک سے	رہے دور دور ان کے نزدیک سے
کرد و غور تجھ سا جو انِ حسین	جہاں بادشہ زیب تاج و نگین
سلسلِ کرم، بخششِ متصل	کہ دشمن نہیں مجھ سے آزر دہ دل
جو مجھ سے ہے بے وفاؤں کا حال	نہ میرا ادب ہے نہ اپنا خیال
کرد بے وفائی نظر غور سے	وفا کیا کریں گی کسی اور سے
سخن مختصر جو یہ دیکھے کتاب	کہ اس میں کشادہ ہیں عبرتِ باب
کنارہ کرے ان سے ہر حال میں	پھنسے خود نہ زلفوں کے جتالی میں

تلف مال ان کے لیے کیوں کرے

تنبہ حال ان کے لیے کیوں کرے

ان اشعار سے اس مثنوی کی تصنیف کا مقصد ظاہر ہوتا ہے۔ یہ مثنوی شاعری کے
 نقطہ نظر سے بھی بہت بلند پایہ ہے۔ مثال کے طور پر چاندنی رات کا سماں ملاحظہ کیجیے:

ہوا جس گھڑی چاندنی کا ظہور	برسنے لگا طرفہ بارانِ نور
زمین سے پیدا آسماں ہو گیا	کہ چاندی کا سارا جہاں ہو گیا

۱۹۳

شجر باغ میں سیم پیکر ہوئے گل و برگ چاندی کے پتر ہوئے
 ہوا سکھ زن یہ فردغِ قمر کہ نکال باہر نہ تھا کوئی گھر
 فقیروں کو حاصل خزانے ہوئے غریبوں کے گھر چاندی خانے ہوئے

جدھر دیکھیے جلوہ طور تھا

زمین تافک عالم نور تھا

مثنوی خاقان سرور؟

یہ مثنوی واحد علی شاہ کی تصنیف قرار دی گئی ہے۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ ایک کم علم اور بد سلیقہ شخص خواجہ محمد دلی جان عاقسی نے مثنوی عشق نامہ سے ادھر ادھر کی چند داستانیں لے کر ان کا بے ربط مجموعہ جو صرف چار سواٹھ شعروں پر مشتمل ہے، مثنوی خاقان سرور کے بے ڈھنگے نام سے مطبع گلشن فیض لکھنؤ میں چھپوا کر، ۱۳۱ھ میں شائع کر دیا۔ اس نے صفحہ ۲۳۲ پر شرکی جو عبارتیں لکھی ہیں ان میں ایک بھی عیوب سے پاک نہیں ہے۔ صفحہ ۵ پر ایک سلسل بیان کے بیچ میں بالکل بے محل شعر داخل کر دیا ہے۔

سخن مختصر توڑ کبر و غرور دکھا نام مثنوی خاقان سرور

یہ شعر بے معنی اور اس کا ایک مصرع ناموزوں ہے۔ اسی طرح کا ایک شعر صفحہ ۳۱ پر ملتا ہے۔

لکھ اے گلکشکر و حمد فتاح کہ ہے وہ خالق معیار اوداح

یہ شعر عنوان کے طور پر حلی حرفوں میں لکھا گیا ہے۔ اس عنوان کے تحت میں شکر و حمد کے اشعار ہونا چاہیے تھے۔ لیکن ہے کیا؟ پہلے صفحہ پر جو پانچ شعر لکھے گئے ہیں اور ان میں جو عشق کا بیان شروع کیا گیا تھا، اسی سلسلے کے تیرہ شعر ہیں، جن کو نہ شکر سے کوئی نسبت ہے نہ حمد سے۔ مثنوی کے آخر میں ایک قطعہ تارتخ ہے جو جلال لکھنوی سے منسوب کیا گیا ہے۔ مگر یہ یقین کرنا مشکل ہے کہ جلال کے سے نام درادرنازک مزاج استاد نے اس

بے سر و پاشنوی کے لیے قطعہ تاریخ کہنا گوارا کیا ہو۔ کچھ عجب نہیں کہ مثنوی کی طرح
اس کا قطعہ تاریخ بھی جعلی ہو

دہ جو خاقان سرور اک مثنوی ہے مصنف جس کا اخترا ساختن داں
کیا عاصی نے اس کو منتخب تا زیادہ ہو پسند نکمہ سبھاں
جلال اس منتخب کے طبع کا سال یہ رقم لکھ دو ”سرور افزائے خاقان“
۱۳۱۰ھ ہجری

واجد علی شاہ اودان کا عہد کے مصنف رئیس احمد جعفری نے اس
مثنوی کی بے بطنیوں، اس کے بعض ناموزوں اور بے معنی شعروں اور شرکے ہمل
نقدوں پر نظر کیے بغیر اس مثنوی کو داج علی شاہ کی تصنیف تسلیم کر کے اس کی کیفیت
یوں بیان کی ہے :

”مثنویوں میں سرور خاقانی ایک ایسی مثنوی ہے جس میں
بادشاہ نے اپنی عاشقی کی سرگزشت لکھی ہے اور واقعات کے لحاظ
سے بہت دل چپ ہے۔ ممتوعہ بیگمات کے ابتدائی تعلقات اور متغہ
کے قصہ طلب واقعات کو بالترتیب نظم فرمایا ہے“

اس عبارت میں سرور خاقانی سے مصنف کی مراد مثنوی خاقان سرور ہے۔
مثنوی بحر مختلف (اردو) مطبع مصطفائی کلکتہ، یکم ذی الحجہ ۱۲۷۷ھ
صفحات ۵۵ (۵۷)

یہ مثنوی ۱۲۷۵ھ میں تصنیف کی گئی۔ اس میں بادشاہ نے اپنی بیگموں، بیٹوں،
بیٹیوں، بہوؤں، دامادوں کے نام مع خطابات بتائے ہیں اور بعض کا بہت مختصر حال
بھی لکھا ہے۔ مرزا برجیس قدر بہادر کے بارے میں لکھا ہے کہ آج کل وہ اور اس

کی ماں حضرت محل دونوں انگریزی فوج میں گھرے ہوئے ہیں :

مرزا برہیں قدر ہے اک نام
کہہ بہادر تو نام ہر دم تمام
بطن حضرت محل سے ہے یہ پسر
تیرہ چودہ برس کا ہے خوش تر
طول عمر اس کو حق تعالیٰ نے
اسے انگریزی فوج ہے گھیرے
وہ مع والدہ ہے اس میں گھرا
دیکھے کہ اُسے چھڑائے خدا
طولانی خطابوں کے ساتھ سب ناموں کو کسی ایک بحر میں نظم کرنا ممکن نہ تھا۔ اس لیے
مختلف بحریں استعمال کرنا پڑی ہیں اور یہی اس مثنوی کی وجہ تسمیہ ہے۔

اس مثنوی کے دو نسخے میسر کتب خانے میں ہیں دونوں ایک ہی مطبع میں
ایک ہی تاریخ کو چھاپے گئے۔ سرورق کے نقش و نگار مختلف ہیں۔ ایک نسخے میں پچپن
صفحے ہیں اور پہلے صفحے کی پیشانی پر اودھ کا شاہی مار کا بنا ہوا ہے، دوسرے میں ستاون
صفحے ہیں اور یہ مار کا نہیں ہے۔ اس کے علاوہ دونوں نسخوں میں کہیں کہیں خفیف سا لفظی
اختلاف بھی ہے۔

مثنوی بے نام۔ مطبوعہ صفحات ۱۷

داجد علی شاہ کے زمانہ ولی عہدی کا ایک قصہ۔ گنا طوائف کی بے وفائی
اور غلام رضا مصاحب کی نمک فراموشی مخقر اُبیان کر کے لکھا ہے :
کس کے اس مثنوی کو لے یا رد : نہ لگاؤ جو دل تو عاقل ہو
مجموعہ مبارک میں اس کا نام 'مثنوی گنا' ملتا ہے۔

تین رومانی مثنویاں

داجد علی شاہ نے متعدد مثنویاں کہیں۔ ان میں صرف تین ایسی ہیں جن میں
عشقِ قہصے بیان کیے گئے ہیں اور جن کے کرداروں میں سخن البیان اور گلزارِ نسیمی
وغیرہ کی طرح دیو اور پریاں بھی شامل ہیں۔ ان مثنویوں کا سبب تالیف جو خود بادشاہ

نے عشق نامہ فارسی میں بیان کیا ہے ذرا طولانی ہے۔ لیکن اس سے ان کی سیرت کے بعض پہلو بھی نمایاں ہوتے ہیں۔ اس لیے وہ یہاں عشق نامہ کے اردو ترجمہ محل خاندہ شاہی سے غیر ضروری الفاظ حذف کر کے نقل کیا جاتا ہے:

”میں نے... ایک عورت موتی خاتم نامے دہلی، پتلی، گیمہواں رنگ، بڑی بڑی خوش نما آنکھیں، کشادہ ابرو، چست و چالاک، تیز مزاج نوکر رکھی... از بس کہ اس کو میں نے.. محض اپنی دل بستگی اور آرام کے واسطے نوکر رکھا تھا، اس باعث میسر محل.. کو بے حد ناگوار ہوا۔ انھوں نے بہت کچھ شور و غل مچانا شروع کیا، جس کا انجام یہ ہوا کہ وہ ملازمت سے علیحدہ کر دی گئی اور مجھ پر جنابیلہ و کعبہ والد ماجد حضرت جنت مکان کا عتاب نازل ہو کر نظر بند کر دیا گیا۔

”اس کے بعد میں نے مجبوراً گوشہ نشینی اختیار کر کے شعر و شاعری کی طرف اپنے دل کو منعطف کیا۔ لیکن جنابیلہ و کعبہ والد ماجد کی خفگی کی وجہ سے زندگی تلخ ہو گئی۔ جب یہ حال والد ماجد پر منکشف ہوا تو انھوں نے اپنی زبان فیض ترجمان سے ارشاد فرمایا کہ وہ عورت اس کے یعنی میسرے کو لے کر دی جائے لیکن اس شرط سے کہ وہ (شہزادہ) اس گھر سے علیحدہ کسی دوسرے مکان میں رہے اور میرے سلام کو بھی نہ حاضر ہوا کرے۔... اس حکم کے صادر ہوتے ہی وہ عورت میری خدمت میں حاضر کی گئی۔ چونکہ خداوند عالم نے والدین کی اطاعت و فرمانبرداری کل ذنبوی کاموں پر مقدم کر دی ہے اس لیے میں نے اس عورت سے دست کشی کر کے والد ماجد کی خدمت فیض درجت میں عرض کی کہ غلام ہر طرح فرمان اقدس کا مطیع ہے اور کسی صورت سے خلاف مرضی والد کوئی کام نہیں کر سکتا۔

”یہ پیام سن کر حکم ہوا اس عورت کو خوشی خاطر اپنے پاس سے
جدا کر دو۔ اس حکم کے سنتے ہی میں نے تعمیل کی اور اس وقت سے
آج تک کبھی خواب میں بھی اس عورت کی صورت نہیں دیکھی۔ گودالد
مغفور رحمت سدھارے اور میں خود مختار ہوا، جو جی چاہتا کر سکتا تھا۔
لیکن جو کہا وہ کہا۔ جس زمانے کا یہ ذکر ہے اس وقت میرا سن اٹھارہ
برس کا تھا۔ انھیں دنوں میں نے فن شعر گوئی حاصل کر کے اس عورت
کے عشق میں بوجہ دلولہ طبیعت دو دیوان اور تین مثنویاں نظم کیں۔

مثنویوں میں بیشتر عشقیہ قصے بیان کیے جاتے تھے۔ پھر وہ تین مثنویاں جو
مذکورہ بالا حالات میں تصنیف کی گئیں یعنی جوش عشق میں دلولہ طبیعت جن کی تصنیف کا
محرک ہوا، ان میں عشقیہ داستانوں کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا۔ اور جیسا کہ اوپر کہا
جا چکا ہے واجد علی شاہ کی مثنویوں میں اس طرح کی صرف تین مثنویاں ہیں،
افسانہ عشق، دریا عے تعشق اور بحر الفت۔ قیاس کہتا ہے کہ یہی وہ تین
مثنویاں ہیں جو واجد علی شاہ نے اٹھارہ برس کے سن میں اپنی مرشد زادگی کے
زمانے میں کہیں۔ لیکن ایک بات ہے جو اس قیاس کی رد میں بڑی قوی دلیل معلوم
ہوتی ہے۔ یہ تینوں مثنویاں مطبع سلطانی لکھنؤ کی تھپی ہوئی موجود ہیں اور خود مصنف
کے بیان سے گمان ہوتا ہے کہ ان کی تصنیف کے وقت امجد علی شاہ ثریا جاہ کا انتقال
ہو چکا تھا اور مصنف اودھ کا بادشاہ ہو کر سلطان عالم کا لقب اختیار کر چکا تھا۔
اشعار ذیل ملاحظہ ہوں۔

جو سلطان امجد علی شاہ تھا :۔ ثریا سے جس کا سوا جاہ تھا

لہ محل خانہ شاہی ص ۱۶ عشق نامہ فارسی (قلمی) ص ۱۱ تا ۱۳ مثنوی

عشق نامہ مطبوعہ داستان ہنرم و نغم ص ۲۵ تا ۲۹ ۲۵ م شذادادہ

انھیں کا ہوں فرزند بخش مقال
خدا عمرے ناصد دست سال
کیا حق نے سلطان عالم مجھے
بجائے کہیں جان عالم مجھے
افسانہ عشق ص ۱۲

خوشید ہے جس فلک کا اختر
جس باغ کا ہے گل معطر
تھا اسم مبارک ان کا اے آہ
شاہ امجد علی فلک جاہ
افسوس کہ اب وہ رشک نفخور
حضرت جنت مکان ہیں مشہور
دریائے عشق ص ۱۳

تو نے ہی کیا ہے مجھ کو سلطان
عالم ہے مرا مطیع فرماں
تو نے ہی دیا ہے مجھ کو یہ آوج
طبل و علم و حکومت و فوج
دریائے عشق ص ۲۳۲

وہ جو مشہور تھے جہاں میں شاہ
شاہ امجد علی ثریا جاہ
میکے والد تھے میکے شیدا تھے
تم سے میں کیا کہوں کہ وہ کیا تھے
دہر میں یہ نشان ان کا ہے
نام جنت مکان ان کا ہے
لکھنؤ گرچہ مقدم اپنا ہے
تعلیم سلطان عالم اپنا ہے

بحر الفت ص ۳۲-۳۳

لیکن ایک چیز ہے جو اس گمان کی زد اور مذکورہ بالا قیاس کی تصدیق کرتی ہے اور
وہ ہے دریائے عشق کا پہلا ایڈیشن جس کی اشاعت کے وقت واجد علی شاہ کے
دادا شاہ زماں محمد علی شاہ اودھ کے بادشاہ اور والد ثریا جاہ ان کے دلی عہد تھے
جیسا کہ وہ خود فرماتے ہیں :

فرزند ثریا جاہ کا ہوں
نارا تو میں ایسے ماہ کا ہوں
ہے شاہ زماں اودھ کا جو شاہ
قبضے میں ہے تا بہ ماہی و ماہ
فرزند کا اس کے ہوں میں فرزند
اس شہ کے جگر کا ہوں میں دل بند ص ۱۲-۱۳

صاحبِ عالم دلی عہد بہادر کی طولانی مدح میں یہ دو شعر بھی ہیں:
 بس پھیر قلم کو آہ شاعر کہ مدح تریا جاہ شاعر صد۱۲
 ہے شاہِ زماں کا بس دلی عہد سب خلق مگس ہے اور یہ شہد صد۱۵
 خاترہِ مثنوی میں کہتے ہیں:

ہے یہ جو تریا جاہ میرا بے شبہ دشاہ میرا
 یہ ہی ہے دلی عہدِ دُوراں اس کا ہو ہماں طبعِ فرماں
 قبضے میں ہو ماہِ تابہ ماہی تا حشر رہے تریا جاہی صد۲۵
 دریائے عشق کے اسی ایڈیشن میں سببِ تالیف کے ذیل میں کہتے ہیں۔

اک مثنوی آگے بھی کہی ہے بس درد میں عشق کے بھری ہے
 افسانہٴ عشق اس کا تھا نام آغاز بھی خوب اور انجام صد۳۰
 صاف ظاہر ہے کہ مثنوی افسانہٴ عشق بھی اسی زمانے کی تصنیف ہے جب
 واجد علی شاہ ابھی دلی عہد بھی نہ ہوئے تھے۔ اس طرح یقین کے ساتھ معلوم ہو جاتا ہے
 کہ افسانہٴ عشق اور دریائے عشق یہ دونوں مثنویاں واجد علی شاہ نے اپنے بیان
 کے مطابق نو عمری میں کہیں اور بادشاہ ہونے کے بعد ان پر نظر ثانی کر کے ان کا دوسرا
 ایڈیشن شایع کیا۔

واجد علی شاہ کا یہ بیان اور نقل کیا جا چکا ہے کہ انھوں نے ۱۸ برس
 کے سن میں تین عشقیہ مثنویاں کہی تھیں۔ ان کی ایک ہی عشقیہ مثنوی اور ہے یعنی (الف)۔
 افسانہٴ عشق اور دریائے عشق کے ساتھ کی تیسری مثنوی یہی ہو سکتی ہے۔
 مثنوی دریائے عشق کے دونوں ایڈیشنوں کا مقابلہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے
 کہ دوسرے ایڈیشن میں مثنوی کے مضامین میں کم اور زبان میں بہت زیادہ تبدیلیاں
 کی گئی ہیں جس سے دوسرا ایڈیشن پہلے سے بہ درجہا بہتر ہو گیا ہے۔ یہی حال افسانہٴ عشق
 اور بحرِ الفت کا بھی سمجھ لینا چاہیے۔

بادشاہ کی یہثنویاں اردو کی مشہور اور مقبول مثنویوں کی بحر میں ہیں، افسانہ
عشق سحر البیان کی بحر میں دریا ہے فحش و گھڑا رسیہما کی بحر میں اور بحر الفت
زہر عشق کی بحر میں ہے۔

داجہ علی شاہ نے اپنی ان تینوں مثنویوں کے ڈرامے بنا کر لاکھوں روپے کے ضرر
سے ان کے تکمیل تیار کیے تھے۔ سال ہا سال کی تلاش و تحقیق کے نتیجے میں ان گھسیلوں کا
تفصیلی بیان میں اپنی کتاب لکھنؤ کا شاہی اسٹیج میں لکھ چکا ہوں۔ اسی کتاب میں
ان مثنویوں کے قصے بھی تفصیل سے بیان کیے جا چکے ہیں۔

حکیم ضامن علی جلال لکھنؤی کے دال حکیم صغر علی خاں 'داستان گوئے سلطانی'
نے ان تینوں مثنویوں کی داستانیں بتائی تھیں۔ ان کی بنائی ہوئی چار داستانوں کا
ایک مجموعہ لکھنؤ میں تھا اور دس داستانوں کا مجموعہ رام پور کی رضا لائبریری میں ہے۔
ان دونوں مجموعوں میں یہ تین داستانیں بھی شامل ہیں۔

افسانہ عشق (اردو)، مطبع سلطانی لکھنؤ، صفحات ۳۰۱

یہ داجہ علی شاہ کی پہلی عشقیہ مثنوی ہے، جس میں سیم تن اور ماہ پیکر کا قصہ
بیان کیا گیا ہے اور جو بادشاہ نے اپنے ایک مصاحب حسن یار خاں کی درخواست پر
کہی۔ اس کا 'سبب تالیف' یوں لکھا گیا ہے۔

غرض میرے دل میں یہ آیا خیال	کہ کچھ شعر موزوں کروں حسب حال
کچھ شعرا عشقیہ موزوں کیے	پڑھا ان کو فی الجملہ آواز سے
حسن یار خاں شاعر انتخاب	کہ ہے شعر کا علم عیب و صواب
مرے وہ بہت دن سے نم ساز ہیں	ملازم ہیں شفقت سے ممتاز ہیں
پڑھے حسب عرض ان کے پھر جب شعر	بہت مدح کی اور کہا ہے یہ سحر
اک ارشاد ہو مثنوی جاں فزا	رے نام نامی کا جس سے پتا
ہر اک مثنوی حسن بھول جائے	مزرہ کچھ نہ اس کے حضور اس میں جائے

ملازم جو مخصوص تھے پانچ چار
 ہوئے سیکر در پے وہ سب ایک بار
 انھیں روزوں آگ امرایا ہوا
 کہ دل پر محبت کا صدمہ ہوا
 ہوا ٹکڑے ٹکڑے دلِ ناصبور
 یہ شیشہ ہوا سنگ الفت سے چور
 اسی دھن میں قصہ یہ کہنے لگا

جگر خون ہو ہو کے بہنے لگا صفحہ ۱۱

اس مثنوی میں تقریباً پونے چار ہزار شعر ہیں جو بادشاہ نے صرف دو ہفتے میں کہہ ڈالے۔

جب اس مثنوی کو کہا صبح و شام
 ہوتی پندرہ دن میں آخر تمام
 کہوں جزو اس کا یہ دستور تھا
 کہ دوں ختم جلدی یہ منظور تھا
 بھلا نظم کرنے کا کب ہے یہ طور
 کہاں طبیب یا بس یہ جلدی میں غور
 زباں اور دل پاک ہیں لات سے
 مری عرض ہے اہل انصاف سے

کہ اس عجز کا دھیان دل میں رکھیں

غلط لفظ رکھیں تو صلاح دیں صفحہ ۱۱

مصنف نے اپنی دوسری مثنوی دریاۓ عشق میں اس مثنوی کا ذکر یوں کیا ہے۔

قبل اس سے جو مثنوی کہی ہے
 وہ عشق سے سب بھری ہوئی ہے

افسانہ عشق اس کا ہے نام
 آغاز بھی خوب اور انجام

بادشاہ نے اس مثنوی سے ایک ڈراما تیار کیا تھا جس کا تفصیلی بیان میری کتاب لکھنؤ
 کا شاہی اسٹیج میں دیکھا جاسکتا ہے۔ صفحہ ۱۱
 میں اس ڈرامے کا مختصر ذکر یوں کیا ہے۔

وہ سب ماہ پیکر کے رنج و محن
 پریشان ہونا پئے سیم تن
 کہا اس لطافت سے سب ماجرا
 کہ نقشِ دل اہلِ عالم ہوا
 پسند آئی وہ مثنوی اس قدر
 کہ پڑھنے لگے لوگ شام و سحر
 مگر شاہ نے یہ تکلف کیا بغایاں
 کہ یہ بھی اسی حال کا

کیا تھا جو کچھ مثنوی میں بیاباں

دکھا دی وہ سچ کر کے سب داستان ۲۴۴

حسن یار خاں جن کی درخواست پر یہ مثنوی کہی گئی ان کا نام، خطاب اور تخلص
اسعد الدولہ منشی حسن یار خاں بہادر افضل ہے۔ عہد واجد علی میں بخشی گری کی پکڑی میں
ارباب دفاتر و شاگرد پیشہ وغیرہ ان سے متعلق تھے یہ آغاز، جو شرف شاگرد آتش
تاریخی مثنوی افسانہ لکھنؤ میں کہتے ہیں۔

یہ ہیں جو حسن یار خاں با ریاب کہ ہے اسعد الدولہ ان کا خطاب
ضعیفی میں لشکر کے ہم راہ ہیں یہ منشی قدیمی ہوا خواہ ہیں
یہ آتش کے شاگردوں میں ہیں قدیم تخلص ہے فضل عماد، ندیم
مدرس نمودی و کامی یہ ہیں بے شاعر دہلی میں ہیں نامی یہ ہیں
رفاعت کے حق کو ادا کر گئے

سنا ہے کہ کلکتہ میں مر گئے

دریا مے تعشق (اردو)، پہلا ایڈیشن، مطبع نامعلوم، صفحات ۲۱۵
یہ واجد علی شاہ کی دوسری عشقیہ مثنوی ہے، جو انہوں نے اس زمانے میں کہی
تھی جب ان کے دادا شاہ زماں محمد علی شاہ اودھ کے بادشاہ اور والد شریا جاہ امجد علی
شاہ ان کے ولی عہد تھے۔ وہ 'سبب تالیف' کے سلسلے میں لکھتے ہیں۔

اک مثنوی آگے بھی کہی ہے بس در میں عشق کے بھرے ہیں
افسانہ عشق اس کا تھا نام آغاز بھی خوب اور انجام

لے زمبدة الکوائف قلی از ہماراجہ جے گوپال ثاقب ورق ۵۹ ب ۲۵ افسانہ لکھنؤ
کا وہ نسخہ چوتھرتن نے بادشاہ کو نذر دیا تھا مٹیابرج کے شاہی امام باڑے میں محفوظ اور اس کی
نقل سے یہ کتب خانے میں موجود ہے۔

درپے ہوئے میرے لوگ اک روز
کہنے لگا مثنوی کو میں بھی
اک مثنوی اور کہہ دو دل سوز
اکیسویں دن ہوئی منامی
ہے شکر خدا ہوا سر انجام ۱۲-۱۳

اپنا تعارف یوں کیا ہے۔

ہے واجد علی یہ نام میرا
اختر ہے تخلص اپنا مشہور
ہر چند نہ تھا یہ کام میرا
اس واسطے ہے کلام میں نور
فرزند ثریا جہا کا ہوں
ہے شاہ زمان اور دھکا جوشاہ
قبضے میں ہے تابہ ماہی و ماہ
فرزند کا اس کے ہوں میں فرزند

اس شہ کے حکم کا ہوں میں دل بند ۱۳-۱۴

اس کے بعد حضرت صاحب عالم دلی عہد بہادر کی مدح میں کہتے ہیں۔

بس پھیر قلم کو آہ شاعر
دہ ہی گلِ بارغِ سلطنت ہے
کو مدح ثریا جہا شاعر
بے شک وہ چرخِ سلطنت ہے
سب اس سے ہے انتظام شاہی
جب تک کہ یہ ہے بناے دنیا
اس ذات سے ہے قیام شاہی
جب تک کہ یہ ہے سراے دنیا

قائم ہو ثریا جہا سا شاہ

باسلطنت و ترقی و جہا ۱۴-۱۵

مثنوی ختم کرنے کے بعد یہ دعائیہ اشعار کہے ہیں۔

مقبول سخن ہے تیرا اختر
یارب ہے یہ کائنات جب تک
موقع ہے یہی دعا کا اختر
یہ روز ہے اور رات جب تک

ہے یہ جو ثریا جہاں مسیرا بے شبہ و شک ہے شاہ مسیرا
قبضے میں ہوا ماہ تا بہ ماہی

تا حشر رہے ثریا جہاں ہی ۲۱۵

اس مثنوی کی تصنیف کے وقت تک واحد علی شاہ کسی کے شاگرد نہیں تھے۔

والٹر نہیں کسی کا شاگرد بالٹر نہیں کسی کا شاگرد

ہے جوش میں ان دنوں طبیعت کھینچ نہیں س میں میں نے محنت صلا

اس مثنوی کا جو نسخہ میرے کتب خانے میں ہے اس میں ابتدائی دس صفحے غائب ہیں۔

اس لیے مطبع کا نام موجود نہیں ہے لیکن کاغذ کی نوعیت اور چھپائی کے انداز سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کتاب شاہی مطبع کی چھپی ہوئی ہے۔

دیا ہے تعشق (اردو)، دوسرا ایڈیشن، مطبع سلطانی لکھنؤ، صفحات ۲۳۲

اس مثنوی کا 'سبب تالیف' حسب ذیل ہے۔

اک روز تھے جمع کچھ پری زاد بند غم و رنج سے تھے آزاد

کچھ مشغور سخن کا مشغلہ تھا دل میں بھی عجیب دلولہ تھا

تھا نشہ بادہ جوانی حاصل تھا سرورِ زندگانی

اس وقت بلائیں میری لے کر کہنے لگی ایک ماہ پیکر

اچھے مرے پیارے جانِ عالم قربان تمہارے جانِ عالم

اک مثنوی ہم کو اور کہہ دو دنیا میں نہیں ہے تم سا خوش گو

اس میں بھی ہو طرز عاشقانہ مقبول کرے جسے زمانہ

کی میں نے ہزار ان سے تکرار کچھ پیش گیا مگر نہ انکار

پھر آگئی جوش پر طبیعت اٹھا دم فکر بحرِ جودت

چھٹری یہ داستانِ پُر درد

پھر کے جسے سُن کے سب زن و مرد ۱۰۹

دریائے تعشق کے پہلے ایڈیشن کا 'سبب تالیف' بھی تھوڑے سے فرق کے ساتھ ہی ہے۔ خاص فرق یہ ہے کہ پہلے ایڈیشن کے 'سبب تالیف' سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ لوگوں کا اصرار اس مثنوی کی تصنیف کا محرک ہوا اور دوسرے ایڈیشن کے 'سبب تالیف' میں بتایا گیا ہے کہ ایک ماہ سپر، کی منت و سماجت سے یہ مثنوی کہی گئی۔

تقریباً تین ہزار شعر کی مثنوی اکیس دن میں تمام ہو گئی۔
 اکیسویں روز پایا اتمام دریائے تعشق اس کا ہے نام صفا
 مثنوی انسانہٴ عشق اس سے پہلے کہی جا چکی تھی۔
 قبل اس سے جو مثنوی کہی ہے وہ عشق سے سب بھری ہوئی ہے
 انسانہٴ عشق اس کا ہے نام آغاز بھی خوب اور انجام صفا
 یہ مثنوی ۱۸۸۵ء میں مطبع نول کشور کان پور میں بھی چھپی تھی۔ اس میں فدا علی عیش کا کہا ہوا
 قطعہ تاریخ ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مثنوی اسی مطبع میں ۱۲۸۸ھ میں چھپ چکی تھی۔
 قطعہ تاریخ درج ذیل ہے۔

عیش دریائے تعشق جب چھپی ہاتھ آئی قلمزم الفت کی تھاہ
 درۃ اللہاج سخن کیوں کر نہ ہو ہے کلام خسرو گیتی پناہ
 کیا ملا ہے گوہر تاریخ طبع خوب دزبیا مثنوی چھاپی ہے ۱۲۸۸ھ

دریائے تعشق کے دونوں ایڈیشنوں کا مقابلہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دوسرے ایڈیشن میں اس قدر لفظی تبدیلیاں کی گئی ہیں کہ وہ گویا ایک دوسری مثنوی بن گئی ہے۔ دوسرے ایڈیشن کا خاتمہ حسب ذیل ہے:

اب رو کو عنانِ خامہ اختر ہم جانتے ہیں کہ ہو سخن در
 دکھلا چکے طبع کی روانی لو ختم کرد کہیں کہانی

اس نظم کی مصنفوں سے لو داد
 غالب نے کہ سن کے پڑھراک شاد
 کس نور کی نظم ہے تمھاری
 گوہر سے سوا ہے آب داری
 امید ہے جب کہ یہ پڑھی جائے

ہر سو سے صدائے آفرین آئے ۱۲۲۲-۱۲۲۳

منشی محمد الف خاں صاحب رام پوری نے دریائے تعشق کے پلاٹ سے ایک
 ڈراما تیار کر کے نیرنگ قاف معروف بہ غزالہ ماہ رد اس کا نام رکھا۔ اس ڈرامے کو پہلی
 مرتبہ محمد وزیر نے اپنے بطع گلزار محمدی لکھنؤ میں چھاپ کر دسمبر ۱۹۰۰ء میں شائع کیا۔
 ناشر نے اپنے دیباچے میں لکھا ہے :

”اس تماشے کو سیٹھ نور دزدی صاحب مالک اور جنیل کٹوریاناک
 کمپنی نے بہت حسن انتظام سے ناظرین کو کر کے دکھلایا ہے۔ کہ اس
 کا اثر یہ ہے کہ ساہا سال گزر گئے ہیں مگر دلوں پر جوش اس وقت
 تک باقی ہے۔ وہ آخری سین جس میں لال پری کا خنجر مارنا اور زہر
 کھانا (دکھایا گیا ہے) کیا کیا دلوں پر اثر نہیں دکھلاتا ہے“

اس زمانے کے ایک ایکٹر سید نظیر حسن شفیق اکبر آبادی نے بھی دریائے تعشق کے
 قصے سے ایک ڈراما ترتیب دے کر جون ۱۸۹۲ء میں شائع کیا تھا، جس کا نام تھا
 ”غزالہ ماہ رد“ سلیس خلیق معروف بہ حیرت افزا مالک شفیق، ڈراما بنانے والے کی
 بے علمی اور بد سلیقگی اس نام ہی سے ظاہر ہے۔

بحر الف (اردو)، بطع سلطانی لکھنؤ، صفحات ۳۴۳ + صحت نامہ ۲ صفحے
 یہ واجد علی شاہ کی تیسری عشقیہ مثنوی ہے جو افسانہ ”عشق اور دریائے تعشق“
 کے بعد بھی لکھی گئی ہے۔ وہ خود کہتے ہیں۔

دوستوں نے لگا لیے حصے
 قبل بھی کہ چکا ہوں دو قصے
 ایک کا نام ہے ہسانہ عشق
 درحقیقت ہے کارخانہ عشق ۱۲۲۳

اس مثنوی کا نام ذیل کے شعروں میں بتایا ہے۔

دجی الفت ہوا جو نام اس کا : مثل دریا ہوا کلام اس کا حصہ ۳۳
عشق اس مثنوی میں تھا جو بھرا : دجی الفت ہر اکے اس کو کہا حصہ ۳۴
اس مثنوی میں تقریباً سوا چار ہزار شعر ہیں۔ شروع میں حمد، لغت، منقبت، مناجات
وغیرہ ۳۳ صفحوں میں ہیں، جن کے بعد اصل قصہ شروع ہوتا ہے۔

مطبوعہ نسخہ کے سرورق پر بادشاہ کی تصویر ہے۔ پشت تخت شاہی پر بیٹھا،
ہاتھ میں تلوار ہے، پہلوؤں میں دو خادموں پر چھلے ہوئے ہیں۔ حصہ ۱۵ تک تمام
عنوانات سرخ روشنائی سے کاتب کے لکھے ہوئے ہیں اور حصہ ۱۶ سے سیاہ روشنائی سے
چھپے ہوئے ہیں، مگر حصہ ۱۷ میں ایک عنوان پھر سرخ روشنائی سے لکھا ہوا ہے۔

اس مثنوی کا ایک مطبوعہ نسخہ برٹش میوزیم لندن میں ہے۔ اس میں واجد علی
شاہ کی چھپی ہوئی تصویر اور ابتدائی دو صفحوں کے چھپے ہوئے نقش و نگار میں کسی ہوشیار
نقاش نے رنگ بھر دیے ہیں جس سے ان کے قلمی ہونے کا دھوکا ہوتا ہے۔

برٹش میوزیم کی سلسلہ کی فہرست مطبوعات ہندوستانی کالم ۲۵۶ میں
مثنوی مہر پرور اور ماہ پروین کا ذکر کیا گیا ہے اور اس کے بارے میں لکھا گیا
ہے کہ یہ مثنوی واجد علی شاہ نے تخت نشینی سے تین برس پیش تر تخمیناً ۱۲۶۰ء میں کہی۔
بادشاہ نے دو مثنویاں افسانہ عشق اور دریا عیہ نعش دو دوسروں کی
فرمائش سے کہی تھیں، یہ مثنوی اپنی خواہش سے کہی۔ اپنی مفروضہ خوار ی
کے تخیلی بیان کے بعد لکھتے ہیں۔

شاہ طبع کا دکھا جو بن	اختر اب ترک کر یہ طرز سخن
چھپر رنگیں کوئی فناء عشق	کھول قفل در خزانہ عشق
ہمہ تن گوش ہیں سب اہل مذاق	دیر سے سامعین ہیں مشتاق
آتش عشق اور بھر کا دے	شکل بسمل دلوں کو پھر کا دے

داجد علی شاہ موسیقی میں اچھا دخل رکھتے تھے۔ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ وہ خوش الحانی سے شعر پڑھتے ہوں گے۔ اس مثنوی کے اشعار ذیل سے اس قیاس کی تصدیق ہو جاتی ہے۔

اس جگہ مصنفوں کا جمع ہے	یہیں خواندگی کا موقع ہے
درِ تحسین سے جھولیاں بھر لے	نام کرنا ہے آج تو کر لے
حسنِ خواندگی بھی آج دکھا	جودت دشوخی مزاج دکھا
پڑھ اس انداز سے فسانہ عشق	ہیں جو مستِ شراب خانہ عشق
سن کے تاگور انھیں نہ ہوش آئے	جب تلک استناں پڑھی جائے

مصنفوں کے تہ لب پہ داہ رہے
عشق بازوں کو شغلِ آہ رہے صد۳

مرثیوں کے مجموعے

توشہ آخرت (اردو)۔ مطبع سلطانی کلکتہ، ۱۲۹۹ھ، صفحات ۱۲۸۶
امام باڑہ بطن آباد میاں برج کلکتہ میں داجد علی شاہ کے مرثیوں کے چار قلمی مجموعے 'دہ مجلس' کے نام سے ہیں۔ تین مجموعوں میں دس دس اور ایک میں گیارہ مرثیے ہیں۔ ان دہ مجلسوں کی کتابت علی الترتیب محرم ۱۲۸۴، ۱۲۸۹، رمضان ۱۲۸۹ اور ذی الحجہ ۱۲۹۳ ہجری میں ہوئی۔ ۱۲۹۵ھ میں بادشاہ نے اپنے انہتر مرثیوں کا ایک بہت ضخیم مجموعہ مرتب کیا اور اس میں چاروں دہ مجلسوں کے سب مرثیے بھی شامل کر دیے۔ توشہ آخرت اسی مجموعہ مراثنی کا نام ہے۔

توشہ آخرت کا ایک کامل نسخہ مطلقاً کناروں اور عمدہ جلد کے ساتھ میاں بیج میں موجود ہے اور اس کا ایک ناقص نسخہ میرے کتب خانے میں بھی ہے۔ شروع کے چالیس صفحے قلم سے لکھے ہوئے ہیں۔ اور ص ۴۱-۲۰ مطبوعہ ہیں۔ صفحہ اول کے بعد دو صفحوں میں آٹھ بند کا ایک سندس ہے جس میں انہتر مرثیوں کی فہرست درج ہے۔

کتاب کا نام قوشہ آخرت، اور ترتیب کا سال ۱۲۹۸ھ بتایا گیا ہے۔ یہ منظوم نہرست
مراثی محرم کی تیرھویں تاریخ کو بنائی گئی تھی۔ جن مصرعوں سے یہ باتیں معلوم ہوتی ہیں وہ
ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔

ہفتاد ایک کم تھے مراثی جدا جدا ان سب کو جمع محنتوں سے اک جگہ کیا
قوشہ ہے آخرت کا یہ نام اب بھر ابھی ہے سن بارہ سو اٹھانوے میں یہ لکھا بھی ہے
تھی تیرھویں مہ الم و حزن و آہ کی نہرست غم کی شکل بنی برج ماہ کی
اس کتاب کے صفحات ۵۲۹-۵۷۸ میں ایک سو ستترہ بند کا ایک مرثیہ ہے، جس کا
مطلع ہے ”مطبوع طبع خرد و کلاں یہ کلام ہو“ اس مرثیہ میں بند ۱۵-۱۹ پانچ بند بے نقط
کہنے کے بعد بند ۲۱ میں مرزا دبیر کے بے نقط مرثیہ کی تعریف یوں کی ہے۔

کہتا بہت سیاہ میں کرتا ہزار تاد پر کیا مزہ کہ کھو گیا اگر لفظ کا بناؤ
آد کجا، مگر ہے یہ انداز اور آؤ آتا نہیں ہے حرف زبردستی کھینچ لاؤ

خوش فکریں دبیر سلامت رہیں مدام

والشربس یہ کام انھیں پر ہے اختتام

اس کے بعد کے دو بندوں میں مرزا دبیر کے اس مصرع پر اعتراض کیا ہے ...
”وہ ہر کا طلوع وہ صحر اکا سارا اگر د“ ضروری مصرع نقل کیے جاتے ہیں :

تائینت کو جو کر دیا تذکیر عیب کیا

تائینت میں سمجھتا ہوں کہ گرواہ ہے

میری نظر میں گرو مذکر نہیں دلا فاضل وہ ہیں انھوں نے کسی سے یہ ہو سنا

اس کے بعد کے بند میں اپنے عہد کے ممتاز مرثیہ گوئیوں کے لیے دعا کی ہے :

وہ کام کر کہ رضی ہو دل بند مرثیاتی اور دے دعا دبیر سلامت رہیں سدا

جو ذاکر حسین ہوں وہ تاجدار ہوں مونس انیس اس سبھی شہریار ہوں

اسی مرثیہ میں کچھ اور آگے بڑھ کر لکھتے ہیں :

میں کم سنی سے عاشق نظم و تیر ہوں واللہ لطف شعر میں اس کے اسیر ہوں
 مونٹنیں سب کایں ہوں خوشہ چین باغ ان کے کلام رکھتے ہیں ذکر کئے تر داغ
 ریاض العقربی (اردو) مطبع سلطانی کلکتہ ۱۳۰۰ھ، صفحات ۵۶۶،
 تقطیع کلاں۔

نوشہ آخرت میں سے ہر حال کا ایک مرثیہ لے کر اور ایک سو اکتالیس بند
 کا ایک مرثیہ طالع ہوا دینے میں وہ کون ماہ ہے شامل کر کے چھپیں مرثیوں کا یہ مجموعہ
 مرتب کیا گیا ہے۔
 مقتل معتبر۔

مجموعہ مرثیہ۔ اس کا ذکر وزیر نامہ میں ان لفظوں میں ملتا ہے ”مجموعہ جامعہ
 نوہ و سلام متضمن بیانہائے پُر اثر الملقب بہ مقتل معتبر“
 مجموعہ مرثیہ ہراتی مطبوعہ۔ مطبعہ نامعلوم

اس کتاب کا کوئی نام نہیں ہے۔ یہ پندرہ مرثیوں کا مجموعہ ہے۔ ہر مرثیے کے
 صفحات پر الگ الگ نمبر پڑے ہوئے ہیں، جن کی مجموعی تعداد ۳۴۲ ہے۔ ہر صفحے پر صرف
 دس دس بند ہیں، جن کے مصرعے خوب صورت ترتیب سے لکھے گئے ہیں۔ ایک مرثیہ
 شتوی کی شکل کا ہے۔

مجموعہ مرثیہ ہراتی مطبوعہ۔ مطبع سلطانی، کلکتہ۔ صفحات ۳۲۸
 دس مرثیے جو ۱۲۸ھ سے ۱۲۹۵ھ تک مختلف سالوں میں چھپے تھے ایک
 جلد میں بند ہوا لیے گئے ہیں۔

دفتر غم و محراب الم۔ مطبعہ دبئیہ احمدی، لکھنؤ۔ صفحات ۱۷۶
 اس جلد میں پچیس مرثیے ہیں۔ آخر کے کچھ درق کم ہیں۔

مرثیہ : ردے شہ دیں مٹھت رب دوسرا ہے ۔ مطبع سلطانی ، کلکتہ ۱۲۹۰ء صفحہ ۳۱۔

بادشاہ اپنا ایک ایک مرثیہ سرورق کے ساتھ چھپوا کر تقسیم کرتے تھے ۔
مرثیہ نو سرورق خیب نے دی مجھ کو یہ صدائے غم ۔ مطبع سلطانی ، کلکتہ ۱۳۰۲ء صفحہ ۲۸
تقطیع کلاں ۔

اس مرثیہ کے خاتمے پر 'کلام الملک ملک الکلام' کے عنوان سے ذیل کی عبارت درج ہے ۔

”این مرثیہ را کہ سید السلاطین خاقان ابن الخاقان سلطان ابن

سلطان معین السادات و السلین اعاد اللہ ملکہ و اجرہ فی بجا الفضل

والاحسان فلکہ نظر فرمودہ اند از زبان مبارک شنیدم و خود ہم دیدم ۔

عجب مرثیہ ایست کہ مشتمل بر خلاصہ مضامین احادیث ائمہ کرام علیہم

الصلوٰۃ والسلام است ۔ صلہ این نظم بانظام بحر حضرت جناب

سید الشہداء و ذریت طیبہ او علیہم التحیۃ اسلام و مدح و ثناء اس در قدرت

کیست و انا اضعف الناس السید محمد عباس عفا اللہ عنہ “

اس عبارت کے نیچے مہر ہے جس پر یہ الفاظ کندہ ہیں : تاج العلماء انتخا الفضلا مفتی سید

محمد عباس صاحب ۱۲۹۸ء

بادشاہ کے مرثیوں کے چار قلمی مجموعے جو وہ مجلس کے نام سے شایا بروج میں موجود

ہیں ان کا ذکر اوپر قوشہ آخرت کے ذیل میں کیا جا چکا ہے ۔ ان کے علاوہ دو مطبوعہ

مجموعے بھی شایا بروج میں ہیں ۔ ایک میں انیس مرثیے ہیں اور ایک میں چودہ ۔ ان

کے سرورق پر کوئی نام چھپا ہوا نہیں ہے ۔ مگر دونوں پر قلم سے 'دہ مجلس' لکھ دیا گیا ہے ۔

ان دونوں مجموعوں میں علیحدہ علیحدہ چھپے ہوئے مرثیوں کو ایک ساتھ جملہ کر دیا ہے ۔

دفتر پریشان ” در ذکر مصائب امام ہمام علیہ السلام “ کا نام وزیر نامہ میں ملتا

ہے یہ بھی غالباً بادشاہ کے مرثیوں کا مجموعہ ہے۔

بادشاہ کے علیحدہ علیحدہ شایع کیے ہوئے نو مرثیے اور میں نے دیکھے ہیں جو، ۱۲۸ھ اور ۱۲۹۶ھ کے درمیان چھپے تھے۔

ایمان (اردو) طبع اول۔ مطبع سلطان کلکتہ، ۱۲۸۸ھ، صفحات ۲۶۲
اس کتاب میں دو دفتر ہیں۔ دفتر اول میں ردیعت و اردیوان کی طرح ننانوے سلام ہیں۔ دفتر دوم میں اکاسی رباعیاں اور چند دوسری نظمیں ہیں۔ میں صفحوں میں بہت سے قطعات تاریخ ہیں۔

ایمان (اردو) طبع دوم۔ مطبع سلطان کلکتہ، ۱۳۰۱ھ، صفحات ۲۳۹، سائز اور سرورق ریاض القادب کا سا۔

اس ایڈیشن میں پہلے ایڈیشن کی تقریباً سب نظمیں اور بعض جدید شامل ہیں۔
بادشاہ کی ایک مٹی نواب زہرا بیگم حیدر آبادی نے بادشاہ کے کچھ سلاموں اور
نوحوں کا ایک مجموعہ کلید ایمان کے نام سے شایع کیا۔ اس کے ضمیمے میں ایک ایک
نوحہ عالم، کوکت اور خوش تحت کا اور پانچ نوحے اپنے شامل کر دیے۔

میں نے کتب خانے میں بادشاہ کے سلاموں اور نوحوں کی ایک مطبوعہ ریاض ہے جو
تشریع اور آخر دونوں طرف سے کم ہے۔ صفحات ۲۵ تا ۱۷۶ موجود ہیں۔ چند سلاموں پر ۱۲۸۵ھ
دستخط ۱۲۸۱ھ و ۱۲۸۲ھ درج ہیں۔ ہمارا اجابے گویاں ثاقب کا مندرجہ ذیل قطعہ تاریخ
اسی بیاض سے متعلق معلوم ہوتا ہے۔

جناب خسرو دہم جاہ اختر کہ حکمش باد از مہ تابماہی
بتدوین بیاض نور آگین ربود از خاطر عالم سیاہی

۱۔ وزیر نامہ، ص ۳۱، ۲۔ نظامی پریس لکھنؤ کا چھپا ہوا نسخہ میں کتب خانے

میں موجود ہے۔

۲۱۳

برائے انطباعش حکم فرمود
زفیض تاجہان گرد و مباہی

شنیدم از پے تاریخ ثاقب
کلید باب فیض بادشاہی
۱۲۸۲ھ

مرثیوں کے مندرجہ بالا مجموعوں سے ظاہر ہے کہ بادشاہ نے مرثیے بہت کئے
لیکن ان کی صحیح تعداد بتانا مشکل ہے، اس وجہ سے کہ بہت سے مرثیے ان مجموعوں میں
مکرر درج کیے گئے ہیں۔

مرثیوں کے علاوہ بادشاہ نے سلام اور رباعیاں بھی بہت کیں۔ نوے بھی
کئے، مگر ان کی تعداد اتنی زیادہ نہیں ہے۔

خطوں کے مجموعے

داجد علی شاہ پر استزاع سلطنت کا روح فرسا حادثہ گزرے ہوئے صرف
سال بھر ہوا تھا کہ ان کو قید فرنگ کی مصیبت بھی بھیلنا پڑی۔ لکھنؤ میں غدر ہو گیا اور
انگریزوں نے بظرف احتیاط ان کو فورٹ ولیم میں نظر بند کر دیا۔ چھبیس مہینے کے بعد
۸ رذی الحجہ ۱۲۴۵ھ (۹ جولائی ۱۸۵۹ء) کو وہ رہا کیے گئے۔ نظر بندی یا قید کا یہ
طولانی زمانہ انھوں نے لکھنے پڑھنے میں گزارا۔ دو مثنویاں حزن اختوار و بحر مختلف
اسی زمانے کی تصنیف ہیں۔ ان کے بہت سے منظوم خط اور غزلیں جو نظر بندی کے زمانے
میں لکھی گئی تھیں مجموعہ مبارک اسمعیٰ شیعہ فیض میں شامل ہیں۔ انھوں نے زیادہ دقت
اپنی دور افتادہ بیگموں سے خط و کتابت کرنے اور خطوں کے مجموعے مرتب کرنے میں صرف
کیا۔ اپنی تصنیف جنی میں انھوں نے اپنی کتابوں کی جو فہرست دی ہے اس میں نو
کتابیں ایسی ہیں جن کے نام میں لفظ تاریخ شامل ہے یعنی تاریخ مذهب، تاریخ
ممتاز، تاریخ خاص، تاریخ فراق، تاریخ مشعلہ، تاریخ غم الہ، تاریخ نور،

تاریخ جمشیدی، تاریخ دھور۔ ایسے ہی نام کی ایک اور کتاب سیسے علم میں ہے یعنی تاریخ مبدلہ۔ ان دس کتابوں میں سے چھ کتابیں میری نظر سے گزر چکی ہیں۔ یہ سب خطوط کے مجموعے ہیں۔ اس سے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ باقی چار کتابیں بھی اسی نوعیت کی ہوں گی۔ خطوں کے چھ مجموعے جو میں نے دیکھے ہیں ان کی مختصر کیفیت ذیل میں درج کی جاتی ہے۔

تاریخ جمشیدی

بادشاہ نے اس کا سبب تالیف یوں بیان کیا ہے:

”جب کہ ہم نے سفر کلکتہ اختیار کیا۔ صاحبات محل۔ خطوط دل نواز کہ ہر ایک مجموعہ عطروں شوق و ناز کا ہے، بھجواتی تھیں۔ باقی منظور خاطر ہوا کہ یہ اوراق پریشان منتظم ہو جاویں تاکہ صریح انتشار لیں نہارے امان پاویں۔ اس واسطے ماہ ذی الحجہ ۱۲۵۵ھ میں خطوط نواب جمشید بیگم صاحبہ کو مرتب فرمایا“

یہ ان بیالیس اردو اور فارسی خطوں کا مجموعہ ہے جو بادشاہ نے ۴ ربیع الاول ۱۲۵۳ھ سے ۳ ذی قعدہ ۱۲۵۵ھ تک کلکتے سے نواب جمشید بیگم کو لکھے تھے۔ کتاب کے آخر میں ایک قطعہ تاریخ ہے جو عنوان کی عبارت کے ساتھ نقل کیا جاتا ہے۔

”تاریخ ترتیب از دعا گوئے از لی مظفر علی ملازم بارگاہ حم جاہ

حضرت سلطان عالم جان عالم خلد ائد ملکہ و سلطنتہ“

بقیس کو لکھا ہے سلیمان جہاں نے اس نثر کا پریوں کی زبان پر ہے فناء
بے ساختہ لکھتا ہے ہنر مصرع تاریخ مجموعہ تحریر سلیمان زمانہ

۱۲۷۶ھ

میں نے اس کتاب کا نہایت خوش خط، مطلقاً، مذہب شاہی نسخہ دیکھا ہے۔
فیض آباد کے پنڈت اقبال کو مشن نشی گمر ٹوکی ملک تھا۔

تایخ ممتاز

یہ مجموعہ ہے ان خطوں کا جو بادشاہ نے نظر بندی کے زمانے میں بیگم ممتاز جہاں نواب اکیلی محل کو لکھنا بھیجے تھے اور جن کو بادشاہ کی فرمائش پر بیگم کے منشی اکبر علی خاں توقیر نے ۱۲۷۶ھ میں مرتب کر کے بادشاہ کی خواہش کے مطابق تاریخ ممتاز کے نام سے موسوم کیا۔ توقیر نے کتاب کے دیباچے میں لکھا ہے کہ وہ اکیلی محل کے یہاں ”بعدہ“ جو اب نویسی محبت نامہ جات“ ملازم ہیں۔

بادشاہ نے ایک خط میں ان بیگم کا نام یوں لکھا ہے ”ملکہ جہانیاں ممتاز جہاں نواب اکیلی محل زینب بیگم صاحبہ“ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا اصل نام زینب بیگم تھا اور ممتاز جہاں اور اکیلی محل ان کے خطابات تھے۔ بادشاہ کے خطوں میں چار غزلیں بھی شامل ہیں۔ ایک غزل کی ردیف ممتاز جہاں، ایک کی اکیلی محل اور دو کی زینب بیگم ہے۔ اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے۔ اس مجموعے کے دو حصے ہیں حصہ اول میں نو خط ہیں جو فورٹ ولیم میں نظر بند ہونے سے پہلے لکھے گئے تھے۔ حصہ دوم میں بیس خط ہیں جو ۱۲۷۵ھ ربيع الثانی ۱۲۷۵ھ اور ۱۲۷۶ھ صفر ۱۲۷۶ھ کے درمیان میں لکھے گئے۔ تاریخ ممتاز کا ایک خوش خط مطلقاً نسخہ جس کے حاشیے پر بہت خوبصورت گل کاری کی ہوئی ہے، لندن کے برٹش میوزیم میں موجود ہے۔ اس نسخے کی شان بتاتی ہے کہ یہی وہ نسخہ ہے جو داج علی شاہ کے لیے تیار کیا گیا تھا۔ میوزیم کی فہرست میں ہے کہ ممتاز جہاں نواب محمد علی خاں کی بیٹی اور نواب شجاع الدولہ کے فرزند نواب شہامت علی خاں کی نواسی تھیں۔

بادشاہ نے اپنے خط مورخہ ۱۲۷۵ھ میں لکھا ہے :

”ایک کتاب اپنے محبت ناموں کی تاریخ دار جس طرح ہم نے بھیجے ہوں، خوش تقطیع، بین السطور اچھا، مطلقاً، زینب، منقش کردا کے ہمارے پاس بھجواؤ۔ مگر جس طرح ہم نے لکھا ہے مع نظم و نثر اسی

ترتیب سے۔۔۔ اور اس کا نام تالیخ ممتاز رکھنا۔ اور بعد اس

کے تحفہ جلد اس کی بنوا کے ہمارے پاس بھجواؤ۔۔۔ جو کچھ اس میں

صرف ہو گا وہ ہم سے متعلق ہے۔ زینہار کچھ اس میں پس و پیش نہ کرنا۔

تالیخ ممتاز کا جو نسخہ بڑش میوزیم میں ہے وہ بادشاہ کی اسی فرمائش کی تعمیل میں تیار

کیا گیا ہے۔ راقم نے اس کتاب کا وہ خوب صورت اور شان دار ایڈیشن دیکھا ہے جس کو

ڈاکٹر محمد باقر صدیقی فارسی پنجاب یونیورسٹی لاہور نے مرتب کیا اور اردو مرکز لاہور

نے ۱۹۵۲ء (۹) میں شائع کیا۔ تالیخ ممتاز کے اس ایڈیشن میں اصل قلمی نسخے

کے پانچ صفحات کا عکس شامل ہے اور دراجد علی شاہ کی جوانی کی تصویر بھی ہے۔ یہ تصویر

اصل نسخے میں ورق ۱۳ اب پر بنی ہوئی ہے۔ بادشاہ ایک بلند تخت پر جس میں چار

زینے ہیں، تاج پہنے تلوار لگائے دو زانو بیٹھے ہیں۔ سر پر چتر شاہی، جسم پر شاہی

گادڑ، گادڑوں میں بچلیاں، گلے میں موتیوں کے ہار ہیں۔ تخت کے پائے پر دار جاوڑ کی

شکل کے ہیں۔ دونوں طرف دو دو عورتیں کھڑی ہوئی ہیں۔ ایک ایک کے ہاتھ میں

مورچھل، ایک کے ہاتھ میں موتیوں کے ہار ہیں اور ایک کے ہاتھ میں معلوم نہیں کیا ہے۔

تالیخ نور (۱)

یہ نور زماں سلیم کے پچاس خطوں کا مجموعہ ہے جو ذی قعدہ ۱۲۷۲ھ اور

ذی الحجہ ۱۲۷۵ھ کے درمیان لکھے گئے تھے۔ اس کا ایک قلمی نسخہ اور نٹیل پبلک

لائبریری پٹنہ میں موجود ہے۔ اس کے دیباچے میں بادشاہ لکھتے ہیں:

”ایک زمانہ ایسا تھا کہ پیش نظر ریوں کا جلسہ تھا۔ شہر لکھنؤ

پرستان تھا جس کا میں حکم ران تھا۔۔۔ اس بہشت نریت مرشت

کو فلکے نسکن زاغ دز غن بنایا، عند لیان نغمہ سیر کو آشیانوں سے

اڑایا۔ تقدیر ہم کو کلکتے میں لائی۔ یہاں بھی راحت نہ پائی۔ اسباب

آلام نمایاں ہوئے، داخل زندان ہوئے۔۔۔ بخط محبوبان عیسیٰ دم کے

آنے لگے ... دل مردہ کو جلانے لگے۔ سرمایہ حیات ان کو سمجھا کرتا تھا،
 جمع کیا کرتا تھا، اب طبع محبت آئین میں یہ آیا، ذہن الفت طریق
 ادھر لایا کہ ہر پروردگار کے رقعے جدا جدا کیجیے۔ ہر ایک کو مجتمع کر کے
 مجلد قرار دیجیے۔ چنانچہ یہ رقعے نواب نوروز ماں بیگم صاحبہ کے رقم ہوئے
 ہیں، کشت دل میں تخم محبت بوئے ہیں۔ اور نام اس مجلد کا تاج ذریعہ ہے۔
 بادشاہ نے اپنے خطوط کا مجموعہ مرتب کرنے کے بارے میں جیسا خط جمشید بیگم کو
 لکھا تھا دیا ہی خط نور ماں بیگم کو بھی لکھا جس کے جواب میں بیگم نے لکھا:
 ”جو تم نے لکھا تھا کہ ہمارے محبت ناموں کی تاریخ وار ایک
 کتاب مرتب کر دو جس طرح سے تم کو بھیجے ہیں اسی طرح علی الترتیب
 جمع کر دو۔ جان عالم حقیقت میں کیا اچھی بات ہے، واقعی اس
 طرح کی کتاب یادگار کائنات ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ عن قرب اس
 حکم کو ہم بجالاتے ہیں، جیسا تمہارا حکم ہے دیا ہی بنواتے ہیں۔ ہم نے
 تمہارے خطوں کو جان کے برابر حفاظت سے رکھا ہے۔ بہت تکلف
 سے اچھی طرح ایک نظم دان میں جمع کیا ہے۔“
 انتشارِ سلطنت کے بعد غدر سے پہلے اور غدر کے بعد بیگم کی حالت میں کیا فرق ہوا یہ
 نور ماں بیگم کے دو خطوں سے بخوبی ظاہر ہوتا ہے۔ ان خطوں کے متعلقہ اقتباس ذیل میں
 درج کیے جاتے ہیں:

خط مورخہ ۱۵ ربیع الاول ۱۲۷۳ھ میں لکھتی ہیں:
 ”گلشن خواجہ سرانے .. مجھ سے کہا کہ بیگم صاحبہ کیا غصہ ہے
 تھوڑے سے جانور باقی بچ رہے ہیں، بسبب خورشید بند ہونے کے
 نیلام کیا جاتے ہیں۔ جب سے یہ سنا ہے کمال صدمہ ہوا ہے کہ سولہ
 ہاتھی اور کچھ گھوڑے باقی رہے ہیں، سو ان کو بھی نہیں دیکھ سکتے۔“

تایخ فراق

یہ ملکہ دہر نواب نور دزی بیگم کے خطوط کا مجموعہ ہے۔ ان بیگم کا نام نور دزی بیگم عرف جانی بیگم، خطاب نواب ملکہ دہر اور نخلص خور تھا۔ اس کے دیباچے میں بادشاہ لکھتے ہیں :

”جب لکھنؤ سے میرا آنا ہوا تھا بیگمات و محلاتِ معالیٰ کا عجب حال تھا۔ چونکہ صدمہ فراق کی عادی نہ تھیں شبانہ روز سیل سرشک چشمِ خونبار سے بہاتی تھیں۔۔۔ اسٹرکارزمیں ارسالِ محبت نامہ جات کی جاری کیں۔ علی الخصوص ملکہ دہر نواب نور دزی بیگم صاحبہ کہ درحقیقت والہ و فریقہ جانِ عالم پر تھیں انھوں نے محبت نامے متواتر بھیجے۔ منظور خاطر فیضِ مظاہر یہ ہوا کہ ان کے محبت ناموں کو ایک جا جمع کرے تا صفحہ روزگار پر یہ چند اوراق یادگار رہ جائیں اور مبتدی اور شائق اس فن کے اس کے پڑھنے سے مستفیض و بہرہ مند ہوں۔ صاحبانِ ذی شعور کو لازم و مناسب ہے کہ اگر مولف سے کوئی غلطی سہو سے ہو گئی ہو اس پر اعتراض نہ کریں اور پردہ پوشی کریں۔ ستار العیوب ان کے بھی عیبوں کی پردہ پوشی کرے گا۔۔۔ نام اس کا تایخ فراق رکھا ہے“

ان بیگم صاحبہ کے خطوط کے ساتھ بہت سی غزلیں ہیں جو انھوں نے بادشاہ کو صلاح کے لیے بھیجی تھیں۔ اس کتاب کے دیباچے میں واجد علی شاہ نے فورٹ ولیم میں اپنی نظر بندی اور رہائی کا بیان یوں کیا ہے :

”قلعہ فورٹ ولیم میں دو سال ایک مہینا بے جرم و خطا مقید رکھا۔

... ساتویں تاریخ شہر ذی الحجہ ۱۲۴۵ھ روزِ شنبہ کو دو گھڑی دن آتی

ہے قلعہ سے رہا ہو کے داخل کوٹھی راجہ بردوان ہوئے“

تاریخ فراق کا ایک تہلی نسخہ ۱۲۴۵ھ کا لکھا ہوا اور فیض میک لائبریری پٹنہ میں موجود ہے،

جس میں جا بجا اصلاح و ترمیم کی گئی ہے، جو ممکن ہے کہ خود بادشاہ نے کی ہو :
تایخ مبدر

یہ بادشاہ کے نام ان کی ایک بیگم نواب بدر عالم کے چوبیس خطوں کا مجموعہ ہے جو بادشاہ نے ذی الحجہ ۱۲۴۵ھ میں مرتب کیا۔ یہ خط محرم ۱۲۴۶ھ سے صفر ۱۲۴۶ھ تک لکھے گئے تھے۔ اس مجموعے کے آخری تین خط جو ذی الحجہ ۱۲۴۵ھ کے بعد لکھے گئے تھے وہ اس مجموعے کی ترتیب کے بعد شامل کیے گئے ہوں گے۔

یہ بیگم شاعرہ تھیں اور بدر عالم تخلص کرتی تھیں۔ اس مجموعے میں ان کے چند تنظیم خط اور غزلیں وغیرہ شامل ہیں۔ بادشاہ اس کے دیباچے میں لکھتے ہیں :
”جب پہر قلموں نے نیا رنگ دکھلایا اور سفر کلکتہ کا اتفاق ہوا“
بعض محلات سلطانی کہ حلیاب دوری اور پردہ ہجوری میں رہیں، اکثر خطوط درد آمیز بھجواتی تھیں اور اشتیاق اور محبت کو یاد دلاتی تھیں۔ پیاسی اسم اُلفت کے سطح نظر ہوا کہ وہ قراطیس حسن تالیف پادیں تاکہ رائیگاں نہ جا دیں۔ لہذا ماہ ذی الحجہ ۱۲۴۵ھ میں خطوط نواب بدر عالم صاحبہ کو زور ترتیب عطا کیا۔۔ اور تایخ مبدر نام رکھا۔

تاریخ مبدر کا خاتمہ اس کے کاتب حبیب الدین احمد بردوانی نے عربی میں لکھا اور ۱۶ جمادی الآخر ۱۲۴۶ھ کو اس کی کتابت سے فراغت پائی۔

تایخ مبدر کا ایک تلمی نسخہ ادارہ ادبیات اردو حیدر آباد دکن کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔ اس کا ایک مطبوعہ نسخہ میسر کتب خانے میں ہے، جس کو سید محمد علی نعمانی عریش علی آبادی معتمد انجمن ترقی علوم قدیمہ حیدر آباد دکن نے ۱۳۲۲ھ میں قاسم پریس حیدر آباد میں چھپوا کر شایع کیا۔ مطبوعہ نسخے کے سرورق پر اس کا نام دفعات مبدر لکھا گیا ہے، مگر اس کا صحیح نام تاریخ مبدر ہے۔

تاریخ غزالہ

داحد علی شاہ کلکتے سے بیگم ملکہ غزالہ کو جو محبت نامے بھیجا کرتے تھے وہ ان کو برحقاظ
 رکھتی جاتی تھیں۔ لیکن جب غدار کے ہنگامے میں ان کو کچھ مدت کے لیے لکھنؤ چھوڑنا پڑا تو وہ
 خط تلف ہو گئے۔ رجب ۱۲۴۵ھ میں وہ لکھنؤ واپس آئیں۔ ۲۸ رجب سے آخر ذی الحجہ
 تک بادشاہ کے جو خط آئے ان کو محفوظ رکھا۔ فورٹ ولیم سے داحد علی شاہ کی رہائی کی خبر
 سن کر وہ کلکتے چلی گئیں اور وہیں ان کیس خطوط کا مجموعہ مرتب کر کے تاریخ غزالہ اس
 کا نام رکھا۔ انھوں نے یہ مجموعہ بادشاہ کی فرمائش سے مرتب کیا تھا جیسا کہ ایک خط کے مندرجہ
 ذیل اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے :

”میں نے اپنا کلام جمع کرنے کو ہمتا بادشاہ کو حکم دیا ہے۔
 تم سب محبت ناموں کی نقلیں ان کو دینا اور دیا کرنا۔ اور ایک کتاب اپنے
 محبت ناموں کی تاریخ و احوال جس طرح تم نے بھیجے ہیں خوش تقطیع، میں اسطور
 اچھا، مطلقاً، مذہب، نقش کر کے ہمارے پاس بھجواؤ۔ مگر جس طرح سے
 تم نے لکھا ہے مع نظم اسی ترتیب سے۔ اور دیباچہ اس کا اپنے نام پر کرنا
 کہ یہ محبت نامے مرسلہ جان عالم ہم نے اپنی فرط محبت سے جمع کیے ہیں۔
 اور اس کا نام تاریخ غزالہ رکھنا۔ بعد اس کے تحفہ جلد بنوا کر ہمارے
 پاس بھجواؤ۔ جو اس میں صرف ہوگا وہ ہم سے متعلق ہے۔“

تاریخ غزالہ کا ایک خوش خط قلمی نسخہ میرے کتب خانے میں ہے۔ اس کی تاریخ کتابت
 ۵ جمادی الاولیٰ ۱۲۴۶ھ ہے۔ کتاب میں دیباچہ اور خاتمہ اور تین قطعات تاریخ بھی
 شامل ہیں۔ ایک قطعہ فارسی میں ملکہ غزالہ کا کہا ہوا ہے اور ایک اردو میں ان کے سکرٹری
 علی جان شفق کا کہا ہوا ہے۔

تاریخ غزالہ کا ایک مطبوعہ نسخہ بھی میرے کتب خانے میں ہے، جس کو سید وصی
 بلگرامی نے مطبع مفید عام اگرہ میں چھپوا کر ۱۹۱۴ء میں کوآتھ صلیع آرہ سے شائع کیا تھا۔

اس میں ناشر نے 'تمہید' کے عنوان سے ایک دیباچہ شامل کر دیا ہے اور کتا کے آخر سے عبارت خاتمہ اور قطعات تاریخ حذف کر دیے ہیں۔

تایخ مشغلی

یہ مجموعہ خطوط میری نظر سے نہیں گزرا۔ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ اس میں مشغلۃ السلطان نواب آبادی جان میگم کے خطوط ہوں گے، جن کے نام بادشاہ کا ایک خط مجموعہ مبارک میں ص ۲۱۸-۲۱۹ پر درج ہے۔

بادشاہ کی جن کتابوں کے نام میں لفظ تاریخ شامل ہے ان میں سے تین یعنی تایخ خاص، تایخ دھراد اور تایخ مذهب باقی رہ گئی ہیں جن کے بارے میں مجھے کچھ معلوم نہیں۔

خطوط داجد علی شاہ بہ نام نواب شیدا میگم (تایخ مذهب ۹)

ان خطوں کا ایک مجموعہ بڑے سائز کا خوش خط، طلا کاری میں نے دیکھا ہے، جس کے بین اسطور میں سونا لگایا گیا ہے اور چوڑے حاشیوں میں طلائی حیدرلوں کے درمیان طرح طرح کے خوبصورت نقش و نگار سونے کے پانی سے بنائے گئے ہیں۔ سینچہ دونوں طرف سے ناقص ہے۔ دیباچہ اور پہلے خط کا ابتدائی حصہ، اکیسویں خط کے آخری حصے سے پچیسویں خط تک اور اٹھائیسواں خط غائب ہیں۔ آخری خط جس کا نمبر ۳۰ ہے ناتمام ہے۔ معلوم نہیں کتنے خط اور تھے۔ اس مجموعے میں جاجاد داجد علی شاہ کی نظمیں شامل ہیں۔ مگر ان نظموں میں تخلص کی اور خطوں میں بادشاہ کے نام کی جگہ زیادہ تر سادی چھوڑ دی گئی ہے، غالباً سرخ روشانی سے لکھنے کے لیے کہیں کہیں شیدا میگم کو شیدائ محل لکھا ہے۔

اس مجموعے کے خطوط ربیع الاول ۱۲۰۳ھ سے جمادی الثانی ۱۲۰۳ھ تک لکھے گئے تھے۔ اس نسخے کی نقل میسر سے کتب خانے میں موجود ہے اور ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی نے یہ خطوط اپنی کتاب ادب کا مقصد میں شائع کر دیے ہیں۔

اس ناقص الطرفین نسخے میں اس کا نام کہیں درج نہیں ہے۔ بادشاہ نے

خطوں کے ایک مجموعے کا نام تالیخ مذهب بتایا ہے اور ذہب یعنی سونے کا اتنا کام کسی اور مجموعے میں نہیں ہے۔ قیاس کہتا ہے کہ اس مجموعے کا نام تالیخ مذهب ہے۔ گل دستہ عحبت

یہ بادشاہ کے نام نواب آراستہ بانو فریدون بیگم کے بایں خطوں کا مجموعہ ہے۔ دو خط ذی الحجہ ۱۲۴۲ھ کے اور بیس خط ۲۵ جمادی الاولیٰ سے ۲۳ ذی الحجہ ۱۲۴۵ھ تک کے ہیں۔ یہ مجموعہ بادشاہ نے ذی الحجہ ۱۲۴۵ھ میں مرتب کیا۔ اس کا ایک قلمی نسخہ ۲۲ ربیع الاول ۱۲۴۶ھ کا لکھا ہوا پٹنہ یونیورسٹی کے سابق پروفیسر ڈاکٹر عظیم الدین احمد کے پاس تھا۔ اس کے کاتب حبیب الدین احمد بردوانی نے اس مجموعے کا نام پہلے کچھ اور لکھا تھا پھر اس کو پھیل کر گلدستہ عحبت لکھ دیا۔ یہی حبیب الدین احمد بردوانی تالیخ مبدع کے بھی کاتب ہیں۔

افسوس التواریخ

یہ داجد علی شاہ کے نام نواب جمشید بیگم کے سینا لیس خطوط کا مجموعہ ہے جس کو داجد علی شاہ نے ذی الحجہ ۱۲۴۵ھ میں مرتب کیا۔ جمشید بیگم اپنے بھائی سے اپنے حسب حال غریبیں کہلو کر اپنے خطوں کے ساتھ اصلاح کے لیے بھیجا کرتی تھیں۔ آخری چند خطوں میں کاتب نے اپنا نام منظر علی ہنر لکھا ہے۔

جمشید بیگم کے تین بھائی میر علی حسین فارغ، میر عنایت حسین عادل اور میر امداد حسین تھے۔ پہلے دو بھائی جمشید بیگم کے ساتھ کھتے چلے گئے اور بادشاہ کے ملازم ہو گئے۔ ان کے قطعات تاریخ بادشاہ کی بعض کتابوں میں ملتے ہیں۔ اس کتاب کا ایک جدید النسخہ قلمی نسخہ میرے کتب خانے میں موجود ہے۔

بیگمات اودھ کے نامہ نویس

بیگمیں بالعموم ایسی رنگین، منفی، پر تکلف عبارت نہیں لکھ سکتی تھیں جو بادشاہ کو پسند آئے۔ اس لیے وہ اچھے انشا پردازوں کی خدمات حاصل کرتی تھیں۔ منشی اکبر علی خاں توفیر ممتاز جہاں نواب اکلیل محل کے یہاں شاہی محبت ناموں کی جواب نویسی کے لیے ملازم تھے۔ مظفر علی ہنر نواب جمشید بیگم کے یہاں منشی تھے۔ علی جان شفیق ملکہ غزالہ کے خط نویس تھے۔ ابداد علی عشر نواب شید ابیگم اور بعض دوسری بیگموں کے نامہ نویس تھے۔ امیر علی خاں ہلال نواب نوروزی بیگم کی طرف سے خط لکھنے پر مامور تھے۔ میاں بشیر زیب عالم ہادی بیگم کے نامہ نویس تھے۔ راجہ جے گوپال تانق شجاع الدولہ کی پردتی نواب بیگم بنت نواب حسن علی خاں بہادر کی طرف سے بادشاہ کے محبت ناموں کا جواب لکھنے پر مامور تھے۔ منشی کنج بہاری لال آختم بعض بیگموں کی طرف سے خط لکھا کرتے تھے۔ ان خطوں کے پیاس ساٹھ مسودے ان کے پاس جمع ہو گئے تھے، جن میں سے اکثر غدر کے ہنگامے میں تلف ہو گئے۔ صرف گیارہ مسودے باقی رہ گئے تھے جن کا مجموعہ انشائے راحت دُوح کے نام سے مرتب کر کے ۱۲۸۷ھ میں مطبع حسینی اثنا عشری لکھنؤ میں چھپوا کر شایع کر دیا۔ انشائے مسودے میں چار خط ایسے شامل ہیں جو جب علی بیگ سرور نے کسی بیگم کی طرف سے بادشاہ کو لکھے تھے۔ سید علی حیدر نظم طباطبائی نے بھی بعض بیگموں کی طرف سے بادشاہ کو خط لکھے۔ صفدر مرزا پوری کے نام ایک طولانی خط میں انھوں نے اپنے دو خطوں کے اقتباس نقل کیے ہیں جو انھوں نے ملکہ رسیم تن اور نواب شہزادہ محل کی طرف سے لکھے تھے۔ طباطبائی کا یہ طولانی خط مرقع ادب جلد اول میں شامل ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ خود بادشاہ بیگمیں کے لیے نامہ نویس مقرر کر دیتے تھے۔ ملکہ غزالہ کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں :

”اے غزالہ حسب فرمائش تمہارے لڑکیاں شوق کو ہم نے میں نے پے
ہینے کا نوکر رکھ کر تمہاری خطوط نویسی کے واسطے مقرر کیا :

(تایخ غزالہ مطبوعہ ۲۴-۲۵)

بادشاہ کا ایک خط کلکتے سے ان کی بیگم زیب عالم کے نام لکھوا آیا جس کا منظوم جواب درودہ میرزا جلال علی نے میاں مشیر سے لکھوا کر بھیجا۔ بادشاہ کو وہ خط پسند آیا اور انھوں نے مشیر کو تیس روپے ماہوار تنخواہ پر بیگم کا نامہ نویس مقرر کر دیا۔ مشیر نے یہ واقعہ یوں بیان کیا ہے۔

دروہ نے فوراً روانہ کیجا	وہ خط نظم کر کے جو میں نے دیا
فلانے دکھائی خوشی کی اس اس	گیا رفتہ رفتہ جو سلطان کے پاس
پسند مزاج مبارک ہوا	مقرر رہا بس یکا یک ہوا
مری مشر نے تنخواہ کی دستخط	اسی وقت غم ہو گیا سب غلط
ہوئی تیس کی ماہ داری مری	عدم ہو گئی زیر باری مری
زیر پنج ماہ ملا پیشگی	عنایت یہ سلطان عالم نے کی
انھیں کے محفل میں مقرر ہوا	اسا جن کے خط میں مقرر ہوا
پڑی کا سلیمان نے تابع کیا	مجھے اوج نامہ نویسی دیا

ملا جب کہ مجھ کو یہ عہدہ فقط

بہت سے لکھے نظم اور نثر خط

ان خطوں کو دیکھ کر بادشاہ نے بیگم زیب محل سے فرمائش کی کہ اپنے حالات ایک مثنوی میں
مشیر سے لکھواؤ۔ مشیر نے بادشاہ کے حکم کی تعمیل میں مثنوی کہی اور اس میں لکھا ہے
ہوا حکم ناگاہ یہ دل پذیر Channel eGangotri Urdu

سو اے جان جان چاہتا ہے یہ جی
 شروع جوانی سے تائیں زماں
 کہو صاف جس جس یہ آیا ہو دل
 ہماری محبت ہوئی کس طرح
 کہ کہو اؤ تم اس سے اک مثنوی
 جو گزری ہو تم پر کر دسب بیاں
 جوانی میں جس سے لگایا ہو دل
 بتاؤ یہ الفت ہوئی کس طرح
 نہ ہو بھوٹ اس حال میں زینہار
 مگر شعر ہوں یا پنج یا چھ ہزار

خطوں کا طرز نگارش

عبد الحکیم شرر کا بیان :

”بادشاہ اور ان کے محلات کے درمیان میں جو خط و کتابت ہوتی
 وہ خطوط تو دود نامہ کے لفظ سے یاد کیے جاتے اور اکثر نگین و پرفشان کاغذ
 پر ہوا کرتے۔ محلات کی طرف سے جتنے تو دود نامے جاتے کاغذ کی طرح
 نہایت ہی نگین اور مقفی عبارت میں ہوتے اور ان میں زبان کی پاکیزگی
 کے ساتھ نہایت ہی مشتمل و رفتہ بامحاورہ زبان کا لحاظ رکھا جاتا
 اور عاشقانہ نگین بیانی ہوتی۔ انوس وہ ذخیرہ فنا ہو گیا اور نہ میسر
 خیال میں اس سے اچھا ادبی ذخیرہ اور زبان کو پھر نہ نصیب ہو سکے گا۔
 اتفاق سے ایسے تو دود نامہ جات کثرت سے میری نظر سے گزرتے رہے اور
 میں انھیں نہایت ہی شوق سے پڑھا کرتا۔ اور اصل حقیقت یہ ہے کہ
 مجھ میں جو کچھ ادبی ذوق پیدا ہوا وہ انھیں تو دود ناموں کے پڑھنے کی برکت سے ہے۔“

لے ان خطوں کے متعدد مجموعے اب بھی موجود ہیں، جن کی تفصیل ادب پریش کی جاکچ ہے۔

تہ مقدمہ حزن اختر شایعہ

نظم طباطبائی ایک خط میں صفدر مرزا پوری کو لکھتے ہیں :

”میں جس زمانے میں مٹیابرج پہنچا ہوں تو داجہ علی شاہ طابراہ
 شراردو کی طرف بہت مائل تھے۔ سمجھ کی پابندی کے ساتھ فارسی
 کے منشیانہ الفاظ اور ایہام و اغراق و تجنیس کی پیچیدگیاں، معنی کی نزاکت
 بہت پسند خاطر تھی۔ محلاتِ معلیٰ کو عاشقانہ تحریریں اردو میں لکھتے تھے۔
 ایک دیسراے کو محبت نامے حسب دستور فارسی میں جایا کرتے تھے اور
 ان کی عبارت کبھی درہ ناد رہ سے کم نہ ہوتی تھی۔ اکثر ادھر سے ترنگا
 ہوا کرتی تھی کہ محبت نامے کی عبارت میں بہت اخلاق ہوا کرتا ہے۔
 آسان عبارت لکھا کیجے۔ غرض اردو میں طہوری و طغرائی سی نشر لکھنے کا
 مٹیابرج میں بہت چرچا ہوا۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ زبان نے نیا جسم لیا
 اور برن بدلا۔“

”میں اپنے چند فقرے نمونے کے طور پر لکھتا ہوں اور لکھتے ہوئے
 ڈرتا ہوں کہ اس زمانے کے انشا پرداز سنیں گے۔“

ملکہ سیم تن کی طرف سے :

”ان دیوں قوت نامیہ کو گل کاری کی تائید رہے اور دولت چین
 کو بیداری کی تہدید۔ صحن گلستان و بہستان ساز و آواز ہے اور
 قمریان خوش نوا اصولِ فاختہ سے دم ساز۔ سپیدہ صبحِ دلخ شقائق کو
 مرہم کافوری ہے، اوس کی بوندیں گلاب کے کٹوروں میں بادِ انگوری۔ آبِ
 رنگ چین سخن آموزِ ملبیل تصویر ہے، باغِ دروغ و دشت و درجبتِ نظیر ہے۔
 تارِ گل زخیمہ منقادِ ملبیل سے نغمہ ریم ہے، کاروانِ عنادل ترانہ دل کش
 سے شور انگیز۔ فراسش نقرہ فروش ماہ چاندنی لیے مصروفِ فرش گستری
 ہے، آفتابِ زریں دستارِ سندرز تار کچھانے کو حاضر۔ قصرِ قصیری میں

ہمارے انضال الہی جیتر شاہی پر بال افشان ہے، یہ حسین صحت
خاقان سکندر شان ہے۔“

نواب شہزادہ محل کی طرف سے :

”لو موسم سرا بھی تمام ہوا مگر زخم جگر کو نہ التیام ہوا۔ باران
شبہم تا سحر رہا، مگر دیدہ پر غم ہر وقت نذر رہا۔ ٹھنڈی ہوا گو کم ہے،
مگر آہ سرد کا دہی عالم ہے۔ آئینہ آفتاب نفس رسیدہ ہے کہ نالہ فراق صو
د میدہ ہے۔ داغ سرد ہری محبوب میں حرارت آفتاب حاصل ہے، تیرنگاہ
ترازو ہو کر برج میزان سے مقابل ہے۔ تیرگی شب فراق حصے میں آئی ہے۔
سیاہ بختی گڑھ میں ہے، نلے کی قسمت پائی ہے۔“

راقم حروف ۱۹۳۱ء کے موسم گرما میں واجد علی شاہ کی تصانیف کی تلاش میں ٹپنہ اور
کلکتہ گیا۔ یہ تو معلوم تھا کہ بادشاہ کے کتب خانے کی کچھ کتابیں اور ان کی کچھ تصنیفیں مٹیابرج
میں موجود ہیں۔ کلکتہ پہنچ کر پتہ لگا کہ شاہ مرحوم کی کچھ کتابیں اتحادیہ لائبریری میں بھی
ہیں۔ یہ ایک چھوٹا سا کتب خانہ گورچیت پور روڈ پریس راج بلڈنگ میں تھا۔ کتب خانے کے
ناظم ملا آسن سے معلوم ہوا کہ وہاں بادشاہ کے خطوں کی کئی جلدیں بھی تھیں جو اس وقت
وہاں موجود نہیں تھیں۔ کلکتہ سے واپسی کے چند ماہ بعد میں نے ملا آسن کو خط لکھ کر ان جلدوں
کے بارے میں دریافت کیا۔ انھوں نے اپنے جواب مورخہ، ۱۹۳۲ء میں لکھا۔

”افسوس کہ خطوط واجد علی شاہ اختر مرحوم لائبریری میں اس وقت

موجود نہیں ہیں۔ ان خطوں کی چار جلدیں پرنس عیاس مرزا صاحب

نصیرہ واجد علی شاہ مرحوم کے یہاں ہیں۔ اس وقت پرنس موصوف

کو ان خطوں کی ضرورت ہے اس لیے انھوں نے اپنے پاس

رکھے ہیں۔“

۱۹۵۹ء میں انجمن ترقی اردو کی کل ہنداردو کانفرنس میں شرکت کی غرض سے

میں دوبارہ کلکتے گیا لے اس وقت اتحادیہ لائبریری پہلے والی عمارت سے تھوڑے فاصلے پر ایک دوسری عمارت کے ایک کمرے میں ایک دشوار گزار جگہ پر منتقل ہو چکی تھی۔ اس کے ناظم بھی بدل چکے تھے۔ اس مرتبہ بادشاہ کے خطوط کی مذکورہ بالا جلدوں کا کچھ پتہ نہ چلا۔

واجد علی شاہ اور ان کی بیگیوں کے خطوط کے بعض مجموعے بعض لوگوں نے اپنے اپنے طور پر مرتب کیے جن میں سے دو چھپ کر شایع ہو گئے (۱) تحریر اسرار سلطانی معروف بہ رفات بیگات مرتبہ محمد امتیاز علی خاں نجیب فرخ آبادی مطبوعہ مورخ گمینی فرخ آباد سنہ ۱۹۰۲ء۔ یہ نوے خطوں کا مجموعہ ہے۔ کتاب دو قسموں میں تقسیم کر دی گئی ہے۔ قسم اول میں بیگیوں کے ستر خط بادشاہ کے نام اور قسم دوم میں بادشاہ کے میں خط بیگیوں کے نام ہیں۔ تحریر اسرار سلطانی کتاب کا تاریخی نام ہے جس سے اس کا سال ترتیب ۱۳۱۹ھ نکلتا ہے۔

(۲) بیگات اودھ کے خطوط مرتبہ مفتی محمد انظام اللہ شہ آبی اکبر آبادی مطبوعہ فاروقی پریس، دہلی۔ اس مجموعے میں اٹھتر خط ہیں، ساٹھ خط بیگیوں کی طرف سے بادشاہ کے نام، چودہ خط بادشاہ کی طرف سے بیگیوں کے نام اور چار خط بعض بیگیوں کی طرف سے دوسری بیگیوں کے نام ہیں۔

منشی ظہیر الدین بلگرامی کا ارادہ تھا کہ معزول بادشاہ کے خطوں کا مجموعہ منشآت سلطانی کے نام سے مرتب کریں (اسرار واجدی قلمی ص ۶۰۳) مگر غالباً ان کا یہ ارادہ پورا نہیں ہوا۔

سید تمکین کاظمی حیدر آبادی بھی ان خطوں کا ایک مجموعہ مرتب کر رہے تھے۔ انھوں نے راقم کے نام اپنے خط مورخہ ۴ اپریل ۱۹۵۹ء میں لکھا تھا۔

”میں نے سلطان عالم داج علی شاہ اختر کی بیش تر محلات کے فقہاء
ان کے نام اور خود سلطان عالم کے رقعات محلات کے نام جمع کیے ہیں۔
چنانچہ مسیکے پاس تقریباً ڈیڑھ سو رقعات اس وقت موجود ہیں...
”کراچی کے ایک پبلشر سے طبع کرنے پر آمادہ ہیں اس لیے میں ان
رقعات کو کتابی صورت میں مرتب کر دینا چاہتا ہوں یقین ہے کہ آپ کے
بے نظیر کتب خانے میں بھی خاصہ ذخیرہ ہوگا۔ اگر مناسب تصور فرمائیے تو اس
کو بغرض اشاعت عنایت فرمائیے“
افسوس ہے کہ تمکین صاحب کا انتقال ہو گیا اور شاید اس مجموعے کو مرتب اور
مکمل نہ کر سکے۔

بادشاہ کی بعض کتابوں کی شرحیں

- ۱۔ مواہب سبحانیہ۔ فی شرح صحیفہ سلطانیہ بادشاہ کی کتاب صحیفہ سلطانیہ کی بہت ضخیم شرح فارسی زبان میں ہے شروع میں پانچ صفحے کا منظوم دیباچہ ہے۔
- ۲۔ بادشاہ کی کتاب مباحثہ بین النفس والعقل کی شرح۔
- ۳۔ بادشاہ کی کتاب جوہر عن وض کی شرح۔
- مندرجہ بالا تینوں شرحیں نجم العلماء سید ہدایت حسین نے لکھ کر بادشاہ کو نذر کیں۔
- ۴۔ شرح فصاح اختاری۔ بادشاہ کے بہت مختصر رسالے فصاح اختاری کی بہت تفصیلی اور عالمانہ شرح فارسی زبان میں منشی محمد شفیع رضوی نے لکھی۔ اصل رسالے میں صرف پندرہ صفحے ہیں اور شرح کی ضخامت ایک سو نو صفحے ہے۔ یہ شرح ۱۲۷۵ھ میں لکھی گئی اور ۱۲۷۶ھ میں مطبع اودھ گزٹ لکھنؤ میں چھپی۔
- ۵۔ فخر قدسی۔ یہ بادشاہ کی کتاب صوٹ المبارک کی شرح امیر میانی نے لکھی۔
- ۶۔ رموز تدقیقات۔ یہ بادشاہ کی ایک مختصر عربی تشرہدایت السلطان کی بہت تفصیلی شرح امیر میانی نے لکھ کر ۱۲۸۶ھ میں بادشاہ کی خدمت میں پیش کی اور بادشاہ کے حکم سے لکھنؤ کے شاہی مطبع میں چھاپی گئی۔ رموز تدقیقات کا ایک مطبوعہ نسخہ راقم کے کتب خانے میں موجود ہے۔ اس کا کوئی دوسرا نسخہ غالباً نایاب ہے۔ اس لیے اس کے بارے میں چند فقرے لکھے جاتے ہیں۔

۲۳۲

رموز و تدقیقات بڑی تقطیع کے ساتھ صفحوں پر مشتمل ہے۔ بادشاہ کی عربی
تحریر ان لفظوں سے شروع ہوتی ہے۔ هَذَا كِتَابُ أَحَقَّ الْعِبَادِ
سُلْطَانِ الْعَالَمِ الْمُتَّصِنِ النَّصَاحِ اور شرح کے خاتمے کی عبارت
حسب ذیل ہے :-

”باہتمام کپتان مقبول الدولہ مرزا امجد علی خاں بہادر
قبول تصحیح خانہ زاد امیر علی خاں ہلال و بخط خانہ زاد محمد خورشید
باختتام رسید“

۴۔ ہدایت السلطان کی طرح بادشاہ کی ایک دوسری مختصر عربی نثر ارشاد
السلطان کی شرح بھی امیر مینائی نے لکھی تھی مگر اس کا کوئی نسخہ بڑی تلاش
کے باوجود دستیاب نہیں ہوا۔

ہدایت السلطان اور ارشاد السلطان امیر مینائی کی دو تصنیفیں
قرار دی گئی ہیں اور ان کے متعلق طرح طرح کے بے بنیاد قیاسات قائم کر لیے
گئے ہیں۔ راقم حروف نے ایک مضمون میں ان قیاسات کو نقل کر کے اصل حقیقت
 واضح کر دی ہے۔ یہ مضمون امیر مینائی کی دو کم یاب کتابیں کے عنوان سے
اخبار ہمدانی زبان علی گڑھ مورخہ ۲۳ ستمبر ۱۹۶۶ء میں شائع ہو چکا ہے۔

بعض کتابیں جو بادشاہ کے لیے یا ان کے حکم سے لکھی گئیں

روضۃ الصفا (ترجمہ اردو)

شیخ ہمدی علی خاں زکی کے مطبوعہ کلیات سے معلوم ہوتا ہے کہ داہد علی شاہ کے حکم سے ناصر نے شاہ ۱۲۱۵ھ میں فارسی کی نہایت ضخیم تاریخ روضۃ الصفا کا اردو میں ترجمہ کیا۔ زکی نے اس ترجمے کے لیے دو قطعہ تاریخ کئے، جن سے عجیب صنعتوں کے ساتھ طرح طرح پر تاریخ نکلتی ہے۔ دونوں قطعوں کے ابتدائی دو دو شعر حسب ذیل ہیں :

کتاب سیر روضہ باصفاست مترجم شدش ہمارا اہل ایمان
بہندی چناں ترجمہ کرد واضح کہ مشدبے تکلف عیاں معنی اس

زاں روضہ کہ باصفاست معرفت یکر این ترجمہ ہندی بہ معالم آمد
از جودت طبع ترجمان شد ناصر عالم ہمہ زان نوشتہ عالم آمد
زکی کو بادشاہ نے ملک الشعر اخطاب عنایت کیا تھا۔ (سلا یا سخن ص ۱۸۵ و سخن شغل ص ۲۳)

مفید الاذہان

قائمۃ الدین مولوی میرزا محمد علی مجتہد نے بادشاہ کی فرمائش پر اس مسئلے سے بحث کی ہے کہ نصاریٰ کے ہاتھ کا کھانا جائز ہے یا ناجائز۔ یہ رسالہ اپنے سال تالیف ۱۲۸۶ھ میں مطبع سلطانی کلکتہ میں چھپا۔

اشراق اختاری

بادشاہ روز صبح کو وظائف پڑھا کرتے تھے۔ ان میں ایک دعائی جو صرف وقت مقررہ پر یاد آتی تھی، دو سکر وقتوں میں اس کے فقروں اور لفظوں کو صحیح ترتیب سے

نہیں پڑھ سکتے تھے۔ اور جس وقت یاد آتی تھی، اس وقت بھی اس کو پڑھ تو سکتے تھے، مگر صحیح ترتیب سے لکھ نہ سکتے تھے۔ ایک دن انھوں نے رفعت الدولہ رفیع الملک کاتب الملوک منشی سید محمد شفیع الرضوی سے خواہش کی کہ اس صورت حال کا سبب بیان کریں۔ بادشاہ کی اس خواہش کی تعمیل میں انھوں نے ایک بڑی عالمانہ اور دقیق مضامین پر مشتمل کتاب لکھ کر اشراقِ اختیاری اس کا نام رکھا۔ مصنف نے ایک طویل مقدمہ نفسِ ناطقہ کے بیان میں (ص ۱۵-۱۶) اور ایک دوسرا مقدمہ نفسِ ناطقہ کے قرائے حیوانیہ کی بحث میں لکھا ہے (ص ۱۵-۱۸۶)۔ یہ کتاب ۱۸۴۵ء مطابق ۱۲۹۲ھ میں ختم ہوئی اور اسی سال مطبعِ سلطانی کلکتہ میں چھپی۔

مفاتیحِ خاقانی

بادشاہ جو اردو تعقیبات پڑھتے تھے وہ انھیں کے حکم سے کسی خوش نویس کاتب نے لکھے ہیں اور نماز کا ترجمہ اور ترکیات نماز وغیرہ بھی اس کتاب میں درج کر دیے گئے ہیں۔ کتاب کا نام تاریخی ہے جس سے ۱۳۰۱ھ نکلتے ہیں۔

ہدایۃ محسنیہ ترجمہ نمازِ یومیہ
بادشاہ کی فرمائش سے یہ رسالہ لکھا گیا جو نماز اور متعلقات نماز کے ترجمے پر مشتمل ہے۔

کوکب الدری فی بیانِ آیتہ الکرسی
یہ رسالہ بادشاہ کی فرمائش سے لکھا گیا۔ اس میں مندرجہ ذیل چار بحث ہیں۔

- (۱) بعض فضائل و شانِ نزولِ آیتہ الکرسی (۲) فوائد و عوائدِ تلاوت۔
 - (۳) متنِ آیتہ الکرسی مع ترجمہ میں السطور (۴) شرح بعض الفاظ و فقرات۔
- مفاتیحِ خاقانی، ہدیہ محسنیہ اور کوکب الدری کا ایک ایک تلمی نسخہ امام باڑہ سلطان آباد، مظاہرِ برج میں موجود ہے۔

شاہانِ اودھ میں علمِ ہیئت سے دل چسپی کئی پشتوں سے چلی آتی تھی۔
 واجد علی شاہ کو بھی یہ خصوصیت در ثے میں ملی۔ کمال الدین حیدر حسنی انجینی نے علم
 ہیئت میں جان بڑھائی کی انگریزی کتاب کا اردو میں ترجمہ ۱۸۴۷ء میں کیا اور یہ چار سو
 چالیس صفحے کی کتاب بادشاہ کے حکم سے لکھنؤ کے شاہی مطبع میں چھاپی گئی۔
 مثنوی ممتاز۔

واجد علی شاہ اپنی ایک ممتنعہ بادی بیگم ملقب بہ زیب عالم کو اپنے خط مورخہ ۵
 ذی قعدہ ۱۲۷۵ھ میں لکھتے ہیں :-

”اسی کا تب و شاعر خوش نویس و خوش فکر و خوش تقریر کے واسطے
 آگے بھی تحریر کر چکا ہوں۔ ان کی ملازمی اور تنخواہ کی تدبیر کر چکا ہوں۔
 رویائے صادقہ بھی تم نے انھیں سے لکھوایا تھا... اب پھر بارگاہِ لکھتا
 ہوں، مگر لکھتا ہوں کہ اس کا تب خوش تقریر کا نام لکھو ابھیجو۔ اور بحر
 متقارب مثنوی مقصودِ اخیر میں بھی کچھ کلام لکھو ابھیجو تو ہم اس کے نام کو اپنے
 دفتر پر لکھ لیں۔ اور خطاب اس کا راقمِ عشق اختر، لکھ لیں۔ ہمیں منظور
 ہے کہ جسے تم نے ماشاء اللہ خوش سنبھالا ہو اور الی الان جو جو سوانحات
 اور عشق اور فرطِ عشق تم سے ہمارے واسطے صادر ہوا ہو، ان سب کا ورد
 کو یہ شخص پانچ چھ ہزار شعر میں اور بحر متقارب مثنوی مقصود میں بقیہ تفسیر لکھے
 اور لطفِ تحریرِ راست راست سوائے مبالغہ شاعری دکھلائے...
 جی تو یہ چاہتا ہے کہ کتابِ مثنوی ممتاز، کہ یہ نام بھی اس مثنوی
 کے واسطے زیبا اور لائق ہے، مجلد اور محشی اور مطلقاً اور مذہب اور منقر
 کردا کے ہمارے پاس بجاوے۔ جو صرف اس کا ہنگامہ متعلق ہم سے ہے۔

لے میان مشیر لکھنوی

اور جویوں نہ ہو سکے تو ایک ایک درد و جزو میسر پاس روانہ کرتی
 جانا۔ میں یہاں حسب مرضی خود اس کی تیاری کروا لوں گا اور پھینپنے
 کی بھی تدبیر کروں گا۔

میاں مشیر لکھنوی ان بیگم صاحب کے نامہ نویس تھے۔ بیگم نے بادشاہ کی فرمائش کی تعمیل
 میں جو مثنوی لکھوائی اس کا ابتدائی مصرع یہ ہے ”دلا زب ایماں ہے حمد خدا“ اس
 مثنوی کا ایک ناممکن ناقص الاخر نسخہ کتب خانہ مشرقی پٹنہ میں موجود ہے۔ یہ نسخہ کئی
 رنگوں کے کاغذوں پر لکھا ہوا اور موطا ہے۔ اس میں کل ۱۹ ورق ہیں اور ہر صفحے میں ۱۵
 شعر ہیں۔ آخری صفحے میں چند سطروں کی جگہ سادی چھوٹی ہوئی ہے اور آخری شعر یہ ہے۔

پلا سا قیاب وہ جام شراب
 دکھا دے جو کیفیت انقلاب

یہ شعر اک نئے بیان کی تہید ہے۔ اس طرح معلوم ہوتا ہے کہ کاتب نے
 اصل نسخہ میں تک نقل کر کے چھوڑ دیا ہے۔

سُورسلطانی

توکل بیگ واقعہ نویس غزنیں نے ۱۰۶۳ھ میں شمشیر خاں حاکم غزنیں کے حکم
 سے شاہنامہ فردوسی کا خلاصہ فارسی نثر میں لکھ کر تاریخ شمشیر خانی اس کا نام لکھا اور عبد علی ثناء
 کے حکم سے جب علی بیگ سرحد نے ۱۲۶۵ھ میں شمشیر خانی کا فارسی سے اردو میں ترجمہ کیا۔
 اور تاریخ کی معتبر کتابوں کی مدد سے شاہان نامہ کے حسب نسب کی تصحیح کر کے اپنی
 کتاب کا نام سُورسلطانی رکھا۔

چشمہ حیات

بادشاہ کو ایک دقت یہ خیال رہنے لگا کہ ان کی رحلت کا دقت قریب ہے۔

ان کے اس خیال کو دور کرنے کے لیے بادشاہ کے درباری طبیب حکیم شفا الدولہ نے چشمہ حیات کے نام سے ایک کتاب لکھی جس میں بادشاہ کے طول عمر کی علامتیں لکھیں۔ اور ان چیزوں کا بیان لکھا جو عمر کو گھٹاتی اور بڑھاتی ہیں اور عمر کے کم کرنے والی چیزوں کے ضرر کو دفع کرنے کی تدبیریں بنائیں۔ مصنف کا دعویٰ ہے کہ اس طرح کی کتاب کسی نے دیکھی نہ سنی ہوگی۔ یہ کتاب واجد علی شاہ کے حکم سے مطبع سلطانی لکھنؤ میں ۱۲۰۷ھ میں چھاپی گئی۔ مصنف کا نام مع خطاب تاج الاطبا خلاصۃ الحکماء سیادت پناہ شفا الدولہ ذکا الملک حکیم سید فضل علی خاں بہادر مدبر جنگ تھا۔

صحت نامہ واجد علی شاہ۔ مصنفہ حکیم مسیح الدولہ مرزا علی حسن خاں
طیب دربار شاہی۔

تاج فراست۔ کتاب گمنام کا مصنف واجد علی شاہ کے حال میں لکھتا

ہے :-

”مولف۔ الخطاب و قانع نویسی مخاطب فرمودہ فرمایش کتاب
کہ شہی بہ تاج فراست در فن تہذیب اخلاق و علم صحبت نوشتہ ام ہامو
فرمودند۔ ہر کہ آن کتاب را مطالعہ نماید بر مراتب فضل و کمال اس سلطان
با اقبال پے تواند برد“

فیوض جلیلہ سلطان عالم

واجد علی شاہ کے درباری طبیب مسیح الدولہ بہادر علم طب کی ایک عظیم نظیر
جامع کتاب لکھنا چاہتے تھے۔ لیکن دربار کی حضری اور علاج معالجے میں مصروفیت کے
باعث فرصت نہ ملتی تھی۔ ایک دن بادشاہ کی خدمت میں عرض کیا اور بادشاہ نے ان
کے شاگردوں کا جم غفیر ان کے مدد کے لیے مقرر کر دیا۔ انھوں نے زیر تصنیف کتاب تاریخی نام
”فیوض جلیلہ سلطان عالم“ لکھا جس سے اس کے آغاز کا سال ۱۲۶۵ھ نکلتا ہے۔ کتاب
کے ماخذوں کی طویل فہرست میں بہت سی نہایت قیمتی کتابیں شامل ہیں۔

اس کتاب کا مقدمہ خود ایک ضخیم کتاب ہے، جو گنجان خط میں لکھے ہوئے
 ۱۳۔ اپنچ لمبے ۸ اپنچ چوڑے ۴۲۲ صفحوں پر مشتمل ہے۔ ہر صفحے میں ۲۳ سطریں ہیں۔ مقدمے
 میں نو فصلیں ہیں جو طب اور طبیب کے متعلق معلومات کا خزانہ ہیں۔ آخری فصل میں
 اطباء کے متقدمین اور اساتذہ متاخرین کے حالات ہیں۔ یہ تذکرۃ الاطباء ۲۲۴ صفحوں
 کی ایک مستقل کتاب ہے۔

مقدمے کے علاوہ اصل کتاب میں پانچ باب اور ایک خاتمہ ہے۔ مصنف ہر
 باب کو ایک کتاب قرار دیتا ہے۔

اس کتاب کے لاجواب کے مذکورہ بالا مقدمے کا خوش خط قلمی نسخہ میرے کتب خانے
 میں موجود تھا۔ مگر ایک عنایت فرمانے اس کو معلوم نہیں کہاں پہنچا دیا۔

کتابیں جو خلافت واقعہ بادشاہ سے منسوب کر دی گئیں

مطلع العلوم مجمع الفنون۔ کانپور کے نواب بنیا حسین خاں نے اپنی کتاب کشلول میں سن نام کی ایک کتاب کو واجد علی شاہ کی تصنیف بتایا ہے۔ اس کتاب کا ایک نسخہ جو مطبع زبدۃ الاخبار آگرہ میں ۱۲۶۲ھ مطابق ۱۸۴۶ء میں چھپا تھا میرے کتب خانے میں موجود ہے۔ اس کے مصنف واجد علی شاہ نہیں بلکہ کوئی منشی واجد علی خاں ہیں۔ انھوں نے دیا چہ کتاب میں اپنا حال کسی قدر تفصیل سے لکھ دیا ہے۔ وہ بندر بنگالی میں پیدا ہوئے تھے اور ان کے والد نواب خان جہاں خاں مرحوم کے دارالانشا میں ملازم تھے۔ اس کتاب میں دو دفتر ہیں۔ پہلے دفتر مطلع العلوم، میں ۳۴ باب ہیں اور ہر باب میں کسی ایک علم کا مختصر بیان ہے۔ کتاب کے دوسرے دفتر مجمع الفنون، میں متعدد فنون کا بیان ہے۔ کتاب کی تقطیع بڑی، خط خفی اور ضخامت ۵۲ صفحے ہے۔

ماہیت الغنا (فارسی) اس کتاب کا قلمی نسخہ چوبیسے کتب خانے میں ہے وہ بڑے اہتمام سے تین رنگ کی روشنائیوں میں لکھا گیا ہے۔ عربی عبارتیں خط نسخ میں ہیں اور ان پر بڑی احتیاط سے اعراب دوسری روشنائی سے لگائے گئے ہیں۔ یہ نسخہ ظہیر الدین بلگرامی کی کتاب اسرار واجد کی ساتھ ایک ہی جلد میں بندھا ہوا تھا۔ اس میں بڑے سائز کے ۳۴ صفحے ہیں۔ کتاب اور مصنف کا نام کسی نمایاں جگہ پر نہیں لکھا گیا ہے۔ دیباچے کی ابتدا میں یہ عبارت ہے۔

”بر ارباب اولوالالباب طریقت و شریعت مخفی مباد کہ اس بندہ درگاہ
لم یزلی محمد واجد علی تخلص اختر از زندے قبل جلوس اورنگ شاہی کد مار
ولی عہدی بود مضمون عجیب حیرت افزا نشر خلیان بر و گرجاں می زد“
اور دیباچے کے آخر میں یہ عبارت ہے

”در مقام کلکتہ تہ دار الامتحان قلعہ ولیم فورٹ... رسالہ ترتیب شدہ شد

و بنام ماہیت الغنا نام زد کردہ ام “
 اس طرح یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ یہ کتاب واجد علی شاہ نے فورٹ ولیم میں نظر بند
 کی حالت میں لکھی۔ (اس کے بعد سطر ۱۰ کتاب کی ابتدا احمد... سے ص ۲۲۱ کے خاتمے تک پڑھیے)
 تذکرۃ افتاب المقاب : ڈاکٹر سید سبواثر نے اس تذکرے کو واجد علی شاہ کی
 تصنیف قرار دیا ہے۔ اس غلطی کا بانی گارساں دتاسی ہے۔ اس نے واجد علی شاہ کی
 تصنیفات کے سلسلے میں لکھا ہے شعراے ہندوستانی و فارسی کا ایک ضخیم تذکرہ جس میں کہا
 جاتا ہے کہ پانچ ہزار شاعروں کا ذکر ہے۔ مگر مجھے اس کا کوئی نسخہ نہیں ملا۔ کیونکہ وہ تذکرہ
 غدر کے زمانے میں تباہ ہو گیا۔ (تاریخ ادبیات ہند و ہندوستانی جلد اول طبع دوم ص ۱۱۱)
 یہ تذکرہ قاضی صادق خاں اختر کی تصنیف ہے جو تخلص کی یکسانی کی بنا پر واجد
 علی شاہ اختر سے منسوب کر دیا گیا۔ کتاب کی ابتدا احمد سے کی گئی ہے اور نعت میں صرف
 اتنا لکھا گیا ہے۔ وَالصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلَى رَسُولِهِ الَّذِي قَالَ السَّمْعُ مَبَاحٌ لَا يَهْلِكُ
 حَرَامٌ يَغْيِرُ۔ اور کتاب کی ساری بحثوں کا نتیجہ یہی ہے کہ غنا مباح ہے اس کے اہل کے
 لیے اور حرام ہے نا اہل کے لیے۔ واجد علی شاہ کا یہ مسلک نہیں تھا۔ ان کو موسیقی کا شوق تو بہت
 تھا لیکن وہ اس کو کسی حالت میں حلال اور حرام نہیں سمجھتے تھے۔ یہ احساس ان کے دل
 میں ہمیشہ موجود رہا کہ گانا بجانا اسلامی شریعت کی رو سے ممنوع ہے۔ اپنی بادشاہی کے
 تیسرے سال بیماری کی حالت میں گانے بجانے سے توبہ کر لی۔ خود لکھتے ہیں۔

”دریں عرصہ بندہ از منہیات و غنا وغیرہ بسبب شدت عارضہ انکار خستہ
 از آنیم تا این دم گاہے لفظ غنا بہ سمع نمی رسد... مغنیان وغیرہ جملہ از گوہر
 بر طرف نگردیدند و آں جملہ ساز و سامان سلیمانی برباد شد“

ترجمہ : اس عرصے میں میں نے موسیقات اور غنا وغیرہ سے مرض کی شدت کے باعث

لے عشق نامہ، شرفاں قلمی ص ۱۱۱ (کتب خانہ راقم)
 : اس کتاب کا حال... سے منسوب کر دیا گیا۔ ماہیت الغنا کے حال (ص ۲۲۱ تا ۲۲۲) کے بعد پڑھیے۔
 Channel eGangotri Urdu

انجا کر کیا اور اس گھڑی سے اس دم تک غنا کا لفظ میسر کران تک نہیں پہنچتا...
گوئیے وغیرہ سب نوکری سے برطرف کر دیے گئے اور سارا سیلمانی ساز و سامان برباد ہو گیا۔

ماہیت الفتا کی فصل چہارم میں غنا کو افضل ترین نعمات الہی قرار دیا گیا ہے اور یہ بات بھی بادشاہ کے مسلک سے مطابقت نہیں رکھتی۔

مٹیا برج میں کس کتاب کا ایک علمی نسخہ رسالہ در حرمت و حِلّتِ عِنّا کے نام سے ہے اس کے خاتمے پر یہ عبارت ہے۔

”صاف و چاق شدن موقوف بر پند و اجازت و اصلاح و نظر ثانی مصنف

است

منشی ظہیر الدین بلگرامی نے اپنی کتاب اسرارِ جدیدی میں ماہیتِ الغنا کو اسی تصنیف میں شامل کیا ہے اور اپنی دوسری کتاب ظہیر الانشا میں اپنی تصنیفات کی فہرست میں ایک کتاب کا ذکر یوں کیا ہے :-

”رسالہ درماہیت غنا و درجہ حلت و حرمت غنا و سبب تاثیرات

آں برارواح و نفوسؑ

ان تمام چیزوں پر نظر کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ ظہیر الدین بلکہ امی نے ماہیت الغنا کے نام سے ایک کتاب لکھی اور اس کو دواہد علی شاہ کی طرف منسوب کرنا چاہا۔ لیکن ان کی یہ خواہش پوری نہیں ہوئی۔ بادشاہ نے کسی اور کی تصنیف کو اپنی طرف منسوب کرنا کبھی پسند نہیں کیا۔

له اسرار و اجدی قلمی - لکھنؤ یونیورسٹی لائبریری ص ۱۵۷ ۱۵۷
مطبوعہ منشی نول کشور، لکھنؤ

۲۴۲

ضمیمہ

نظم طباطبائی اور واجد علی شاہ

بقلم ابو الحیو مودودی

طباطبائی کا مٹیابر ج اور دربار واجد علی سے تعلق
 طباطبائی صاحب کی زندگی کا موسم بہار جان عالم واجد علی شاہ کے دربار میں گزرا
 وہ مٹیابر ج کے بزم سخن کے جوہر دار کن اور شہزادوں کے معلم و اتالیق تھے... کم و بیش
 بیس سال طباطبائی صاحب مٹیابر ج کی فضا میں رہے... وہ ان لوگوں میں آخری شخص
 تھے جو بادشاہ کی وفات کے بعد بھی مٹیابر ج کے مکینوں سے وابستہ رہے۔
 واجد علی شاہ کی سوانح عمری

میں نے طباطبائی سے کہا کیا اچھا ہوتا کہ آپ اس بدنام بادشاہ پر ایک کتاب
 لکھ دیتے... کہنے لگے... میں نے بہت مواد جمع کیا تھا۔ ایٹ انڈیا کمپنی کے رکاوٹوں
 سے اور بہت سرکاری غیر سرکاری روزناموں سے لندن کے اخباروں کے جو نام نگار بادشاہ
 بادشاہ کے مٹیابر ج کے قیام کے زمانے میں ملے اور انھوں نے اپنے اخباروں کو مضمون
 بھیجے۔ یہ سب سالہ میں نے جمع کیا تھا۔ کلکتہ میں ایک انگریز کالت پیشہ تھا۔ یہ خزانے
 کی بات ہے۔ وہ بادشاہ کا بہت گرویدہ ہو گیا تھا۔ اس نے بھی مواد کی فراہمی میں بہت
 مدد دی۔ مگر صاحب وہ سارا مواد اور لکھی لکھائی کتاب اس طغیانی کی نذر ہو گئی جو ۱۹۱۱ء
 میں رد موسیٰ میں آئی تھی۔

بادشاہ کے ذاتی اوصاف

بادشاہ میں بہت سی خوبیاں بھی تھیں عیب بھی تھے... واجد علی شاہ نے جوانی

میں تخت پر بیٹھے تھے۔ دانش مندی استعدادی سے حکمرانی شروع کی۔ دادگری اور اصلاح لشکر پر خاص توجہ کی۔ طالع صبح سے تین بجے دن تک ایک دم کو بھی استراحت نہ کرتے بہت کچھ کیا، ان کی کارپردازی کے ثبوت ہیں۔ مگر یہ سب چند روز کی بہار تھی۔۔۔ فقط ایک بادشاہ کی ذات تھی جس میں ملک داری کی استعداد تھی۔ باقی اور آڑے کا آداب بگڑا ہوا۔“

نذر ہدیت

”انتہائی عیش پسندیوں کے باوجود کبھی شراب کو ہاتھ نہیں لگایا کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کسی بازاری طوائف کو باریابی کا موقع ملا ہو۔ وہ اپنی شریعت کے خلاف کبھی کوئی کام نہ کرتے تھے۔ مٹیہ برج میں ایک امام باڑہ بیت الیکا بنوایا تھا جب وہ تیار ہو گیا اس میں سادات ملازمین کی صفیافت کی اور حسن عقیدت سے آفتابہ خود ہاتھ میں لے کر کھڑے ہو گئے، خود سبکے ہاتھ دھلائے۔“

انصاف پسندی، رحم دلی، انکسار، نیک نفسی

”وہ اپنی ذات سے بہت نیک دل اور داد گستر تھے۔ کسی موافق یا مخالف، بیگانہ و بیگانہ کے ساتھ عدل میں رعایت نہ کی، کسی کے ساتھ بے رحمی نہ کی، کسی مخالف کو ستایا نہ کسی کی جان لی۔ ان میں غرور و نخوت نام کو بھی نہ تھا، جس سے کوئی امیر رئیس خالی نہیں ہوتا، ہر فرد بشر کے سلام کا جواب دیتے، خوش خلقی اور خندہ پیشانی سے پیش آتے اور نرمی سے گفتگو کرتے۔“

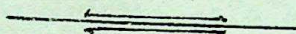
مثنوی دریاے عشق اور رہس

”مثنوی دریاے عشق بادشاہ کے کلام میں ایک منازحہ ہے۔ اس مثنوی میں جو قصہ ہے، اس کا رہس ہوا کرتا تھا۔ اسی پر اہل شہر طعنہ دینی کرتے تھے کہ لائے غضب بادشاہ ناچتے ہیں۔ اصل اور بے اصل کی بات تو خدا ہی جانے، دلوں ندیمان خاص کو بارہ تھا۔ بادشاہ کے محل میں ایک گروہ رہس والیوں کا تھا۔ وہی اس قصہ کا رہس کیا کرتی تھیں۔۔۔ یہ سب محمولہ تھیں۔“

بادشاہ کی زود گوئی

» شعر ذرا سوچ سمجھ کر کہنا نہ جانتے تھے۔ فکر شعر کے وقت دو دو تین تین خوش نویس لکھتے جاتے تھے۔ ایک شعر اس نے لکھنا شروع کیا تھا کہ دوسرا در تیسرا شعر بھی تصنیف ہو گیا۔

علامہ سید علی حمید رنظم طباطبائی، نقیض لاہور، صمیمہ شخصیات نمبر ۳۱۰-۳۱۱



سلطانِ عالم وایچند علی شاہ

دوسرا حصہ

مظلومی، معزولی، جلا وطنی

ایسٹ انڈیا کمپنی اور دیسی ریاستوں کا الحاق

ایسٹ انڈیا کمپنی انگریز تاجروں کی ایک فلم جماعت تھی جو سلسلہ میں وجود میں آئی۔ اس نے کچھ مخصوص حقوق و مراعات حاصل کر کے ہندوستان میں اپنی تجارت کو خوب فروغ دیا اور سیاسی حالات سے فائدہ اٹھا کر ہندوستان کی ریاست میں داخل ہو گئی اور ملک کے بعض حصوں میں اپنی حکومت قائم کر لی۔ مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد ہندوستان میں کوئی مستحکم سلطنت نہ رہی۔ سارا ملک بہت سی ریاستوں میں تقسیم ہو گیا کمپنی کے کارپردازوں نے بعض ریاستوں سے جنگ کی۔ بعض کو آپس میں لڑایا، بعض کی رعایا اور فوجیوں کو رئیس کے خلاف بھڑکایا، بعض کو دوست بن کر دھوکا دیا، بعض سے وعدے کر کے پھر گئے اور بعض کے ذمے لاکھوں روپے کا قرض نکالا۔ غرض کہ الحاق کے لیے کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا اور ایک ایک کر کے ساری دیسی ریاستوں کو کمپنی کی حکومت میں شامل کر لیا۔ اس طرح ان کی طاقت روز بروز بڑھتی گئی۔

ریاستوں کے الحاق کی ڈیڈ اور مختصر یہ ہے کہ ۱۷۹۶ء میں بنجور ۱۷۹۹ء میں میور ۱۸۰۰ء میں سورت ۱۸۰۱ء میں کراچی ۱۸۱۸ء میں مرہٹوں کی ریاستیں ۱۸۲۶ء میں آسام اور اراکان اور اسی سال بھرت پور، کورگ، جے پور، پھر کپڑی اور شکار پور، ۱۸۳۸ء میں سندھ اور ستارہ، ۱۸۴۹ء میں جیت پور اور سنبھل پور اور اسی سال پنجاب، ۱۸۵۲ء میں پرمیا ۱۸۵۳ء میں ناگپور اور دکن کا ریزیر صوبہ برار، ۱۸۵۴ء میں جھانسی اور ۱۸۵۶ء میں اودھ کمپنی حکومت میں شامل کر لیا گیا۔ تواریخ ماری میں کہتا ہے کہ ڈیوڑی کے ان تمام الحاقات کا بعض طبقوں نے کسی برطانوی مذہب کی کارگزاری نہیں سمجھا بلکہ راہ زون کی غارت گری سے تعبیر کیا۔ ان طبقوں میں ڈیوڑی نہایت کمینہ اور بدترین حاکم شمار کیا جاتا تھا۔

جس آندھی نے میوہ میں سلطنت کا تخت پنجاب میں راج کی گدی اور بنگال میں
نظامت کی منڈا لٹ دی اگر مردہ اودھ کا شاہی تاج بھی اڑا لے گئی تو تعجب کیا اور صاحب علی
شاہ پر الزام کیوں !
عبدالحکیم شرر لکھتے ہیں :

”چونکہ استراع سلطنت انھیں کے عہد میں ہوا اس لیے تمام اہل اڑکھ
کے ہوت سہام اور نشانہ ملاست دہی بن گئے۔ اور قریب قریب تسلیم کر لیا
گیا کہ زوال سلطنت کا باعث وہ تھے۔ لیکن جس زمانے میں ان کی سلطنت
کا خاتمہ ہوا ہے ان دنوں ہندوستان کی تمام وطنی قوتیں ٹوٹ رہی تھیں۔
پنجاب میں سکھوں اور دکن میں مرہٹوں کا دفتر کیوں اٹھا۔ جو بہادر اور
زبردست اور ہوشیار مانے جاتے ہیں۔ دہلی میں مغلیں شہنشاہی کا اور بنگالے
میں نواب ناظم بنگالہ کا استیصال کیوں ہوا حالاں کہ ان میں تہی طفلانہ مزاج
نہ تھی جتنی کہ لکھنؤ کے اربکے آراء سلطنت میں بتائی جاتی ہے۔ مذکورہ چاروں
درباروں میں کوئی واحد علی شاہ نہ تھا۔ حالاں کہ ان کی تباہی لکھنؤ کی تباہی
سے کم نہ تھی“ (گزشتہ لکھنؤ ص ۵۱)

ریاستوں کے الحاقات کا سلسلہ اودھ پر اکبر ختم ہوا۔ تاریخی حقائق سے ناواقف اور
انگریزوں کے پردیگنڈے سے متاثر لوگ حکومت اودھ کے خاتمے کا ذمہ دار واحد علی شاہ کو
سمجھتے ہیں۔ اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لیے الحاق اودھ کا تاریخی پس منظر مختصراً پیش
کیا جاتا ہے۔ انگریز مدت سے اودھ کو کمزور اور اودھ کے محاصل پر ناجائز تصرف کرتے چلے
آتے تھے۔ نجبر کی لڑائی میں شجاع الدولہ فرماں روا کے اودھ نے انگریزوں کے خلاف
ناظم بنگالہ نواب قاسم علی خاں عالی جاہ کا ساتھ دیا۔ اور شکست کھائی۔ انگریزوں نے
۱۶ اگست ۱۷۵۷ء کو ایک معاہدہ کیا جس کی رو سے پچاس لاکھ روپیہ نادان جنگ وصول
کر لیا۔ بکسر کی لڑائی کے بعد شجاع الدولہ سے ایک تحریکھوائی جس کی رو سے سیکر کیپٹی

نے آصف الدولہ کے جلوس کے وقت بائیس لاکھ کا ملک بنارس، جون پور، غازی پور لے لیا۔ ۱۷۹۸ء میں سعادت علی خاں کی گدی نشینی کے وقت گورنر جنرل نے ایک معاہدے پر دستخط کر دائے جس کی ایک شرط یہ تھی کہ ملک کی حفاظت کے لیے دس ہزار جوانوں کی انگریز فوج رکھی جائے اور بیس لاکھ سالانہ اس کی نفل بندی مقرر کی گئی۔ دوسری شرط یہ تھی کہ الہ آباد کا قلعہ جو بقول مؤرخ مارش مین ممالک مغربی و شمالی کی کنجی تھا کمپنی کے سپرد کر دیا جائے۔ نومبر ۱۸۰۱ء میں سعادت علی خاں کو مجبور کرنے کے ایک معاہدے پر دستخط کر دائے جس کی رد سے انگریزی امدادی فوج کے مصارف کے لیے ایک کروڑ بیس لاکھ کے ضلعا پر یعنی تقریباً نصف اودھ پر کمپنی کی دائمی حکومت تسلیم کرنا پڑی۔ انگریز مؤرخ مارش مین کہتا ہے کہ علاقوں کا یہ جبری استحصال کمپنی کے عہد حکومت کا نہایت ہی قابل ملامت کارنامہ قرار دیا جاتا ہے۔ یہ پیگو کی لڑائی کے وقت غازی الدین حیدر سے ایک کروڑ روپیہ کی قرض کے طور پر لے لیا۔ اور اس کے منافع کی تقسیم اپنے ہاتھ میں رکھتی تھے محمد علی شاہ کے عہد میں عہد نامے میں ایک شرط بڑھا کر فوج کی کنٹیننٹ چھ لاکھ روپے مقرر کیے گئے۔

جب ہندوستان کی بیش تر دیسی ریاستیں کمپنی کی حکومت میں شامل کی جا چکی تھیں اور باقی ریاستوں کے الحاق کا منصوبہ بن چکا تھا، انگریز پورے ملک پر قابض ہو چکے تھے اور کوئی طاقت ایسی نہ تھی جو انگریزوں کا مقابلہ کر سکتی، ایسے وقت میں ۱۳ فروری ۱۸۳۷ء (۲۶ صفر ۱۲۶۳ھ) کو داج علی شاہ اودھ کے تخت پر بیٹھے۔ ان کی تخت نشینی سے بہت پہلے اودھ پر انگریزوں کا اقتدار قائم ہو چکا تھا اور بادشاہ کے اختیارات بہت محدود ہو چکے تھے۔ اس صورت حال کا اظہار میاں جرات شاعر نے ایک قطعے میں یوں کیا ہے :

سمجھ نہ امیران کو کوئی نہ وزیر انگریزوں کے ہاتھ اک قفس میں ہیں میر
جو کچھ وہ کھائیں سو یہ منہ سے بولیں بنگالے کی مینا ہیں یہ پورے امیر

عرصے سے اودھ پر انگریزوں کے دانت لگے ہوئے تھے اور وہ بد انتظامی کی صورت میں اودھ پر قبضہ کر لینے کی دھمکی دیتے رہتے تھے۔ واجد علی شاہ ان حالات سے بخوبی واقف تھے اور جانتے تھے کہ اودھ کی سلطنت ایک ڈنگاتی ہوئی ناؤ ہے۔ انھوں نے اپنی دلی عہد داری کے زمانے ہی میں کہا تھا:

ٹپ پونجیوں کا اخترے خانے میں دورہ ہے
دکان اٹھا ڈالو بازار نہ ٹھہرے گا

اسی بنا پر وہ بادشاہ بننے کے خواہش مند نہ تھے۔ ان کی طبیعت حکومت پر مائل نہ تھی۔ وہ بادشاہی پر درویشی کو ترجیح دیتے تھے۔ مگر قسمت کا لکھا پورا ہوا اور ان کو بادشاہ بننا پڑا۔ انھوں نے اپنی کتاب ہیبت حیدری ۱۲۶۵ء میں لکھی ہوئی جب یہ تالیف نے حکمت سنج تو ہجرت تھے بارہ سو شصت و پنج اور سلیم کے خط بنام ٹیپو مرزہ ۶ ستمبر ۱۸۴۹ء سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس وقت یہ کتاب لکھ رہے تھے۔ اس کتاب میں انھوں نے اپنے ان خیالات کا بے لاگ اظہار یوں کیا ہے:

یہ دنیا کا ہے مشہور تخت سرا	نہیں بلکہ کھیمے مصیبت سرا
مجھے دوستی اس سے حاصل تھی	طبیعت حکومت پہ مائل نہ تھی
نہ چھوڑا ذرا مجھ کو تقدیر نے	دیا ساتھ ہرگز نہ تدبیر نے
فقیری کا جبہ دکھایا بہت	حکومت کے منہ کو چھپایا بہت
مقرر ہو تھا وقت وہ آگیا	پکڑ کر سر تخت پہنچا گیا
بنام سیکرٹیر تسلیم اودھ	ہوا قبضہ ملک میں اب اودھ

خدا نے مرے سر پہ رکھا یہ بار

مگر دیکھو اس کا انجام کار

آخری شعر بتاتا ہے کہ وہ سچ رہے تھے کہ بادشاہی کا انجام اچھا نہ ہوگا۔ اس کے بعد وہ

کہتے ہیں۔

مگر شکر ہے شکر ہے، اے خدا۔ کہ اب تک ہے حاصل وہی مرتبہ اس قول سے صاف ظاہر ہے کہ ان کو ڈھائی برس تک بھی سلطنت کے باقی رہنے کی امید نہ تھی۔ ان کا یہ اندازہ بالکل صحیح تھا۔ اگر ملک میں کچھ غیر معمولی حالات پیدا نہ ہو گئے ہوتے تو اس وقت تک اودھ پر انگریزوں کا قبضہ نہ جاتا۔ ان حالات میں سب سے اہم پنجاب اور برما کی لڑائیاں تھیں۔ ۱۸۴۸ء کا پورا سال سکھوں کے ساتھ نبرد آزمائی میں گزرا۔ انہی جنگ سخت معرکے پیش آئے۔ آخر کار ۲۹ مارچ ۱۸۴۹ء کو مہاراجہ دلیپ سنگھ نے ڈلہوی کے اعلان پر دستخط کر دیے، جس کی رو سے پنجاب کی سلطنت برطانیہ کی طرف منتقل ہو گئی۔ اس کے کچھ دن بعد برما کی دوسری جنگ پیش آ گئی۔ ستمبر ۱۸۵۱ء میں پھیر پھار شروع ہوئی۔ ۱۰ فروری ۱۸۵۲ء کو اعلان جنگ کیا گیا اور فوج کشی کی تیاریاں شروع ہوئیں۔ ۲ دسمبر ۱۸۵۲ء کو برما کے دار الحکومت یگوا کا اسحاق کر لیا گیا۔

داجد علی شاہ کا سارا عہد حکومت کشاکش میں گزرا۔ انگریز بد انتظامی کا الزام لگا کر بادشاہ کو معزول کرنے کی فکر میں لگے رہے اور بادشاہ الزام سے بچنے کی تدبیریں کرتے رہے۔ مگر مختار اور محبوب کا مقابلہ ہی کیا۔ اس کشاکش کی طویل داستان کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے۔ جب رزیدنٹ نے گورنر جنرل کا حکم حاصل کر کے بادشاہ کو فوج میں تنظیم اور اضافہ کرنے سے اور طبیعوں کے مشورے کے پردے میں انتظام ملک میں اصلاح کرنے سے روک دیا جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے، تو وہ انگریزی طرز حکومت رائج کرنے پر آمادہ ہوئے۔ رزیدنٹ کونسل رچمنڈ، اسٹنٹ رزیدنٹ ٹیپٹن برڈ اور لفٹنٹ گورنر سٹرٹمن کے مشورے سے ایک اسکیم تیار کی گئی جس کو اودھ کے وزیر نے بھی پسند کیا۔ رزیدنٹ نے وہ اسکیم گورنر جنرل کی منظوری حاصل کرنے کے لیے حکومت ہند کے شعبہ خارجہ کے سیکریٹری سر مہری ایلٹ کے پاس بھیج دی۔ یہ اسکیم پہلے ان اضلاع میں نافذ کی جانے والی تھی جو کمپنی کی حکومت کے تحت تھیں۔ اس کے بعد بقیہ اضلاع میں۔ ایلٹ نے یہ کہہ کر خود ہی اس کو نافذ کر دیا

کہ اگر یہ اسکیم پورے ملک میں ایک ساتھ نافذ کی جاتی تو غور کرنے کے قابل ہوتی۔ اس طرح وہ اسکیم گورنر جنرل کے پاس پہنچ ہی نہ سکی۔

ریڈینٹ اودھ کی حکومت کے خلاف ریورس بھیجتا رہتا تھا، جن کے نتیجے میں گورنر جنرل لارڈ ہارڈنگ نے طے کیا کہ وہ پنجاب سے کلکتے جاتے ہوئے لکھنؤ آئیں گے۔ انہوں نے ۳ نومبر ۱۸۵۷ء کو کانپور میں مقام کیا۔ واجد علی شاہ ان کے استقبال کے لیے پیش تر پہنچ چکے تھے۔ ۸ نومبر کو بادشاہ گورنر جنرل سے ملے اور ان کو لکھنؤ آنے کی دعوت دے کر ۱۰ نومبر کو واپس آگئے تاکہ گورنر جنرل کے استقبال کے لیے مناسب انتظامات کریں۔ لارڈ ہارڈنگ ۱۵ نومبر کو لکھنؤ پہنچے۔ بادشاہ اور ریڈینٹ نے ان کا بہت مناسب طریقے سے استقبال کیا۔ گورنر جنرل گیا وہ دن قیام کر کے کانپور چلے گئے۔ کانپور اور لکھنؤ میں ان کا استقبال جس شان سے کیا گیا اور ان کی ہمان داری اور دعوتوں میں جتنا شکلف کیا گیا اس کی تفصیل بیان کی جائے تو الٹ سیدہ کی داستان معلوم ہوگی۔ اس کے صلے میں گورنر جنرل نے کیا دیا۔ کیا کوئی خوش فودی کا پردانہ؟ جی نہیں! ۲۳ نومبر ۱۸۵۷ء کو ایک سخت خط لکھ کر بادشاہ کو انتظام سلطنت درست کرنے کے لیے دوبرس کا وقت دیا اور تنبیہ کی کہ اگر دوبرس کے اندر اصلاح نہ ہوئی تو ایسٹ انڈیا کمپنی سلطنت اودھ کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لے گی۔ لارڈ ہارڈنگ بخوبی جانتا تھا کہ ایک ملک کے نظام میں مکمل اصلاح دوبرس کی قلیل مدت میں نہیں کی جاسکتی۔ یہ دوبرس کے بعد ملک پر قبضہ کر لینے کا فقط ایک حیلہ تھا۔ پھر اگر انتظام ملک میں خرابیاں تھیں بھی تو واجد علی شاہ کی فوجیہ کی حکومت میں پیدا نہیں ہو گئی تھیں بلکہ بہت پہلے سے موجود تھیں، جن کے لیے بادشاہ ذمہ دار نہ تھے اور وہ اس سخت تعزیر کے مستحق نہ تھے کہ ان سے سلطنت چھین لی جائے۔

ہارڈنگ کے بعد ۸ نومبر ۱۸۵۷ء میں ڈوموزی گورنر جنرل ہو کر آیا۔ اس نے ۱۱ جنوری ۱۸۵۹ء

کو فنٹ کر تل سلیم کو اودھ کا ریزیڈنٹ مقرر کیا۔ وہ بھی سمجھتا تھا کہ اودھ کے ملکی انتظامات کی اصلاح دہرہ بس میں ممکن نہیں۔ اس نے سلیم کو ریزیڈنٹ مقرر کرنے کی تجویز سے مطلع کرنے اور اس کی منظوری حاصل کرنے کے لیے ۱۶ ستمبر ۱۹۲۸ء کو جو خط لکھا تھا اس میں یہ بھی لکھا کہ گورنر جنرل نے ۱۹۲۷ء میں شاہ اودھ کو بذریعہ تحریر یہ اطلاع دی تھی کہ اگر دو سال کے اندر سلطنت میں قرارداد فی اصلاح نہ ہوگی تو برٹش گورنمنٹ انتظام اپنے ہاتھ میں لے لے گی۔ اب اس بات کی امید کرنے کی کوئی وجہ پائی نہیں جاتی کہ اکتوبر ۱۹۲۹ء تک کچھ بھی اصلاح وقوع میں آئے۔ اور اس خط کو ان الفاظ پر ختم کیا آپ لکھنؤ کی ریزیڈنٹی خاص کر اس بڑی تبدیلی کے خیال سے جو آئندہ ضرور ہونے والی ہے قبول فرمائیے۔

سلیم سمجھتا تھا کہ بڑی تبدیلی جو آئندہ ضرور ہونے والی ہے سے مراد ہے صوبائی سلطنت اور معزولی شاہ اودھ۔ اس نے گورنر جنرل کی حمایت کے بل پر ایک خود مختار حکم راء کی حیثیت اختیار کر لی اور ایسی حرکتیں کرنا شروع کیں جن سے بادشاہ اور وزیر کی تحقیر ہوتی تھی اور انتظام سلطنت میں بے جا مداخلت ہوتی تھی۔ ایسے بے شمار واقعات میں سے صرف چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

مرزا صبی علی خاں جو علی نقی خاں وزیر کے مشیر خاص تھے ان کو سلیم نے اپنے حکم سے شہر بدر کر دیا۔ بادشاہ نے لکھا کہ صبی علی خاں کا بلا تصور اخراج کیوں کیا جا رہا ہے۔ ریزیڈنٹ نے براہ فرختہ ہو کر جواب دیا کہ صبی علی خاں کی ملازمت جاگیر یا موروثی جائیداد نہیں ہے۔ لہذا ان کی برخاستگی کے لیے ان کے خلاف ثبوت فراہم کرنے کی کوئی حاجت نہیں ہے۔

بادشاہ نے شرف الدولہ محمد براہیم خاں کے اخراج کا حکم دیا۔ وہ سیدھے پھانسی میں چلے گئے اور ریزیڈنٹ کے ایما سے وہاں رخنے لگے۔

ملازمت سے برخاست کیے ہوئے انگریزوں کو لکھنؤ میں ملازمت دلوائی جاتی تھی۔

سفر بزرگ جان شہر اپنی کتاب نوٹس آف انڈیا میں لکھتا ہے:

اُن صاحب کا قصہ کس کو یاد نہیں ہے جو کمپنی کی ملازمت سے برخاست

ہوئے تھے اور جن کے متعلق آئندہ ملازمت نہ دیے جانے کے احکام تھے

باوجود اس کے وہ گورنر جنرل کا سفارشی خط لے کر لکھنؤ روانہ کیے گئے۔۔۔

ریزیڈنٹ اپنے اثر سے انگریز جوانوں مالیوں اور گوتوں وغیرہ کو شاہ اودھ

کے یہاں نوکر رکھواتا ہے۔ باوجودیکہ بادشاہ کو ان کی بالکل ضرورت نہیں تھی بلکہ

ایک شخص کی تھوٹی اطلاع پر کہ ایک زمیندار نے ایک مسافر کا سر کاٹ لیا ہے ریزیڈنٹ

نے بادشاہ کو اطلاع کیے بغیر قاتل کو گرفتار کرنے اور اس کا گادیں اُجاڑنے کے لیے انگریزی

فوج بھیج دی ہے۔

ریزیڈنسی کا ایک سنتری سوتے میں گر پڑا۔ اس کے ہاتھ کی بندوق چھٹ گئی اور اس کی

کلائی زخمی ہو گئی۔ سلیمن نے گورنر جنرل کو یہ واقعہ پوری تفصیل کے ساتھ لکھ بھیجا۔ لیکن جب بادشاہ

کو اطلاع دی تو اس معمولی سی بات کو یہ رنگ دے دیا کہ کچھ آدمی مجھ کو قتل کرنے کے لیے بھیجے

گئے انھوں نے ریزیڈنسی میں داخل ہونے کے لیے سنتری پر بندوق کا فیر کیا۔ بادشاہ نے

تحقیق کر کے اس الزام کو بے بنیاد پایا۔ لیکن سلیمن اپنی بات پر اڑا رہا اور آخر کار اس حیلے

سے بادشاہ کے مقرر کیے ہوئے حفاظتی دستے کو بربط کر کے اپنے آدمی مقرر کر دیے۔

شاہی ہرم میں بادشاہ کے نام کے ساتھ لفظ 'غازی' لکھا جاتا تھا۔ سلیمن نے اپنے

حکم سے یہ لفظ ہرم سے نکالوا دیا۔

اودھ میں ریزیڈنٹ کی طاقت بادشاہ اور وزیر کی طاقت سے کم نہ تھی بلکہ ان دونوں

کو بعض چیزوں میں اس کا دست بھرنا پڑتا تھا۔ اس طرح اودھ میں ایک طرح کی دو علمی قائم

ہو گئی تھی، جس سے ملک کے انتظام میں خلل پڑتا تھا۔ سرسہری لارنس نے انتظامی خرابیوں کی

لے آخری تاجدار اودھ ۶۰۵۹ء بھٹنا گروم ۱۰۰۰ء بھٹنا گروم ۱۰۰۰ء بھٹنا گروم ۱۰۰۰ء

وجہ شاہان اودھ اور حکام سلطنت کی ناقابلیت نہیں بتائی ہے، بلکہ صاف لکھ دیا ہے کہ
دو علی حکومت یعنی ریڈیٹنٹ اور بادشاہ دونوں کی طاقتوں کا تصادم اور شاہان اودھ کے
اختیارات کا تدریجی زوال سلطنت کی کم زوری اور تمام خرابیوں کا باعث ہے۔
ظہیر الدین بلگرامی کا بیان ہے کہ جو ذمہ دار، جاگیر دار، ملازم، ادنیٰ ترین خواجہ سرا،
زرخیز غلام اور ان کے چیلے تک جو ریڈیٹنٹ سے ادنیٰ تو تسل حاصل کر لیتے تھے ان پر بھی اودھ
کے بادشاہوں کو کچھ اختیار نہ رہتا تھا۔

میری عمر اس وقت اسی برس کے قریب ہے۔ میں نے لڑکپن میں بڑے بڑھوں
کی زبان سے سنا ہے کہ زمانہ شاہی میں جب کسی مجرم کو پھانسی کا حکم ہو جاتا تھا تو انگریز
ریڈیٹنٹ موجود ہوتا تھا اور جلا دیکھانسی دینے سے پہلے تین دفعہ کہتا تھا "خلق خدا کی، ملک
بادشاہ کا، حکم بڑے صاحب کا" اور ریڈیٹنٹ ہر مرتبہ کہہ دیتا تھا "حکم کمپنی بہادر کا"۔ یہ
فقیر اودھ کی بادشاہی کا حال انتہائی اختصار سے مگر بڑی وضاحت کے ساتھ پیش کر دیتے
ہیں یعنی ملک بادشاہ کا تھا مگر حکم ریڈیٹنٹ اور کمپنی بہادر کا چلتا تھا۔
سلیمن کا دورہ اودھ

لنٹنٹ گورنر سلیمن ۱۱ جنوری ۱۸۳۹ء کو اودھ کا ریڈیٹنٹ مقرر کیا گیا اور اس کو
ہدایت کی گئی کہ ملک کا دورہ کر کے اس کی جانچ کرے کہ طرز حکومت میں کوئی اصلاح کی گئی
یا نہیں کیوں کہ لارڈ ہارڈنگ نے نومبر ۱۸۳۷ء میں بادشاہ کو دو برس کا جو دقت دیا تھا وہ ختم
کے قریب تھا۔ سلیمن نے بادشاہ کی مرضی کے خلاف جلوس کے پونے تین برس بعد ۱۸۳۹ء
(۱۵ محرم ۱۲۶۶ھ) کو اودھ کے اندر دینی مقامات کا دورہ شروع کیا جو تین مہینے میں
۲۴ فروری ۱۸۳۹ء کو ختم ہوا۔ اس دورے سے زمینداروں کو یہ خیال ہو گیا کہ اودھ پر جلد
ہی انگریزوں کا قبضہ ہو جائے گا اور انھوں نے مال گزاری روک لی۔ اس دورے میں

سلیم نے رعایا کو بھڑکا کر عمال سلطنت اودھ کی حکومت کے خلاف کچھ شکایت نامے حاصل کر لیے۔ ان شکایتوں کو بڑھا چڑھا کر ادر اتفاقی اور انفرادی واقعات کو بدانتظامی کی مسلسل داستان بنا کے حکومت اودھ کے خلاف ایک رپورٹ لکھ کر پیش کر دی سر اسکن پری
sur Askan perry نے اپنی کتاب برڈز آئی ویو آف انڈیا *eye view of India* میں لکھا کہ رزیدنٹ سلیم تین مہینے سے اودھ کے دربار میں مصروف ہے۔ وہ ہر طرح کے لوگوں کو درخواستیں اور عرضداشتیں گزارنے پر آمادہ کرتا ہے۔ بے شک یہ دہلی حکومت کے ساتھ بڑی غیر معمولی مداخلت ہے جس کو کوئی عہد نامہ جائز نہیں قرار دیتا ہے بلکہ یہ عہد ناموں کی صریح خلاف ورزی ہے۔ (آخری تاجدار اودھ ص ۶۱۲-۶۱۳)
 ٹھکی اور دیکیتی کے اسناد کا حکم جو انگریزی حکومت نے قائم کیا تھا، سلیم ۱۸۳۵ء سے اودھ کا رزیدنٹ مقرر ہونے تک اس کا جنرل سپرنٹنڈنٹ تھا۔ اپنے کار منصبی کے سلسلے میں اس نے اودھ بھر میں دورہ کیا تھا اور یہاں کے اندرونی حالات سے واقفیت حاصل کر لی تھی۔ اس نے جولائی ۱۸۳۸ء میں اپنے محلے کی کارگزاری کی مفصل اور ضخیم رپورٹ لکھی۔ یہ واجد علی شاہ کے جلوس کا دوسرا سال تھا۔ اس رپورٹ کے چند اقتباس پیش کیے جاتے ہیں۔ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ واجد علی شاہ کے عہد میں اودھ کی عام رعایا اور کسانوں کی خلاق اور معاشی حالت کتنی اچھی تھی۔

Report on Budhuk alias Bagree decoits and other gang robbers by hereditary profession and on the measures adopted by the government of India for their suppression. Bengal military orphans press, calcutta, 1849

”وہ پر دسی آدمی جو مختلف پارٹیوں کے انگریزی اخبار پڑھ کر یہ خیال کر لے کہ انگلستان میں بے اطمینانی بد امنی اور بد نظمی کے سوا کچھ نہیں ہے، وہ اگر انگلستان پہنچے اور اپنے چاروں طرف امن چین اور میل ملاپ کی کیفیت دیکھے تو اس کو اتنا تعجب نہ ہوگا جتنا اس انگریز کو جو ہندوستان کے اخبار پڑھنے کے بعد مشرقی سرحد کے انگریزی علاقوں سے اودھ میں داخل ہوتا ہے۔ وہ خیال کرتا ہے کہ ملکی نظمی کے سوا اودھ میں کچھ نہ ملے گا۔ مگر اسے اپنے سامنے ایک ایسا ملک دکھائی دیتا ہے جہاں کی زراعت آئرلینڈ کی قلم رو سے کہیں بہتر اور آبادی کہیں زیادہ گنجان ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ اودھ کے کسان زیادہ دلیر اور اسی کے ساتھ زیادہ ہند اور خلیق ہیں اور اجینیوں کے ساتھ ہمارے نوازی کے فرائض ادا کرنے کے زیادہ خواہش مند رہتے ہیں۔“

”اودھ کے باشندوں میں تعلیم، صلاحیت اور قابلیت کی کمی نہیں ہے۔ ہماری فوج کے سپاہی اور افسر جن میں ہم اس قدر جرأت و فاداری اور جہاں نشاری پاتے ہیں وہ زیادہ تر اودھ کے رہے والے ہیں اسی طرح وہ نہایت قابل اور اعلیٰ تعلیم و تربیت پائے ہوئے ہندوستانی اہل کار جو ہمارے دیوانی، فوجداری اور مال کے محکموں میں نیک نامی سے کام کر رہے ہیں اور ہندوستانی رعایا اور حکومت ہند کو فائدہ پہنچا رہے ہیں، وہ بھی زیادہ تر اودھ ہی کے باشندے ہیں۔“

”کینی کو بہادر سپاہی اور تعلیم یافتہ افسر زیادہ تر اودھ کی سلطنت

سے ملتے ہیں۔ ہندوستان کے کسی دوسرے خطے میں جس کی وسعت اودھ کے برابر ہو، ایسے بہادر کسان اور اتنے تعلیم یافتہ شرفاء اور امرائیں نہیں ملے۔ بادشاہ کے جلوں کے ڈھائی سال بعد سلیم نے اپنے خط مورخہ اگست ۱۸۴۹ء میں لارڈ ڈالہؤزی کو لکھا کہ اودھ کی زمین ہندوستان میں سب سے اچھی ہے، آدمی بھی ایسے ہی ہیں۔ انتظامی عہدوں کے لیے تعلیم یافتہ طبقے کی کمی نہیں ہے، بلکہ وہ تقریباً اتنی ہی کثرت سے ہیں جتنی کثرت سے سپاہیوں کا طبقہ ہے۔

سلیم اودھ کا دورہ کر کے ۲۴ فروری ۱۸۵۱ء کو لکھنؤ واپس آیا اور دوسرے کی مفصل رپورٹ لکھ کر پیش کی۔ اس سے صرف ڈیڑھ برس پہلے ٹھگی اور ڈگیتی کے افسانہ کے انگریزی نکلنے کی رپورٹ میں وہ اودھ کی رعایا کے امن و اطمینان، کسانوں کی دلیری، خوش حالی اور خوش اخلاقی، دفتری اہل کاروں کی قابلیت اور فرض شناسی، سپاہیوں اور فوجی افسروں کی بہادری اور وفاداری کی پُر زور الفاظ میں تعریف کر چکا تھا۔ لیکن اس رپورٹ میں اودھ اور اودھ والوں کے بارے میں ان چیزوں کا بالکل ذکر نہیں کیا۔ اس کی رپورٹ میں اودھ کی حکومت پر جو غلط الزام لگائے گئے تھے بادشاہ ان کا جواب دینا چاہتے تھے۔ دسمبر ۱۸۵۱ء میں گورنر جنرل لارڈ ڈالہؤزی فتح گوڑھ آئے جو اودھ کی مغربی سرحد پر انگریزوں کی فوجی چھاؤنی تھی۔ بادشاہ نے ان کو لکھنؤ آنے کی دعوت دی جو نا منظور ہوئی تب بادشاہ نے بعض اہم معاملات گوش گزار کرنے کے لیے اپنے دلی عہد اور وزیر کو بھیجے کی اجازت مانگی مگر اجازت نہیں ملی۔ ۲۶ دسمبر ۱۸۵۱ء کو بادشاہ نے ایک خط لکھا کہ گورنر جنرل

لے وائس رائلٹی کے عہد میں اودھ کی رعایا کا امن و اطمینان، کسانوں کی خوش حالی اور خوش خلقی اور ان کے لکھنؤ کی علمی و علمی سطح کی بلندی کا حال جو سلیم کی زبانی معلوم ہوا اس کا مقتضا یہی تھا کہ اس میں علم ادب کے چرچے اور تصنیف و تالیف کے مشغلے عام ہوں مگر ۱۸۵۴ء کا وہ انقلاب جو غور کے نام سے مشہور ہے ایک ایسا سیلاب تھا جس نے اودھ کے علمی اور ادبی کارناموں کو بھی بہا لیا۔

کو آدھ میں بلانے کی غرض ان کی یہ خواہش ہے کہ وہ ہمیشہ خود دیکھ لیں کہ انتظام ملک کی ترقی اور بہتری کے لیے کیا کچھ کیا گیا ہے اور اس طرح وہ شکوک رفع ہو جائیں جو دوسروں کے بیان سے پیدا ہو گئے ہوں۔ اگر عزت مآب آدھ میں تشریف نہ لاسکیں تو فتح گڑھ اور الہ آباد کے درمیان کسی جگہ دلی عہد اور وزیر کو اذن حضور ملیے تاکہ وہ حضرات کو سکین کہ بادشاہ نے اپنی سلطنت کی تھوڑی سی مدت میں کتنا کام کیا ہے جن کاموں کا بادشاہ نے ذکر کیا ان میں سے چند یہ ہیں۔ کئی ضلعوں میں اجارے کی جگہ امانی کا طریقہ جاری کیا گیا؛ مسافروں کی بہتر حفاظت کے لیے بڑی بڑی سڑکوں پر فوجی سپاہی مقرر کیے گئے؛ سرحدوں پر جد بندی کی نزاعوں کا تصفیہ کیا گیا؛ ملک میں مدت سے لٹروں کے جو جتنے موجود تھے ان کو گرفتار کر کے سزا دی گئی؛ عدل و انصاف کے لیے ملک میں نئی کھریاں قائم کی گئیں؛ حکومت برطانیہ نے ملک کے بہتر انتظام کے لیے جو ہدایتیں کیں ان پر عمل کیا گیا۔ اگر دلی عہد اور وزیر کو حضور کی اجازت دی جائے تو امید ہے کہ عزت مآب نے بدانتظامی کے بارے میں جو کچھ سنا ہے اور اس سے جو غیر ہمدردانہ اثرات پیدا ہوئے ہیں وہ دل سے دور ہو جائیں گے۔ مگر ڈھنڈی اپنے انکار پر قائم رہا۔

اب بادشاہ نے طے کیا کہ اپنا مقدمہ اپنے سفیر کے ذریعے سے کلکتے میں پیش کریں۔ سفیر نے ۱۲ اپریل ۱۸۵۳ء کو گورنر جنرل سے ملنے کی کوشش کی، لیکن انھوں نے اجازت نہ دی۔ اور کہا کہ وہ کسی ایسے مراسلے کو بھی نہ دیکھیں گے جو ریڈنٹ کے توسط سے نہ آئے گا۔ سفیر نے گورنر جنرل کے سکریٹری سے ملنے کی کوشش کی مگر اس میں بھی کامیابی نہ ہوئی۔ اب بادشاہ نے اپنا دوسرا نمائندہ ریڈنٹ کے توسط سے بھیجے کا فیصلہ کیا اور ایک تصدیق نامہ ریڈنٹ کی معرفت گورنر جنرل کو لکھا۔ ریڈنٹ نے اس کو بھیج تو دیا مگر ساتھ ہی یہ لکھ بھیجا کہ غازی الدین حیدر کے بعد آدھ کے کسی بادشاہ نے اپنی نمایندگی کے لیے کوئی ذمہ نہیں مقرر نہیں کیا۔ اس کے علاوہ بادشاہ نے جس شخص کو وکیل مقرر کیا ہے وہ ایک گم نام آدمی ہے۔ یہ اطلاع پا کر گورنر جنرل نے ریڈنٹ کو لکھا کہ بادشاہ کو

ہدایت کی جائے کہ وہ وکیل کا تقرر منسوخ کر دیں۔ اور اگر وہ منسوخ نہ کریں گے تو یہ سمجھا جائے گا کہ وہ حکومت ہند سے منحرف اور اس کی علانیہ مخالفت پر آمادہ ہو گئے ہیں۔ غرض کہ بادشاہ کی یہ کوشش بھی رائیگاں گئی

ان ناکام کوششوں کے نتیجے میں ریڈینٹ اور زیادہ مخالف ہو گیا۔ اس کی جھوٹی سچی مبالغہ آمیز بلکہ متضاد رپورٹیں تک حوت بہ حوت تسلیم کر لی گئیں اور بادشاہ کو غلط الزام کی تردید کرنے اور صحیح صورت حال پیش کرنے کا کوئی موقع کسی طرح نہ دیا گیا۔ اگر بادشاہ کو اپنی صفائی پیش کرنے کا موقع دیا جاتا اور وہ بد انتظامی کے الزام کو غلط ثابت کر دیتے تو آدھ کی ضبطی کو حوت بجانب قرار دینا مشکل ہو جاتا۔

سلیمن صحت کی خرابی کی بنا پر ملازمت سے علیحدہ ہو گیا اور کرنل اوڈنم ریڈینٹ مقرر ہو کر ۵ دسمبر ۱۸۵۴ء کو لکھنؤ پہنچا۔ اس وقت بادشاہ بہت بیمار تھے۔ کچھ دن بعد وہ بادشاہ سے ان کے محل میں ملا۔ جوڈ اکثر اس کے ساتھ تھا اس نے بتایا کہ دو ہفتے پہلے بادشاہ کی جو حالت تھی اب اس سے زیادہ خراب ہے۔ اوڈنم کے لکھنؤ پہنچنے سے پہلے ہی ڈومیزی نے نئے ریڈینٹ کے لیے ایک ہدایت نامہ جاری کر دیا تھا کہ بادشاہ کی وفات کی صورت میں ان کا بڑا بیٹا ولی عہد تخت پر بٹھا دیا جائے۔ اسی کے ساتھ یہ ہدایت بھی تھی کہ ریڈینٹ ملک کے حالات کی تحقیق کر کے اپنی رپورٹ گورنر جنرل کو بھیجے۔ اوڈنم نے صرف تین مہینے میں رپورٹ لکھ کر ۱۵ مارچ ۱۸۵۵ء کو بھیج دی جو اس کی ذاتی تحقیق پر مبنی نہیں تھی۔ اس نے خود سکرٹری ڈوگرنٹ کے نام اپنے خط مورخہ ۱۵ مارچ ۱۸۵۵ء میں اقرار کیا ہے کہ ملک کے حالات سے ذاتی واقفیت کی عدم موجودگی میں اپنی اطلاع کے لیے مجھے ریڈینٹ کے کاغذات میں لکھی ہوئی باتوں پر بھروسہ کرنا پڑا ہے۔ یعنی اس نے اپنی رپورٹ میں بغیر تحقیق کیے ہوئے وہی باتیں لکھ دیں جو سلیمن اپنی رپورٹوں میں لکھا

۱۔ بھٹنا گرو ۸۲-۸۴ء نے آخری تاج داراؤدھ ۶۶ء دھٹنا گرو ۵۱ء

بادشاہ کے مرتبے اور اختیارات کو کم سے کم نقصان پہنچایا جائے۔ دو مہینے تک غور کرنے بعد کورٹ آف ڈائریکٹرس نے ۱۲ نومبر ۱۸۵۵ء کو اسحاق کی اجازت دے دی اور ڈیپوزی نے اوڈھم کو کلکتے بلا کر ۲۳ جنوری ۱۸۵۶ء کو حیدر علی ہدایتیں کر دیں۔ ان میں یہ ہدایت بھی تھی کہ جتنی فوج اس کو درکار ہو وہ کانپور اور کانپور سے لکھنؤ بھیج دی جائے۔ ڈیپوزی نے ایک بہت مفصل خط بادشاہ کو لکھا جس کا خاتمہ یوں کیا گیا تھا کہ اگر برٹش گورنمنٹ ایسی حکومت کو قائم رکھے گی جس سے لاکھوں آدمی مصائب میں مبتلا ہوں تو وہ خدا اور بندوں کی نظر میں مجرم قرار پائے گی۔

سلیم کی رپورٹ اسحاق اودھ کے لیے کام میں لائی گئی۔ مگر وہ اسحاق کی پالیسی سے مستحق نہیں تھا۔ اس نے صاف کہہ دیا تھا کہ ہمیں اودھ کے اسحاق یا ضبطی کا کوئی حق نہیں ہے۔ ۱۸۳۷ء کے عہد نامے کے مطابق اودھ کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لینے کا حق ضرور ہے مگر محاصل ملک کو اپنے تصرف میں لانے کا حق نہیں ہے۔ اودھ کی ضابطی بے ایمانی اور کمیٹہ پن ہوگی اور اسحاق رعایا کو اتنی ہی بری حکومت دینا ہوگا جیسی کہ ان کی ہے۔ اس نے صرف مشورہ دیا کہ گورنمنٹ برطانیہ انتظام حکومت اپنے ہاتھ میں لے لے۔ اور بادشاہ کے واسطے مناسب وظیفہ مقرر کر دے۔ ڈیپوزی کے اپنی پالیسی پر اصرار کرنے کی صورت میں وہ مستعفی ہو جانے تک کے لیے تیار تھا۔ مگر صحت کی خرابی کی بنا پر اس کو ملازمت سے علیحدہ ہو جانا پڑا اور طویل بیماری کے بعد کلکتے سے انگلستان جاتے ہوئے راستے میں ۱۰ فروری ۱۸۵۶ء کو اسحاق اودھ کے صرف تین دن بعد وہ انتقال کر گیا۔ (بھٹناگر ص ۵۹)

اس سے پہلے سلیم نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ اودھ کے انتظام کے لیے ایک بورڈ بنا دیا جائے، جس میں لکھنؤ کے اوّل درجے کے امرا اور افضاء اور مالیات کے محکموں سے چند قابل ترین ہندوستانی افسر شامل ہوں۔ یہ تجویز منظور نہیں ہوئی اور سلیم کو ہدایت کی گئی کہ وہ نئے احکام کا انتظار کرے۔

بادشاہ کی معزولی اور اودھ کا الحاق

انگریز چیکے چیکے بادشاہ کی معزولی اور ملک اودھ کی ضبطی کی تیاریاں کرتے رہے بادشاہ اور اہل ملک کو اپنے منصوبوں سے بے خبر رکھا۔ پیدل اور سوار فوجیں اور توپ خانے نواح شہر میں جمع کر دیے۔ کچھ دن پہلے جب انگریزی فوجیں کانپور میں جمع ہو رہی تھیں تو بادشاہ نے دریافت کیا کہ اودھ کی سرحد پر فوجیں جمع کرنے کی کیا ضرورت ہے تو قائم مقام رزیدنٹ نے یہ جھوٹی اطلاع دی کہ شاہ نیپال یا تبرا پر جانے والے ہیں۔ یہ فوج اس لئے جمع کی گئی ہے کہ سرحد پر کوئی فساد نہ ہو۔

۳۰ جنوری ۱۸۵۶ء (۲۱ جمادی الاول ۱۲۷۵ھ) کو رزیدنٹ اور ٹرم کلکتے سے لکھنؤ آیا۔ وزیر اعظم حضور عالم نے حسب معمول استقبال کیا۔ رزیدنٹ نے ان کو دوسرے دن بلایا۔ ۳۱ جنوری کو وزیر اعظم رزیدنٹ سے ملے تو اس نے کہا کہ گورنر جنرل نے کورٹ آف ڈائرکٹرس کے حکم کے مطابق ۱۲ لاکھ سالانہ بادشاہ کے ذاتی مصارف کے لئے اور ۵۰ لاکھ سالانہ عملہ شاگرد پیشہ کے لئے مجموعاً ۱۷ لاکھ سالانہ مقرر فرمایا ہے اور نواب شجاع الدولہ کی اولاد کی تنخواہ اپنے ذمے لے لی ہے۔ اب ممالک محروسہ کا انتظام سرکار کمپنی ہمارے دستوں کے موافق ہو گا۔ اور یہ عہد نامہ جدید تجوزہ نواب گورنر جنرل ہے۔ چاہئے کہ اس پر بادشاہ کمال رضامندی سے اپنی مہر ثبت فرمائیں۔ اس بات میں تمھاری بڑی خیر خواہی سرکار میں ہوگی اور اس کے صلے میں لاکھ روپے کی جائیداد سالانہ نقد یا بدستور قدیم قصبہ منچر ٹنڈا بعد نیل تمھارے واسطے ملے گی۔ ورنہ در صورت خلاف مجرم سرکار ہو گے۔ وزیر اعظم نے دلیں اگر نہایت پریشانی اور سرسبکی کے عالم میں حقیقت حال بادشاہ سے عرض کی۔

یکم فروری ۱۸۵۶ء کو رزیدنٹ نے بادشاہ سے مل کر احکام صدر سے مطلع کیا اور کہا کہ جو عہد نامے سعادت علی خاں کے ہمد سے آج تک ہوئے ان کی تعمیل نہیں کی گئی۔

اب وہ سب فسوخ کئے گئے۔ لہذا چند دفعات کے جدید عہد نامے کو آپ منظور کر کے رضا مندی سے اس پر مہر فرمادیں۔ اگر منظور نہ کیا تو گورنر جنرل کو ملال ہوگا۔ بادشاہ نے جواب دیا کہ میں ایسے صریح جبر و ظلم پر ہرگز راضی نہ ہوں گا۔ یہ وبال سلطنت اپنے اوپر کیوں کر گوارا کروں۔ اس خبر کی شہتہ ہوئے ہی تمام شہر میں گھر گھر عجب ماتم برپا ہوا۔ شہر کے درو دیوار سے ویرانی برس رہی تھی۔ تین دن تک کسی نے کچھ نہیں کھایا۔ رزیدنٹ سے گفتگو کے بعد بادشاہ کے حکم سے فوج کی تنخواہ ادا کر کے سرفردی کو فوج برخواست کر دی گئی اور تین چرخ سے اتار دی گئیں۔

رزیدنٹ نے سابق وزیر آودھ نواب امین الدولہ کو بھیجا کہ بادشاہ کو سمجھاؤ کہ راضی نامے پر مہر کرنے میں ان کی سراسر بہتری ہے اور اس کے خلاف میں بہت سی قبائلی پیش آئیں گی۔ مگر بادشاہ اپنے انکار پر قائم رہے۔ دو تین دن کے بعد رزیدنٹ کے ہندیدی حکم کے خوف سے وزیر اعظم حضور عالم نے عرض کیا کہ حضرت مہرنہ فرمائیں گے تو میری عزت اور جان مفت برباد ہوگی۔ ورنہ یہ قراولی اور میرا سر حاضر ہے مگر بادشاہ اس پر بھی اپنے انکار پر قائم رہے۔ ایک دن بادشاہ کے بھائی جرنیل صاحب نے خلوت میں سمجھانے کی کوشش کی۔ ارشاد کیا میں کسی صورت سے مہرنہ کروں گا اور سفر سے بھی ہاتھ نہ اٹھاؤں گا۔ اس کے بعد مفتاح الدولہ سے کہا کہ اگر مفسدین کے اغواء سے میں بھی ہر طلب کروں تو نہ دینا۔

یہ نیا عہد نامہ سات دفعات پر مشتمل تھا۔ اہم دفعات کا خلاصہ حسب ذیل ہے:-
 دفعہ اول۔ ملک آودھ کی دیوانی اور فوجی حکومت اور محاصل ملک پر کامل اختیار دائمی طور پر بلا شرکت غیرے تنہا ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہاتھ میں رہے گا۔
 دفعہ دوم۔ بادشاہ کا شاہی خطاب یعنی بادشاہ آودھ باقی رہے گا اور ان کے جانشینوں تک پہنچتا رہے گا۔

دفعہ چہارم۔ لکھنؤ کے محلوں اور بی بی پور اور دکنشا کے باغوں پر بادشاہ اور ان کے جانشینوں کی حکومت رہے گی۔ لیکن ان حدود کے اندر موت کی سزا دینے کے لیے بادشاہ کو گورنر جنرل کی منظوری حاصل کرنا ہوگی۔

دفعہ پنجم۔ الیسٹ انڈیا کمپنی محاصل اور دھ میں سے بارہ لاکھ روپیہ سالانہ بادشاہ کو دیتی رہے گی۔ اس کے علاوہ بادشاہ کے لئے پولیس کا ایک دستہ رکھے گی جس پر تین لاکھ روپیہ سالانہ سے زیادہ صرف نہ کیا جائے گا۔ بادشاہ کے جانشینوں کو کمپنی بارہ لاکھ روپیہ سالانہ دیتی رہے گی۔

دفعہ ششم۔ شاہی خاندان کے جن افراد کی کفالت بادشاہ کرتے تھے انکو کمپنی گزارہ دیتی رہے گی۔

گورنر جنرل نے دو طرح کے اعلان کئے کہ ریڈرنٹ کو بھیجے کہ اگر بادشاہ عہد نامے پر دستخط کر دیں تو اعلان الف ملک بھر میں شایع کر دیا جائے اور اگر دستخط نہ کریں تو گورنر جنرل ان کاؤنسل کی ہدایت کے مطابق ریڈرنٹ فوراً اودھ کی حکومت اپنے ہاتھ میں لے لے اور اعلان ب کے شایع کر دے۔

۴ فروری کو ریڈرنٹ چند فوجی افسروں کے ساتھ بادشاہ کے پاس گیا اور گورنر جنرل کا خط پیش کیا اور کہا کہ یہ راضی نامہ حاضر ہے اس پر مہر فرمائیے۔ سات وسیع مکان، شاہ منزل، مبارک منزل، خوشید منزل، سکندر باغ، بادشاہ باغ، قیصر باغ، رمنہ، کوٹھی دکنشا سیر و تفریح کے واسطے قبضہ اختیار میں رہیں گے۔ باقی کل املاک قدیم اور جدید ہمارے اختیار میں رہے گی۔ آج سے تین دن تک آپ کو اختیار ہے۔ اس کے بعد ۷ فروری سے ہمارے احکام جاری ہوں گے۔ اگر آپ ہم کو راضی رکھیں گا تو آپ کے لیے بہتر ہوگا اور اگر ہماری ناراضی منظور ہے تو شاید لکھنؤ میں قیام بھی مشکل ہو جائے، بلکہ فیض آباد میں سکونت ہو۔

ریڈرنٹ رخصت ہو کر جب شاہی در دولت پر پہنچا تو گارڈ نے دستی سلامی دی۔

پہرے جا بجا بے اسلحہ تھے۔ اس کا سبب پوچھا۔ بتایا گیا کہ انگریزی فوج کی آمد پر جنگ کا خدشہ دور کرنے کے لیے بادشاہ کے ملازمین اور رعایاے شہر کو ہتھیار باندھنے کی ممانعت کر دی ہے اور توپیں چرخ سے اتروادی ہیں۔ بادشاہ کے حکم سے فوجی ملازموں کی بتایا تنخواہ ادا کر دی گئی ہے اور ۳۰ فروری ۱۸۵۷ء سے وہ درخواست کر دیے گئے ہیں۔ اس پر ریڈنٹ نے بادشاہ کو ایک تحریر بھیجی کہ اگر کوئی فساد برپا ہوگا تو ذمہ داری آپ پر ہوگی۔ اس کے جواب میں بادشاہ نے لکھا کہ فوجیں درخواست کی جا رہی ہیں۔ مگر امن و امان قائم رکھنے کے لیے پولیس موجود رہے گی۔

۵ فروری ۱۸۵۷ء (۲۷ جمادی الاول ۱۲۷۶ھ) کو بادشاہ نے دو حکم نامے ریڈنٹ کے پاس بھیجے۔ ایک تحصیل داروں، تعلقہ داروں، مال گزداروں، زمین داروں، فوجی افسروں، تھانے داروں، صیغہ داروں اور کل رعایاے آؤدھ کے نام تھا۔ وہ حکم نامہ گورنر جنرل اور ملکہ انگلستان کے لئے تعریفی، تعظیمی اور دعائیہ کلمے حذف کر کے ذیل میں نقل کیا جاتا ہے:-

حکم نامہ مہر کچہری خاص سلطان عالم

”در ایں ولا حسب الحکم سرکار کمپنی انگریز بہادر کلہ گزداران سرکار موصوف برائے انتظام قلم و اودھ مامور شدہ دخل خود خو اہند کرد۔ لہذا بایہ کہ پیش اہالیان سرکار رجوع آؤدھ یہ تعمیل احکام منشیہ اداے زر مال گزاری و اطاعت رعیت گیری پر داند۔ نہ ہمارے متکب تمزد و اخراجات نشو و دار باب فوج رانی بایہ نبوسے دیگر ذمگہ و فساد نہ نمایند الا در باب تدارک اہالیان آں سرکار راہر گوئے اختیار است۔ و ہنگامے کہ مابہ دولت و انقبال برائے اظہار حال تو... وہ سامی خدمت... گورنر جنرل بہادر... و گزارش حال بعضیہ... ملکہ رفیع الدرجہ انگلستان... روانہ دار الحکومت کلکتہ و ولایت شومیم زنبہار ارادہ ہمارا ہی نسا زدند۔“

لے قیصر التواذیل جلد دوم ۱۳۳

ترجمہ: کمپنی انگریز بہادر کے حکم سے کمپنی کے کار گزار ملک کے انتظام کے لیے مقرر کئے گئے ہیں اور وہ اودھ میں اپنا داخل کریں گے۔ لہذا چاہیے کہ سرکار کمپنی کے اہل کاروں کی طرف رجوع کر کے ان کے احکام کی تعمیل، ذرا مال گزاری کی ادائیگی اور رعایا کی طرح اطاعت کریں۔ برکشی اور مخالفت کے ہرگز فریب نہ ہوں۔ اور فوج کے آدمیوں کو چاہیے کہ کسی طرح کا دنگا فساد نہ کریں۔ ورنہ سرکار کمپنی کے عہدہ داروں کو اس کی روک تھام کے لیے ہر طرح کا اختیار ہے۔ اور جب ہم اپنا معاملہ گورنر جنرل اور ملکہ انگلستان کے سامنے پیش کرنے کے لیے کلکتہ اور ولایت جائیں تو ہماری ہم راہی کا ارادہ ہرگز نہ کریں۔

دوسرا حکم نامہ افسران فوج کے نام تھا جو ذیل میں درج کیا جاتا ہے:-

حکم نامہ مہر خاص سلطان عالم
 ”بنام افسران فوج تعیناتی و ملکی معاملات سلون و مانک پور بہاری باید
 کہ آئینہ بکار خود مستعد باشند و نوع فتنہ و فساد سازند و کہ انہی بے انتظامی
 شن بناید و تنخواہ آئینہ بعد جملے وصول از سرکار کمپنی انگریز بہادر عنایت
 خواہد شد۔ احدے از مقام جنبش نسا زدند۔“

ترجمہ:- سلون اور مانک پور بہادر کی تعیناتی اور ملکی فوج کے افسروں کو چاہیے کہ اپنے اپنے کام میں مستعد رہیں اور کسی طرح کا فتنہ و فساد اور کوئی بے انتظامی نہ ہونے پائے۔ ان کی تنخواہ وصول شدہ رقم بحر اکر کے سرکار کمپنی سے ملے گی۔ کوئی اپنی جگہ سے جنبش نہ کرے۔

ضبطی ملک اور معزولی بادشاہ کا اشتہار، فردی عہدہ کو ضبطی ملک اور معزولی اور بادشاہ کا لکھنؤ پھوڑنے کا ارادہ بادشاہ کا اشتہار ہر تھانے پر لگا دیا گیا۔ شہر میں ایک تلاحیم عظیم برپا ہوا۔ رعایاے شہر خاص بازار سے بلی گار دنگ بنادی

لے فیصلہ تواریخ جلد دوم ص ۱۱۷ یہ اشتہار احسن التواریخ ص ۱۱۷ پر ارد قیصی التواریخ (باقی لکھنؤ)

سننے کے لیے جمع ہو گئی لیکن منادی موقوف رہی۔ اس اشتہاد کے جواب کلکتہ، آگرہ،
دہلی وغیرہ کے اخباروں میں انگریزی، فارسی اور اردو میں متواتر چھپتے رہے۔
چیف کمشنر نے کلکتہ تدارک بھیج کر دریافت کیا کہ بادشاہ اودھ استغاثے کے واسطے
جانا چاہتے ہیں اور اہداری کی چٹھی اور رسد وغیرہ کی امداد سرکار کمپنی انگریز بہادر سے
چاہتے ہیں۔ اس باب میں جو ارشاد ہو۔ صاحبان کلکتہ نے اس کے جواب میں لکھا کہ شاہ اودھ
کی خاطر داری اور تکویم ہم سب کو بجان و دل منظور ہے۔ اس واسطے کمپنی بہادر کی عمل داری
میں صاحبوں، مجسٹریٹوں اور کلکٹروں کے نام چٹھی جاری کر دی گئی ہے کہ جب بادشاہ اودھ
کمپنی کی عمل داری میں قدم رکھیں تو ہر مجسٹریٹ اپنے حلقے میں استقبال کرے اور چھاؤنی
میں اکیس توپوں کی سلامی ہو اور وہاں جو کوٹھی سب سے بہتر ہو وہ شاہ اودھ کے قیام
کے لیے مقرر ہو۔ جب بادشاہ کلکتہ کے قریب پہنچیں تو گورنر جنرل بہادر مع کل صاحبان
عالی شان ۵ کوس سے پیشوائی کر کے لائیں گے۔ کلکتہ کے خاص شاہی قلعے میں اکیس
توپوں کی سلامی ہوگی پس شاہ اودھ کو مطلع کرو کہ شاہی جلوس کے ساتھ تشریف
لائیں۔ ہم سب کی خوشی ہے۔

بادشاہ نے مولوی مسیح الدین خاں کو جو کلکتہ میں گورنر جنرل کے میسر رہ چکے تھے،
سات سو روپے ماہوار تنخواہ مقرر کر کے اور ضروری مصارف کے لیے کافی رقم دے کر
کلکتہ بھیجا کہ لشکر اور متعلقان شاہی کی گنجائش کے قابل کوئی کوٹھی کرایے پر لیں اور
جہاز کے کرایے وغیرہ سے مطلع کریں۔ وہ گورنر جنرل کے پرائیوٹ سکریٹری سے ملے۔
ان کی زبان پر بادشاہ کے مقاصد سفر معلوم کر کے۔ گویا اب تک معلوم نہ تھے۔
انگریز اپنے قول سے ہٹ گئے اور بادشاہ کو لکھا گیا کہ محض معارضہ اور مطالب مطلوبہ
کے واسطے کلکتہ تشریف لارہے ہیں، اس لیے جو چاہئے تنفا وہ عمل میں نہ آئے گا۔
بلکہ بعض وجوہ سے شاید گورنر جنرل سے ملاقات بھی نہ ہوگی۔ اور بادشاہ کے ساتھ
ماہ

پانچ سو آدمیوں سے زیادہ نہ ہوں۔ انگریزوں کے ملازمین میں بیکار اس حد کی تبدیلی دیکھنے کے بعد بھی بادشاہ سفر کے ادا دے پر قائم رہے۔ بادشاہ کے بھائی جرنیل صاحب مرزا سکندر حسمت نے اور بعض دوسرے بھی خواہوں اور غرض مندوں نے بادشاہ کو سفر سے روکنے کی کوشش کی لیکن انہوں نے سوچ سمجھ کے جواب دہ کر لیا تھا اس کو کسی طرح نہ بدلا۔

مصنف احسن التواریخ نے یہ حالات اختصار کے ساتھ یوں بیان کیے ہیں:

”جنرل اوٹرم صاحب بہادر نے.... تاریخ یکم ماہ فروری ۱۸۵۶ء بادشاہ کو اطلاع دی کہ سرکار کمپنی انگریز بہادر تاریخ ہفتم فروری سنہ حال سے ملک اور دھیر اپنا قبضہ کرے گی۔ آپ کو بندوبست کے واسطے ایک ہفتے کی مہلت ہے۔ بادشاہ نے بغور سماعت اس بات کے کل سار و بار سلطنت کو بند کر دیا۔ توپوں کو چرچ سے گر وادیا اور احکام بنام جملہ ملازمین و غلامان اس مضمون کے جاری فرمائے کہ خود بدولت سمت لندن واسطے استغاثے کے جلتے ہیں۔ تم سب تعمیل احکام امالی سرکار کمپنی انگریز بہادر میں مصروف رہو۔ تاریخ ہفتم ماہ فروری ۱۸۵۶ء کو قطعہ اشتہار خاص شہر لکھنؤ میں مشہور ہوا اور بذریعہ اس اشتہار کے کل دناتر شاہی پر قبضہ کر لیا گیا۔“

لے قیصر التواریخ جلد دوم ص ۱۵۳ ۱۵۴ احسن التواریخ ص ۴۴

بادشاہ کا سفر کلکتہ

یہ ادھر لکھا جا چکا ہے کہ بادشاہ نے مولوی سیح الدین خاں کو کلکتے بھیجا کہ بادشاہ اور ان کے متعلقین وغیرہ کے قیام کے قابل کوئی کوٹھی کرایے پر لیں۔ سیح برٹ کو بادشاہ نے اپنا سفیر مقرر کیا۔ چیف کمشنر نے تار سے صدر کو اطلاع دی کہ بادشاہ استغاثے کے واسطے لندن کے سفر میں تھیل کرتے ہیں۔ جواب آیا منع نہ کرو آنے دو۔ یہ خبر سن کر تیاری سفر کی دھوم ہوئی۔ اس عرصے میں لارڈ ڈولہوزی واپس گیا اور لارڈ کینگ گورنر جنرل ہو کر آیا۔ اس نے بادشاہ کو ایک خط لکھا جس کا خلاصہ یہ ہے کہ مجھ کو گزشتہ حالات معلوم ہوئے سرکار میں جو محبت و اتحاد قدیم زمانے سے ہے اس کا مقتضایہ ہے کہ طرفین سے ہر امر اسی طریق سے عمل میں آتا رہے۔

۵ رجب ۱۲۷۴ھ مطابق ۱۲ مارچ ۱۸۵۷ء کو بادشاہ بذریعہ بادبہاری کانپور کے لیے روانہ ہو گئے۔

ہوا شہر میں غل سواری چلی گستاں سے بادبہاری چلی

بوداماندہ تھے رنج ان کو رہے ہزاروں کی آنکھوں سے آنسو بہے

قلق سے زمانے کا دم گھٹ گیا خداوند سے جب وطن چھٹ گیا

آودھ کی رعایا اپنے بادشاہ سے بہت محبت رکھتی تھی۔ ان کی روانگی کے وقت سارا شہر کھنوا ایک باقم خانہ بن گیا اور بادشاہ کی حماقت کے باوجود ان کو رخصت کرنے کے لیے ہزار آدمی ساتھ ہو کر کانپور تک گئے۔ بادشاہ اپنی سلطنت کی واپسی کا دعویٰ پارلیمنٹ میں پیش کرنے کے لیے لندن جانا چاہتے تھے۔ اس بنا پر شاعروں نے اپنے دلی رنج کا اظہار یوں کیا :-

لے قیصر التواریخ جلد دوم ص ۱۶۱ ۲۰ بادشاہ کی سواری کی خاص گاڑی کا نام بھی

’بادبہاری‘ تھا۔

Channel eGangotri Trust

لکھنؤ بے کس ہوا حضرت جو لندن کو گئے
ہم یہاں نالاں ہیں وہ فریاد دشمن کو گئے
(مشہد شاگرد ناسخ)

عوام نے اپنی محبت اور غم کے جذبات کو یوں ظاہر کیا :
واجد علی مرا پیارا آپ لندن کو سدھارا
گلیوں گلیوں خاک اڑتے سڑکوں پر اندھیا را
آپ لندن کو سدھارا

دہات کے لوگ ایک گیت گاتے تھے جس کے ابتدائی دو بول یہ ہیں :
حضرت جاتے ہیں لندن : ہم پر کرا کر دو لکھنؤ لندن
سفیر لکھنؤی اہل شہر کے غم کا اظہار یوں کرتے ہیں :

ہے زبان پر ہر اک کے نالہ و آہ جان تھا سارے لکھنؤ کی وہ شاہ
شہر شہ کے قدم سے تھا آباد امرا عیش میں رعیت مشاد
چشمہ فیض عام جاری تھا کس دنیا کس کا کام جاری تھا
قہر ڈھاتی ہے نالے دوری شاہ یاد آتی ہے اب حضوری شاہ
لکھنؤ سارا ہو گیا دیران کوچہ کوچہ پڑا ہے اب انسان

ہوئی اس درجہ خانہ بربادی

نام کو رہ گئی ہے آبادی

لکھنؤ سے رخصت ہوتے وقت بادشاہ نے بارہ بند کا ایک ترجیع بند محض کہا
جس کے تین بند نقل کیے جاتے ہیں :

شب اندوہ سے رو رو کے سحر کرتے ہیں دن کو کس رنج و ترو میں بسر کرتے ہیں

لے گلشن عشق از بادشاہ علی سفیر خلیف خواجہ ذریعہ

نالہ و آہ غرض آٹھ پہر کرتے ہیں درو دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں

خوش رہو اہل وطن ہم تو سفر کرتے ہیں

دوستو شاہ رہو تم کو خدا کو سونپا ہم نے اپنے دلِ نازک کو جفا کو سونپا

قصری باغ جو ہے اس کو صبا کو سونپا درو دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں

خوش رہو اہل وطن ہم تو سفر کرتے ہیں

سائے اب شہر سے ہوتا ہے یہ خیرِ صحت آگے بس اب نہیں کہنے کی ہر جگہ کو فرصت

ہو نہ برباد مے ملک کی یارب خلقت درو دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں

خوش رہو اہل وطن ہم تو سفر کرتے ہیں

سلطنتِ اودھ کا خاتمہ صرف اودھ والوں کے لیے غمِ ناک حادثہ نہیں تھا۔
سارا ہندوستان اس سے متاثر تھا۔ غالب دہلوی اپنے ایک خط بنام قدرِ بلگرامی
مورخہ ۲۳ فروری ۱۸۵۷ء میں لکھتے ہیں :-

”تباہی ریاستِ اودھ نے، بااں کہ بیگانہ محض ہوں، مجھ کو اذر

بھی افسردہ دل کر دیا۔ بلکہ میں کہتا ہوں سخت نا انصاف ہوں گے وہ

اہل ہند جو افسردہ دل نہ ہوئے ہوں گے“

”انتزاعِ سلطنتِ اودھ کی خبر سننے ہی تمام ملک میں تہلکہ مچ گیا خصوصاً محلوں
میں تو کھرام مچ گیا، خشر و پیا ہو گیا“

اس سلسلے میں نواب خاص محل کے ایک خط کے کچھ حصے نقل کیے جاتے ہیں جو
انہوں نے کلکتے پہنچ کر ۲۹ رمضان ۱۲۷۲ھ کو شیدا بیگم کو لکھا تھا۔

”بہن شیدا بیگم! میراں جی کی، ۲۷ تاریخ ۱۲۷۲ھ بخشنہ

لے مجموعہء ہجویاتِ قلمی۔ صفی دارالطالعہ، لکھنؤ، ۱۳۷۲ھ ادبی خطوط غالب ص ۵۵

لے کلامِ ستہ اودھ از بلاتی داسن دہلوی

۲۷۳

کان پور میں اکثر صاحبان عالی شان بادشاہ کی ملاقات کے مشتاق ہوئے۔ ایک دن لارنس صاحب چیف کمشنر لاہور بھی آئے لیکن ملاقات نہ ہوئی۔ نواب منور الدولہ استقبال کر کے اپنی کوٹھی میں لے گئے اور مزاج اقدس کی ناسازی کا عذر کیا۔ تقریباً ایک مہینہ کان پور میں قیام کر کے، اپریل ۱۸۵۶ء مطابق یکم شعبان ۱۲۷۲ھ الہ آباد کے لیے روانہ ہوئے۔

غرض اک مہینہ بے ہم دہاں وہ گرمی وہ گرمی غضب الاماں
(شیوع فیض ص ۱۲۷)

فقر اور رعایا بہت جمع ہو گئے تھے۔ ان کو کچھ عنایت کیا۔ سب دست بہ دعا ہوئے۔ راہ میں الہ آباد تک ہر مقام پر سامان ضروری درست تھا۔ کان پور سے چل کر ایک دن فتح پور میں کرایے کے بنگلے میں رہے۔ وہاں سے الہ آباد پہنچے اور ایک بھٹیارے کے مکان میں آٹھ دن قیام کیا۔ پانچ سو روپے کرایہ طے ہوا تھا مگر اس نے لڑ جھگڑ کر پچیس سو وصول کیے۔ الہ آباد سے چل کر ایک دن گوپی گنج میں رہے، پھر بنارس پہنچے۔ کان پور سے روانگی کے قبل بنارس کے ہمارا جہ اشرفی پر شاذ نرائن سنگھ بہادر کی عرضداشت نواب منور الدولہ کی معرفت نظر اقدس سے گزری کہ محب خیر طلب موردی ہے اور اس خانہ دان عالی شان کا ممنون قدیم ہے۔ مرحمت خسروانی کا امیڈا ہے کہ حضور بنارس میں املاک خیر اندیش میں رونق افروز ہوں۔

(فیض - ج ۲ - ص ۱۶۹)

۱۶ اپریل ۱۸۵۶ء مطابق ۹ شعبان ۱۲۷۲ھ کو بنارس کی چھاؤنی نیکوہ میں ہمارا جہ صاحب بنارس کی کوٹھی میں رونق افروز ہوئے۔ ہمارا جانے بادشاہ کا استقبال اور ان کے قیام کا انتظام جس خوش اسلوبی سے کیا تھا اس کا ذکر بادشاہ نے اپنے دو منظوم خطوں میں یوں لکھا ہے۔

ایک راجہ ملا وہاں وہ نیکوہ لاکھ راجاؤں میں تھا راجا ایک

ایسی خاطر ہماری کی اُس نے آتے ہی ہم کو نذر دی اُس نے
کشتیاں پیش کش جو اہر خوب سب قرینے سے اور با اُسلوب
پانچ سو روپیہ برائے نثار بہر دعوت بھی بھیجے سات ہزار
خوب کو کھٹی سچی سجائی درست چاق ہو ہو گئے دہاں سب مُست

پندرہ روز ہم رہے اُس جا
ایک میلہ تھا اک تماشہ تھا

بنارس کا راجا عجب نیک تھا ہزاروں میں لاکھوں میں وہ ایک تھا
مکان اس نے پہلے کیا تھا درست سبھوں کی طبیعت ہوئی خوب چُست
ہدایا بہت خوب معقول سب جو اہر کی بھی ایک کشتی عجب
وہ نشینے کی کشتیاں تین چار تو ہر قسم کے پارچے بے شمار
دہ سب کشتیاں ایک اوپر پاس جو کیں پیش کش آئیں وہ سبے پاس

عجب لطف سے پندرہ دن رہے
کہ کچھ عیش رفت بھی یاد آگئے

بادشاہ کی قدم بوسی کے بعد جب راجا رخصت ہونے لگا تو بادشاہ نے شرمندگی
کے ساتھ کہا کہ اگر قدرت ہوتی تو ہم راجا کو ہاتھی اور پالکی کے ساتھ خلعت دیتے۔ اب
اس کی قیمت کے موافق زر نقد ان کو دیا جائے۔ ہم نے ان کی نذر اور پیش کش قبول کر لی۔
یہ اس کو ہماری امانت کے طور پر اپنے پاس رکھ لیں۔ جب خدا ہم کو خلعت دینے کے قابل

کرے گا اس وقت لے لیں گے۔ راجا نے بھی زر نقد نہ لیا اور عرض کیا کہ میں بھی اسی وقت خلعت لوں گا۔

آفتاب الدولہ خواجہ اسد قلی کلکتہ کے سفر میں بادشاہ کے ہمراہ رکاب تھے۔ انھوں نے ”سفر آشوب“ کے نام سے ایک طولانی مسدس میں اس سفر کا حال لکھا ہے۔ اس مقام کے چند بند پیش کیے جاتے ہیں۔

چند دن بعد بنا اس میں تو پائی راحت
داں کے راجا نے بڑی ختم کی انسانیت
اپنے مالک کی ہر اک طرح ادا کی خدمت
شاہ کے آنے کی تھی دل میں جو اس کے حسرت

شادی و فرح سے پھولے نہ سماتا تھا وہ

اپنے جامے ہی سے باہر بڑا جاتا تھا وہ

تھالی بھر کر تو روپے آتے ہی صدقہ بھیجا
پیش کش اور زر نقد بھی شہ کا بھیجا
کیا بیاں کیجیے ایک ایک کو کیا کیا بھیجا
جتنا سامان تھا راحت کا وہ سارا بھیجا

جیسی کرتے ہیں غلام ایسی وفا کی اس نے

سب نمک خواری سرکار ادا کی اس نے

آزاد مست زیارت جو ہوا بلوایا
بعد مجرے کے وہ اشک آنکھوں میں بھر لایا
نذر دے کر قدم شاہ پہ سر نہوڑایا
شہ نے الطاف کیا بیٹھنے کو فرمایا

بیٹھتے ہی کرم شہ کی ثنا کی اس نے

بہر افزائش اقبال دعا کی اس نے

جب قدم دیکھ کے مالک کے ہوا وہ رخصت
شرم سے کہنے لگا وہ شہ عالی ہمت
ہاتھی اور پالکی سے ہم تمھیں دیتے خلعت
پر کریں کیا کہ نہیں آج وہ باقی حشمت

اس کی قیمت کے موافق زر نقد ان کو دو

جس قدر ان کے ہے لائق زر نقد ان کو دو

پیش کش بھی مری جان سے اب ان کا نہیں دو
کہہ دو مقبول ہوا دل میں کچھ آزاد نہ ہو

جب کہ دکھلائے گا وہ دن ہر اقادرجہ کو تب یہ لے لوں گا امانت ہے مری رکھ چھوڑ

عرض کی میں بھی اسی روز یہ خلعت لوں گا

اور جو کچھ کہ مے دل میں ہے حسرت لوں گا

واہ رے پاس جو کہتا تھا کوئی اس کا یار نہ کیا اب کی برس آپ نے کوئی تنہا

تو وہ کہتا تھا کہ ہوں عیش میں ہم تو سرشار اور اس طرح سے لٹ جائے ہماری سرکار

شاہ کیا خاک ہوں کس سے کہیں کس غم میں ہیں

اپنی سرکار کے مٹ جانے کے ماتم میں ہیں

آرزو تھی کہ مرے گھر مرا آتا آئے تانک خواہ بھی ہم چشموں میں عزت پائے

یا فلک دفعۃً اس تہر کی آفت ڈھائے کہ وہ آئے بھی تو تشریف یہاں یوں لائے

بائے کیا روؤں میں اس پھوٹی ہوئی قسمت کو

دیکھوں آوارہ وطن اپنے ولی نعمت کو

بادشاہ بنا رہا میں پندرہ دن رہ کر ہجاز سے کلکتے کے لیے روانہ ہوئے۔ اس

بحری سفر میں بادشاہ کو بڑی تکلیف ہوئی۔ انیس دن کے بعد کلکتہ نظر آیا۔

غرض بعد انیس دن کے صتم بہ لطف خداوند عالی کرم

یہ کلکتہ ہم کو دکھائی دیا زرا کچھ کشادہ ہوا جو صلا

۱۲ رمضان ۱۲۷۲ھ (۱۲ مئی ۱۸۵۶ء) کو کلکتہ پہنچے۔

دکھائی دیا جب کہ ماہ صیام تو کلکتے میں آئے لے نیک نام

جو گینے تو تاریخ تھی ساتویں کہ داخل بنے ہم ہیلوں و حیرتیں

جب کلکتے میں بادشاہ کے درود کا حال معلوم ہوا تو قلعہ فورٹ ولیم سے اکیس توپوں

۱۔ انتخاب اردو و معلیٰ ص ۳۲-۳۵ ۲۔ شیوع فیض ص ۱۶۱ - ۳

حزن اختصار ۲۔

کی سلامتی سر ہوئی لیے
 ہر اک جا ہمارے سلامی ہوئی
 جو تو میں چلیں نیک نامی ہوئی
 یہ بہت اچھا ہوا کہ انتزع سلطنت کے بعد بادشاہ کلکتے روانہ ہو گئے۔ اگر وہ
 لکھنؤ میں موجود ہوتے تو غدر کے زمانے میں جن لوگوں نے برجیں قدر کو دس برس کے
 سین میں اودھ کے تخت پر بٹھا دیا تھا وہ انھیں کو اپنا بادشاہ بناتے، جس طرح دہلی
 میں باغیوں نے جمع ہو کر بہادر شاہ کو شہنشاہ ہند بنا دیا تھا۔ اس صورت میں داجہ علی
 شاہ کا بھی وہی حشر ہوتا جو بہادر شاہ ادران کے خاندان کا ہوا۔
 نامور اور ذی علم شاعر فرقیانی میٹر ٹھی کے ایک قصیدے کا ذکر ادھر آچکا ہے۔
 اسی قصیدے میں شاعر شاہ دہلی کی مثال سامنے رکھ کر داجہ علی شاہ کے ملک چھوڑ کر
 چلے جانے کو کمال حکمت قرار دیتا ہے:

کشیدہ دست از دیار و کشور ہے وفا و ثبات یہاں
 گزیدہ خوش خوش بہ ملک فرماں ضائع شاہ سریر لندن

ز راہ صورت بود بلیت ز روئے معنی کمال حکمت
 نہ بینی آخر بہت شاہ دہلی چہ کرد بازی سپہر زمین

وزیر اعظم نواب علی نقی خاں بہادر
 اودھ کی رعایا بالعموم وزیر اعظم حضور عالم علی نقی خاں کو زوال سلطنت کا
 باعث سمجھتی تھی۔ وہ ریڈیٹ کی مخالفت کے باعث بادشاہ کے ساتھ لکھنؤ سے جا
 نہیں سکے تھے۔ دولت سرے سلطانی میں مقیم تھے۔ کان پور سے بادشاہ کی تحریری تہا

ادریف کشر کے حکم سے ان کو اپنے مکان واقع تحسین گنج میں منتقل ہونا پڑا۔ اس کی کیفیت یہ ہے کہ ۸ اپریل ۱۸۵۶ء کو وہ بند گاڑی میں سوار ہو کر چلے۔ چیف کشر کا چوہدر کوچ بکس پر بیٹھا ہوا تھا اور کئی سوار اور کچھ خاص بردار گاڑی کے آگے پیچھے تھے۔ شہر کے بہت سے بے باک لوگ طعن و تشنیع کی بوچھاڑ کرتے ہوئے تحسین گنج تک ساتھ ساتھ گئے۔ اگر چیف کشر کا چوہدر کوچ بکس پر نہ ہوتا تو گاڑی پر ڈھیلیں اور پتھروں کی بارش ہوجاتی۔ وزیر عظمیٰ کے لکھنؤ سے کلکتے جانے کی روداد یہ ہے کہ "۱۲ رذی قعدہ ۱۲۷۲ھ روضہ شنبہ مطابق ۱۵ جولائی حضور عالم مع عیال و لواحقین و ملازمین و رفیقان سفر ۱۹ گاڑی ڈاک اسپر اور ۲ رانچی میل واسطے اسباب ضروری نقد و جنس قسم طلا و نقرہ و شیشہ وغیرہ و ظروف مصرف و خادمان انانثیہ بعد نصف شب روانہ ہوئے۔ ایک ایک گاڑی میں چار چار سوار یاں زنانی اور گاڑی کی چھت پر ایک مسلح رفیق۔ خود بدلت گاڑی چار اسپر سوار ہوئے۔ دو تین دن کان پور میں قیام کر کے الہ آباد کے لیے روانہ ہوئے۔ زبان عوام وہاں بھی بند نہ ہوئی۔ راہ میں درختوں پر چڑھ کر جو کہنا تھا کہا۔"

ہفتہ وار اخبار طلسم لکھنؤ میں اس سفر کا حال یوں لکھا گیا ہے :
 "رذی قعدہ کی تیرھویں ۱۲۷۲ھ جولائی کی سولہویں ۱۸۵۶ء کو آدھی رات کے وقت نواب علی نقی خاں مع مصاحبین و اہل و عیال ڈاک گھٹی پر کان پور کو روانہ ہوئے۔ ۲ گاڑیاں ڈاک کی عریزوں اور مصاحبوں کی سواری میں ہمراہ تھیں... نقد و جنس جو کچھ لائق ہمراہی کے تھا ساتھ لیا، باقی جا بجا امانت رکھوا دیا۔ جب سواری سڑک پر گوری مردم بازار نے سواری کا اہتمام کیا۔ دم رخصت مسافر کو حُدا اور رسول کو سونپتے ہیں۔ ان لوگوں نے سپرد و شنام کیا جو جو منہ میں آیا

بے تکلف سنایا

راجا درگا پرشا درنڈیلوی لکھتے ہیں کہ بادشاہ کی معزولی کی خبر سن کر ہر طرف نالہ و شہین تھا اور غم و الم چھایا ہوا تھا۔ چھوٹے بڑے، جوان اور بوڑھے حضرت بادشاہ کے لیے افسوس کرتے اور آنکھوں سے آنسو بہاتے تھے۔ مگر وہ نواب علی نقی خاں کو مخرب سلطنت اور انتزاع مملکت کا مانی مانی سمجھ کر سخت گالیاں دیتے تھے اور ہجو یہ اشعار تصنیف و تضمین کر کے گلی گلی اور محلے محلے میں پڑھتے تھے یہ

لکھنؤ میں ایک طرح کے ہندو فقیر جو نانک شاہی فقیر کہلاتے تھے، علی نقی خاں کی ہجو گاتے تھے اور انعام پاتے تھے۔ کوئی بینتالیس برس ہوئے کہ ایسے ایک فقیر کو میں نے بھی دیکھا تھا۔ وہ ایک ہاتھ میں لوہے کے کڑے پہنے ہوئے اور ایک چھوٹی لکڑی کی ڈنڈی اسی ہاتھ میں لیے ہوئے اس سے ان کڑوں کو بجا بجا کے علی نقی خاں کی ہجو گاتا تھا ایک سخت ہجو یہ سنوئی تفصیح اشقی فی احوال نقی بھی ان کے خلاف کہی گئی تھی جس کے دقلمی نسخے میرے کتب خانے میں موجود ہیں۔

منشی ولایت علی ولایت معروف بہ شاہ عزیز اللہ عزیزی صفی پوری سنا اگر دمزا غالب، جن کے بزرگ کئی پشتوں سے شاہی دارالانشا میں میرنشی رہتے تھے اور وہ خود ایک خانقاہ کے سجادہ نشین ہو گئے تھے۔ وہ اپنی کتاب سوانح اسلاف میں علی نقی خاں کے خلاف اپنی بیزاری کا اظہار یوں کرتے ہیں :

”ذریعہ تدبیر کلکے تیک ساتھ تھا۔ دہاں بھی نمک حرامی سے نہ

چو کا۔ جب جناب عالیہ بادشاہ کی ماں اور مرزا جواد علی بہادر بڑے
برنیل بادشاہ کے چھوٹے بھائی لندن کی طرف روانہ ہوئے اور سرکار انگریزی

۱۔ طلسم، لکھنؤ مورخہ ۲۲، ذی قعدہ ۱۲۷۲ھ مطابق ۲۵ جولائی ۱۸۵۶ء۔

۲۔ تان او دھ ص ۱۶۲ ۳۔ بادشاہ کے چھوٹے بھائی جنرل صاحب کا خطاب مرزا سکندر ختم تھا۔

نے ارادہ کیا کہ ملک پھیر دیا جائے، نواب کو رنگ، دشمن خلق اللہ نے
 بادشاہ کو دھوکا دے کر راضی نامے پر تھر کوادی اور بادشاہ بھی اس
 وقت کچھ نہ سمجھے اور اس کے کہنے میں آگے۔ اور جناب والد ماجد فرماتے
 تھے کہ نواب سعادت علی خاں نے اس وزیر کو رنگ کے باپ یا دادا
 کے حق میں کہا تھا کہ میرے خاندان میں جو اس کو یا اس کی اولاد کو معتمد
 بنائے گا، رنگ اٹھائے گا۔ وہی بات پیش آئی یہ

انگریز و امجد علی شاہ کی معزولی کو اس رنگ میں پیش کرتے ہیں کہ انھوں نے اودھ
 والوں کو ایک بڑی مصیبت سے نجات دے دی۔ لیکن اگر اودھ کی رعایا حقیقت میں
 بادشاہ سے ناراض ہوتی تو ان کی روانگی کے وقت بھی وہی سب کچھ کیا جاتا جو وزیر کے
 لیے کیا گیا۔

۱۔ منشی یحییٰ علی خاں جو محمد علی شاہ اور امجد علی شاہ کے عہد میں داروغہ اخبار رشتی رہ چکے
 تھے۔ و امجد علی شاہ نے ان کی ذاتی تجاویز سے مقرر کر دی تھی۔ ۲۔ سوانح اسلاف ص ۲۹۔

کہ انگریزوں کی مزاحمت نہ کی جائے بلکہ انتظام مملکت میں ان کو مدد دی جائے۔ لیکن اودھ والے اپنے ملک پر انگریز فاصیوں کا قبضہ خاموشی سے برداشت نہ کر سکے۔ شاہان اودھ نے بالعموم اور واجد علی شاہ نے بالخصوص اپنی رعایا میں قومی یک جہتی کا ایسا جذبہ پیدا کر دیا تھا کہ ہندو مسلمان دوش بہ دوش انگریزوں کے خلاف کھڑے ہو گئے۔ اور اس پامردی سے لڑے کہ لکھنؤ انگریزوں سے بالکل خالی ہو گیا۔ اسی زمانے میں دہلی اور دواخوار میں یہ خبر شائع ہوئی کہ ”عنایت الہی سے وہاں (لکھنؤ) کے تمام گورے اور افسر اہل قلم اعلیٰ سے ادنیٰ تک سب فی النار پہنچائے گئے ہیں“

اب موقع تھا کہ زمیندار زیادہ سے زیادہ آراضی پر قبضہ کر لیتے بلکہ پورے ملک اودھ کو آپس میں بانٹ لیتے۔ مگر انھوں نے ایسی کوئی کوشش نہیں کی بلکہ متحد ہو کر ۱۲ رذی الحجہ ۱۲۴۳ھ (۵ جولائی، ۱۸۵۷ء) کو معزول بادشاہ کے ایک نابالغ لڑکے برجیس قدر کو تخت پر بٹھایا اور ایک مجلس نیابت قائم کر دی جو برجیس قدر کے نام سے امور سلطنت انجام دیتی تھی۔ برجیس قدر کی شاہی مہر پر یہ الفاظ کندہ کیے گئے ”برجیس قدر محمد رمضان علی سکندر جاہ اقبال شاہ خلد اللہ ملکہ“ یہ اودھ کی رعایا انگریزوں کو ملک سے نکالنے کے بعد واجد علی شاہ کی سلطنت کو واپس لانا چاہتی تھی۔ ان کی عدم موجودگی میں ان کے بیٹے کو اپنا بادشاہ بنا لیا۔

یہ صورت حال کوئی نو مہینے تک رہی۔ جب انگریزی فوج نے حملہ کر کے لکھنؤ پر دباؤ قبضہ کر لیا تو برجیس قدر کا پائے تخت بوڑھی ضلع بہرائچ میں منتقل کر دیا گیا۔ کوئی دس مہینے کے بعد ۱۸۵۸ء میں انگریزی فوج بہرائچ میں داخل ہوئی۔ بہت کشت و خون ہوا اور انگریز فتح یاب ہوئے۔ اب برجیس قدر بہ حفاظت نیپال پہنچائے گئے۔ اس طرح معلوم ہوتا

لہ دہلی اور دواخوار نمبر ۳۱ جلد ۱۹ مورخہ ۲ اگست ۱۸۵۷ء - نیشنل آرکائیوز، دہلی۔
لہ فیصل التواریخ جلد دوم ۲۲۵ سے آفتاب اودھ قلمی

ہے کہ اودھ کی بادشاہی واجد علی شاہ کی معزولی کے ساتھ ۱۷۵۶ء کی ابتدا میں نہیں
 اس کے دو سال بعد ۱۷۵۸ء کے آخر میں ختم ہوئی۔
 اودھ والوں کی نظر میں برصغیر کی بادشاہی واجد علی شاہ کی سلطنت کا
 سلسلہ تھا، جس کو انھوں نے اپنے امکان کی آخری حد تک قائم رکھا۔ ایک معزول اور
 غریب الوطن بادشاہ کے ساتھ رعایا کی ایسی وفاداری کی نظیر تاریخ میں ملنا مشکل ہے۔
 واجد علی شاہ کی ہر دل عزیزی کا اس سے زیادہ مضبوط اور ناقابل انکار ثبوت اور
 کیا ہو گا۔

بادشاہ کے کلکے چلے جانے کے بعد باغی انگریزی فوج نے غدر کر دیا۔ اودھ کے
 زمینداروں نے باغیوں سے مل کر انگریزوں سے جنگ کی اور ان پر بڑے مظالم کیے۔

سرکار کپنی سے جو کہیں برخلافیاں

اشوس کیسے ہو گئے دانائے لکھنؤ

اب لٹ گیا ہے گیارہاؤنچ سے بڑھ کے ہے

رشتہ بہشت کہتے تھے سب جاے لکھنؤ

اگر بادشاہ کی مرضی کے خلاف یہ صورت حال پیش نہ آئی ہوتی تو نہ لکھنؤ کے معزز
 شہریوں کو پھانسی دی جاتی، نہ شہر کی شاندار عمارتیں خاک میں ملائی جاتیں، نہ کروڑوں
 روپے کے جواہرات اور دوسرے نوادرات ہوتے۔ بہر کیف شہر کی تباہی اور اہل شہر
 کی مصیبتوں کی ذمہ داری بادشاہ پر بالکل عائد نہیں ہوتی۔

بادشاہ مٹیابرج میں

داجد علی شاہ کلکتے پہنچ کر اس کے نواح میں مٹیابرج میں مقیم ہو گئے۔ اس وقت کلکتے کی حالت بادشاہ کے بیان کے مطابق یہ تھی :

آکے داخل ہوئے جو کلکتے	کاٹے کھاتے ہیں بارغ کے پتے
رات دن مرنے کا زور برق کا شور	رعد کا جھگٹا، ہوا کا زور
آدمی ہیں یہاں کے بے ایمان	کچھ سوا کفر کے نہیں ہے نشان
لے کے دم بھرتیں ہیں منکر جاتے	ساتھ گھر پہ ہیں آتے
ہیں غا باز فیلسوف یہاں	حد کے دیکھے ہیں بیوقوف یہاں
عورتیں بے حیا، زنانے مرد	سر بھی جائے نہ ہو کسی کو درد
گوشت گھی، تیل، پانی سب بدتر	ایک کی ایک کو نہیں ہے خبر
ہے یہ ٹھکڑا زمین دوزخ کا	ہوئی جس پر بنائے کلکتا
کیا کہوں کام کی نہیں کوئی شے	ستے پتھر ہیں آٹا منگاہے
دام بردوش پھرتے ہیں صیاد	پھانسنے کی ہیں ان کو چالیں یاد

ایسی ایذا اٹھائی ہے اس جا

جان اب لب پہ آئی ہے اس جا

بادشاہ کے ساتھ پانچ سو آدمی کھنڈے اگر مٹیابرج میں مقیم ہوئے۔ وہ خود فرماتے ہیں :

اسا جی ہم راہیاں کر رقم	جو لائے ہیں کلکتے میں ساتھ ہم
زن و مرد، اہل قلم، اہل فوج	کہ ہوا ایک چشمے کی جن طرح موج

کسی طرح تھے پانچ سو سے زکم ملازم، رفیق، اور محل ذی حشم بادشاہ کے کلکتے جانے کے بعد لکھنؤ سے ہما جوڑوں کے قافلے اپنے محبوب بادشاہ کے نقل عاظت میں زندگی گزارنے کے لیے روانہ ہونے لگے۔ یہاں تک کہ مٹیابرج کی آبادی چالیس ہزار تک پہنچ گئی اور مٹیابرج ایک دوسرا لکھنؤ بن گیا۔ شہر لکھنؤ کا بیان ہے: ”ان دنوں لکھنؤ لکھنؤ نہیں رہا تھا، مٹیابرج لکھنؤ تھا۔ یہی چل رہی تھی، یہی زبان تھی، یہی شاعری تھی، یہی صحبتیں اور بذلہ سنجیاں تھیں، یہیں کے علما اتقیا تھے، یہیں کے امرا اؤساتھے اور یہیں کے عوام تھے۔ مٹیابرج کے دوکان دار اور ہماجن تک لکھنؤ کے تھے اور لکھنؤ کی کوئی چیز نہ تھی جو مکمل ترین صورت میں وہاں موجود نہ ہو۔“

مولوی عبدالرزاق مصنف البرامکہ لکھتے ہیں:

”مٹیابرج کے اندر چھوٹے پیمانے پر گویا تمام لکھنؤ آباد تھا۔ کون سا محکمہ اور صیغہ تھا جو مٹیابرج کے اندر نہ تھا۔ جملہ آبادی چالیس ہزار تھی... تقریبی سامان کے علاوہ علماء، شعراء اور مستند اور متعدد ادیب بھی موجود تھے... ہر دوکان دار لکھنؤ کا تھا۔ لہذا جس بازار میں گزر ہوتا تھا یہی معلوم ہوتا تھا کہ ہم لکھنؤ کے کسی بازار کی سیر کر رہے ہیں۔“

شرق لکھنؤی کہتے ہیں:

شہانہ ہیں آراستہ سب مکاں یہ جنگلہ یہاں تھا ہوا بوستاں
ترقی ہے رونق پہ دربار ہے نہ غنچہ جہاں تھا وہ گلزار ہے
نجم الغنی رام پوری کا بیان:

۱۔ حزن اختصار ۶۳-۶۴ ۲۔ گزشتہ لکھنؤ ۳۔ یادایامہ ص ۲۲۹ ۴۔

مثنوی افسانہ لکھنؤ قلمی ص ۲۷۸

”اس غریب الوطنی میں بھی میں ہزار قدیم متوسلین حضرت کے ہم رکاب رہے اور کبے ساتھ حتی الوسع وہی سلوک وہی برتاؤ قائم رہا جو زمانہ سلطنت میں برتا جاتا تھا جس نے مٹییا برج کی اس زمانے میں سیر کی ہے وہ کہہ سکتا ہے کہ اس مٹی بڑی ہوئی حالت میں بھی اسے باغ و ارم بنا کر رکھا تھا۔ محلات و ایوان دل کشا کی وہی شان سامان و اسباب آرائش کی وہی افراط جو ہر شخص کے دہم دگمان میں بھی نہ آئے۔ غرض وہ کون سی شوکت و شان تھی جو وہاں نمایاں نہ تھی پلے

بادشاہ کی علم دوستی اور ہنر پروری کی بدولت مٹییا برج علوم و فنون کا مرکز بن گیا تھا۔ ۲۳ جنوری ۱۸۸۷ء کو مدرسہ قیصریہ کے قیام کے موقع پر منصرم الدولہ نے اپنی تقریر میں مٹییا برج کی کیفیت یوں بیان کی :

”خدا کا شکر ہے کہ ایسی چھوٹی سی چھاؤنی میں کہ جو شہر ہے نہ قصبہ نہ قریہ، اس وقت بھی ایسے ایسے باکمال لوگ موجود ہیں جو ہماری قوم کے لیے باعث افتخار ہو سکتے ہیں۔ مہتمی، مجتہد، واعظ، ادیب، مدرس، منشی، نثار، معاملہ نویس، شاعر، خوش نویس، مصوّر، ہندسہ دان، موترخ وغیرہ ایسے ایسے کامل ہیں جن کی ذات مغنمات سے ہے پلے

یہ سب کچھ تھا مگر پردیس پردیس ہی رہا، وطن نہ بن سکا۔ بادشاہ کی وطنی اور پردیسی زندگی میں آسمان و زمین کا فرق تھا، جیسا کہ ذیل کے بیان سے ظاہر ہوگا :

”داجد علی شاہ لکھنؤ میں حاکم دوران تھے، سکندر صولت اور دارا حشمت تھے، نیکو ان بارگاہ اور خسرو مرتبت تھے، والا جاہ اور کج کلاہ تھے، شاہ زمین اور ہمنشاہ دوران تھے۔ ان کے ایک اشارہ چشم پر

دوسروں کی قسمیں بنتی اور بگڑتی تھیں۔ جسے نگاہِ لطف سے دیکھ لیا وہ شاد اور نہال ہو گیا، جس پر نگاہِ عتاب پر لگی خسر الدنیا کا نمونہ بن گیا۔ شاعروں کی تنائے تھی کہ بادشاہ ذی جاہ کے دامنِ دولت سے وابستہ ہو جائیں۔ عالم اس فکر میں تھے کہ بادشاہ سلامت کے معتمد بن جائیں۔ فن کاروں کی معراج یہ تھی کہ دربارِ شاہی میں پہنچ جائیں۔ دور دراز مقامات کے تاجر مال تجارت سے لدے پھندے لکھنؤ پہنچتے تھے کہ بادشاہ عالمِ عالمیاں کے قصرِ نکاح میں کسی طرح رذنِ باریابی حاصل کر لیں اور مالِ مال ہو کر واپس جائیں۔ سپاہیوں اور افسروں، ذریعوں اور امیروں، ہماجینوں اور ساہوکاروں، دولت مندوں اور سرمایہ داروں کا یہ عالم تھا کہ لڑکھڑاتے ہوئے، لڑتے ہوئے، کانپتے ہوئے باادب یا ملاحظہ پوشیاء کی آوازوں کے شور میں ظلِ اللہ کے سامنے حاضر ہوتے تھے اور اپنی زندگی کی سعادت یہ سمجھتے تھے کہ ان کے ایک اشارہ چشم پر اپنی جان قربان کر دیں۔ لیکن واجد علی شاہ اور ان کا دور حکومت خوش درخشید و لے دولت مستعجل بود، ثابت ہوا۔ دس سال کی مدت میں سارا جاہ و جلال نصہ مہنی بن گیا۔ انگریزوں نے حکومت چھین لی، بادشاہ سلامت ایک معزز شہری بن گئے۔

ملکہ کشور کا سفر انگلستان

بادشاہ اپنا معاملہ برطانوی پارلیمنٹ میں پیش کرنے کے لیے لندن جانا چاہتے تھے۔ لیکن دو مہینے مسلسل شدید گرمی کے موسم میں سفر کرتے کرتے اور راستے میں طرح طرح کی جسمانی اور روحانی تکلیفیں اٹھاتے اٹھاتے کلکتے پہنچ کر بہت بیمار ہو گئے اور لندن کا ارادہ ترک کرنا پڑا۔ انھوں نے مولوی مسیح الدین خاں کو کوردی کو اپنا سفیر اور میجر بلوگوان کا نائب مقرر کر کے اپنی والدہ محترمہ جناب عالیہ ملکہ کشور صاحبہ اور اپنے بھائی جرنیل صاحب مرزا اسکر خشت اور ولی عہد کیواں قدر مرزا محمد حامد علی کو ان کے ساتھ لندن بھیجا۔ یہ قافلہ ۱۸ جون ۱۸۵۶ء (۱۳ رثوال ۱۲۴۲ھ) کو روانہ ہوا۔ ملکہ کشور کے ہمراہی مردوں اور عورتوں کی تعداد ایک سو چالیس تھی یہ اس سفر اور لندن کے قیام میں لاکھوں روپیہ صرف ہوا۔ صرف جہاز کا کرایہ کلکتے سے لندن تک ستر ہزار روپے دیا گیا یہ راستے میں یہ افتاد پڑی کہ ملکہ کشور ملکہ انگلستان کو پیش کرنے کے لیے جواہرات جس صندوقچے میں لیے جا رہی تھیں وہ غائب ہو گیا یا غائب کر دیا گیا اور کہا گیا کہ وہ سمندر میں گر گیا۔ ان جواہرات کی مالیت تخمیناً ایک کروڑ روپیہ تھی یہ اس نقصان کے علاوہ ہی قافلے کے سفر لندن میں بادشاہ کو تقریباً دو کروڑ کی زیر باری ہوئی یہ

آؤدھ بلوہات میں بدانتظامی کے جو الزامات بادشاہ پر لگائے گئے تھے بادشاہ

لے آر۔ ڈبلو بٹز آؤدھ کا اسٹنٹ ریڈیٹنٹ وہ چکا تھا۔ اس نے آؤدھ بلوہات کی روداد جواہرات آؤدھ بلوہات کی تائید میں ایک کتابت کی جس کے انگریزی نام کا اردو ترجمہ کچھ یوں ہوگا۔ ایٹ انڈیا کمپنی کے ہاتھوں آؤدھ کی لوٹ یا ڈکیتی کی انتہا؛

۱۰ سفیر آؤدھ ص ۹۲ ۱۱ وزیر نامہ ص ۲۲۶ ۱۲ وزیر نامہ ص ۲۲۷ ۱۳ تاریخ آؤدھ حصہ پنجم ص ۲۸۹

نے ان کے نہایت مدلل جواب ایک کتاب کی صورت میں چھپوا کر اس کے بہت سے نسخے
دلی عہد کے ساتھ کیے کہ ملکہ انگلستان، ممبران پارلیمنٹ اور دوسرے فرمی اثر لوگوں
کے سامنے پیش کیے جائیں۔ لندن پہنچ کر مولوی سیح الدین نے ایک کتاب فرماں روائان
اودھ کی حمایت اور ان کے حسن انتظام کے بیان میں شایع کی۔ ان دونوں کتابوں کا غیر جانبدار
منصف مزاج لوگوں پر جو اثر ہوا وہ بادشاہ کے نام Dr. v. Haflmann کے
خط مورخہ ۲۴ ستمبر ۱۸۶۴ء کے اقتباس ذیل سے ظاہر ہے :

”میں نے آپ کی اور آپ کے سفیر کی کتابیں پڑھی ہیں۔ اور ان
کو پڑھ کر میں آپ کا اور آپ کے خاندان کا اس درجہ مخلص دوست اور
ہم درد ہو گیا ہوں کہ آپ کے سفیر کی کتاب کا جو من زبان میں ترجمہ کر کے شایع
کر دیا ہے اور اب آپ کی کتاب کا ترجمہ کر رہا ہوں۔“

ملکہ انگلستان نے ملکہ انگلستان سے اور سفیر اودھ نے ممبران پارلیمنٹ وغیرہ سے مل کر اودھ کا
مقدمہ ان کو سمجھایا اور جلسوں میں تقریریں کر کے عوام کو باخبر کیا۔ ان سب چیزوں سے متاثر
ہو کر لندن کے عوام و خواص میں بادشاہ سے ہمدردی اور سلطنت کی واپسی کی امید پیدا ہو گئی۔
لیکن ابھی یہ لوگ لندن ہی میں تھے کہ لکھنؤ میں غدر ہو گیا اور انگریزوں پر مظالم اور ان کے
قتل عام کی خبریں دہاں پہنچیں اور بنا بنایا کھیل بگڑ گیا۔ عام ہمدردی کی فضا شدید
مخالفت میں تبدیل ہو گئی اور اس قافلے کو بے نیل مرام واپس ہونا پڑا۔ واپسی کا سفر
بہت ناسازگار ہوا۔ پیرس پہنچ کر ۲۱ فروری ۱۸۵۷ء (۲۶ جمادی الثانی ۱۲۷۳ھ)
کو ملکہ انگلستان نے اور ۸ مارچ ۱۸۵۷ء (۱۱ رجب ۱۲۷۳ھ) کو مرزا سکندر حسنت نے

ode: its princes and its Government
vindicated of British Aggression in
oudh by safi Ahmed . 157

انتقال کیا۔ اور ولی عہد کو لندن واپس جانا پڑا۔ عالم غربت میں ماں اور بھائی کی
پے درپے موتیں بادشاہ کے لیے بڑے الم ناک حادثے تھے۔

بادشاہ قید فرنگ میں

کلکتے پہنچنے کے سال بھر بعد بادشاہ کو شفا ہوئی۔ ۱۲ جون ۱۸۵۷ء کو غسلِ صحت
ہوا اور رات کو جشنِ صحت منایا گیا۔ ۱۵ جون کی صبح کو بادشاہ ابھی نمازِ صبح سے فارغ بھی
نہ ہوئے تھے کہ ایک ناگہانی آفت پیش آگئی یعنی دریا کی طرف سے جنگی جہازوں نے اور
خشکی کی طرف سے انگریزی فوجوں نے مٹیہا برج کو گھیر لیا۔ شاہی کوٹھی کے بڑے پھاٹک پر
بارہ توپیں، دو پھاٹکوں پر چار چار توپیں اور ہر جنگی جہاز پر توپیں لگا کر ہر توپ پر ہتھاب دشن
کردی گئی۔ اس کے بعد بادشاہ کو گورنر جنرل کا یہ پیغام پہنچایا گیا کہ مبادا لکھنؤ کے باغی آپ کو
غدر میں ملوث کرنے کی کوشش کریں، اس لیے بہتر یہ ہے کہ آپ کچھ دن کلکتے کے قلعے
فورٹ ولیم میں حفاظت اور آرام کے ساتھ قیام فرمائیں۔ بادشاہ نے اپنی صفائی میں جو
کچھ کہا اس پر کچھ دھیان نہیں دیا گیا اور وہ چند رفیقوں کے ساتھ قلعے میں پہنچا دیے گئے۔ یہ
اس نظر بندی یا قید کی مدت تقریباً پچیس مہینے تک پہنچ گئی۔ اس مدت میں جو حالات
پیش آتے رہے ان کو بادشاہ ایک مثنوی کی صورت میں قلم بند کرتے رہے۔ قید کے زمانے
میں بادشاہ کو اتنی تکلیف پہنچی کہ وہ اس کو کبھی بھول نہ سکے۔ اپنی تحریروں میں اس کا
ذکر بار بار کرتے ہیں مثلاً

اب مجھ پر کبھی گمیاں نہ ہوا تھا سو ہوا

گھر کبھی خاؤ زنداں نہ ہوا تھا سو ہوا

لہ قیص التوایح جلد دوم ص ۲۰۴-۲۰۵ یہ مثنوی حزنِ اختق کے نام سے ۱۲۷۶ھ
میں شایع ہوئی۔

دیکھیے بند رہے اب درِ زنداں تا چند
دل رہے خانہ زنجیر میں نالاں تا چند

میں بھی گر شیطاں کے اغوا سے ہوا قیدی نوکیلا
جس طرح سے جھوٹی تمہت میں کیا مجھ کو پھیر
زن و خویش و فرزند و دولت سے چھوٹے
ہجر یا دغم فرزند و زن و مال و منال
غیر کے بہکانے سے جنت میں آدم پھنس گیا
بے گنہ سلطان کوئی اس طرح سے کم پھنس گیا
نہ دیکھے کوئی جو کہ ہم دیکھتے ہیں
چند داغ اند کہ در پردہ ہنساں آمدہ اند
قید کے عالم میں ہی جذبات ایک فریاد بن کر بادشاہ کے قلم سے یوں نکلے ہیں۔
پھنس گئی جان حسیں و ادیلا
چھن گیا تاج و نگین و ادیلا
چتر ہے ہر فلک سر پہ مرے
تخت ہے میرا زمیں و ادیلا
کھد گئے میرے مکاں صد حسرت
قصر غم میں ہوں مکیں و ادیلا
عیش و دل دور ہوئے ہم سے اب
دل ہوا رنج شیش و ادیلا
چھوٹے اب قید سے دل رنج مٹے

اب رہائی ہو کہیں و ادیلا

یہ سب تکلیفیں اٹھائیں دکھ سے مگر دس پشتوں کی فرماں روائی سے جو مزاج بن گیا
تھا وہ نہ بدلا۔ سچ کہا ہے بادشاہ نے

قید ہونے سے کہیں بڑے ریاست جائے گی

لاکھ گردش آسماں کو ہو زمیں ہوتا نہیں

فورٹ ولیم میں بادشاہ نے اپنا بیشتر وقت لکھنے پڑھنے میں صرف کیا۔ اپنی دور افتادہ
بیگموں کو خطوط لکھے، اپنے اور ان کے خطوں کے دس بارہ مجموعے مرتب کیے، اپنی نظموں
اور غزلوں کے دو تین نہایت ضخیم مجموعے ترتیب دیے، حزن اخترا ورج مختلف دو
مثنویاں لکھیں، شکر کی ایک چھوٹی سی کتاب نصابِ نصابِ اخترا تصنیف کی۔ جب لکھنؤ میں

غدر کا ہنگامہ فرد ہو گیا اور اودھ پر انگریزوں کا بھاری تسلط ہو گیا تو ۹ جولائی ۱۸۵۹ء (۱۲ ذیحجہ ۱۲۵۷ھ) کو بادشاہ قید فرنگ سے رہا ہو کر مٹیا برج میں مقیم ہو گئے اور آخر عمر تک میں مقیم رہے۔

بادشاہ کے حفظ مراتب کے لیے قانون

۱۸۶۲ء میں بادشاہ کے ایک کورٹمک ملازم نے کچھ تاجروں سے سازش کے لیے اور فرضی حساب مرتب کر کے بادشاہ پر بیالیس لاکھ روپے کے قرض کا دعویٰ کر دیا اور ان تاجروں کو بھی نالش پر آمادہ کیا۔ گورنر جنرل نے تحقیقات کر دئی اور دعویٰ جھوٹا ثابت ہوا۔ اس واقعے کے بعد شاہ اودھ کی ذاتی منزلت کی نگہداشت کے لیے ایک ایکٹ (قانون نافذ کیا، جس کی مدد سے بادشاہ دیوانی، مال اور فوج داری کی عدالتوں کے اختیارات سے مستثنیٰ کر دیے گئے۔ اب ان جرموں کے سوا جن کی سزا موت تھی بادشاہ پر اور کسی طرح کا مقدمہ کسی عدالت میں دائر نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اس ایکٹ کا اودھ ترجمہ اودھ اخبار لکھنؤ مورخہ ۱۷ مئی ۱۸۶۲ء میں شائع ہوا تھا اور کتاب کے ضمیمہ ۱۰ میں پیش کیا جا رہا ہے۔ اوپر کے بیان میں بادشاہ کے کورٹمک ملازم کا اشارہ منشی صفدر کی طرف ہے جس کو بادشاہ نے خاک سے پاک کیا اور اس کی ریائی باتوں میں اگر اس کی شان بہت بڑھا دی جیسا کہ اس کے اس خطاب سے ظاہر ہے، مدارالمہام لسان السلطان فاشعار محمود الدولہ حمید الملک منشی محمد صفدر علی خاں بہادر بادشاہ کے لیے ہر طرح کے سامان کی لاکھوں روپے کی خریداری اسی کے ہاتھ میں تھی۔ مذکورہ بالا ایکٹ کی اشاعت سے چند روز پہلے اودھ اخبار میں یہ خبر شائع ہوئی ”منشی صفدر بھی اب محاسبہ سلطانی میں تشریف لاتے ہیں۔ میں لاکھ اپنا حضرت پر فضل نکالا ہے اور کہہ رہا ہوں نوش جان کیا اس کا پتا نہیں۔ غالب ہے کہ بسیار خوری منہ کو کھلیسوا مے لے“

لے اودھ اخبار مورخہ ۳۰ اپریل ۱۸۶۲ء

ایکٹ کی اشاعت کے چند روز بعد اسی اخبار میں ایک طویل مضمون شائع کیا گیا۔ اس میں لکھا گیا کہ منشی صفدر نے بادشاہ کے ذمے اپنا بیس لاکھ روپیہ خزانہ کمالا ہے سوال یہ ہے کہ حضرت اتنے مالدار کیونکر ہو گئے۔ ”منشی صاحب بے نشان لامکان تھے صرف تین روپے کے نواب منور الدلہ کے نوکر رہے۔ ان کی جہت سے دربار شاہ تک راہ پائی۔ وہ تو بیکنینی و دودگو شش آئے تھے۔ اب لاکھوں کے آدمی کہاں سے ہو گئے۔۔۔ چند کوٹھی اور نوٹ شاہی اپنے نام سے لے لیے اور عدالت میں آپ کو سوداگر لکھاتے ہیں۔۔۔ منشی صاحب یا ان کے بزرگ کس چیز کے سوداگر تھے“

اسی اخبار میں حکومت انگریزی کا شکریہ ادا کیا گیا ہے کہ مسٹر سیل بیڈن ممبر کونسل کا مجوزہ سرکلہ درباب حفظ مراتب شاہ مظلوم اودھ پیشگاہ گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل سے منظور ہو گیا اور حکومت سے درخواست کی گئی ہے کہ:

الف بادشاہ کے بدخواہ، شکم پرور، مطلب آشا، عیار، مکار ملازمین کی غدا و قریب سے بادشاہ کو نجات دلوائی جائے، جو کلکے کے سوداگروں سے بادشاہ کے لیے اصل قیمت سے چو گنی بلکہ س گنی قیمت پر اپنا حصہ طے کر کے چیزیں بیٹے ہیں اور ہا جنوں سے بادشاہ کے نام سے روپیہ قرض لیتے ہیں اور اصل رقم سے کئی گنی رقم کا رقبہ اور تہ تک لکھ دیتے ہیں، جنہوں نے کوٹھیاں بادشاہ کے روپے سے مول لے کر اپنے نام لکھوائی ہیں اور بادشاہ کے نوٹوں کا سودا اپنے نام کر دیا ہے اور اس طرح خود لاکھوں کے آدمی بن گئے ہیں اور بادشاہ کو لاکھوں روپے کا قرض دار کر کے ان پر نالش کر داکے ڈگریاں کروادی ہیں۔ بادشاہ اپنے لاکھ روپے ماہوار وظیفے میں سے کچھ سپر مار ماہانہ قرض ادا کرتے ہیں مگر خائن اہل کار اس رقم کو بھی قرض خواہوں تک نہیں پہنچنے دیتے۔

ب۔ حکومت انگریزی چند انگریز حاکموں اور انگریز سوداگروں اور ایک دوشاہی معتمدوں کی ایک کمیٹی بنادے جو ایجنٹ صاحب کی شرکت میں بادشاہ پر جس جس طرح کا قرضہ ہے اور ان پر جو ڈگریاں بڑھ چکی ہیں اور جن قرضوں کی قسط بندی بڑھ چکی ہے سب کی تشخیص کرے۔ اور جو رقمیں حقیقتاً واجب الادا نکلیں ان کے علاوہ کل فاضل رقموں کو حساب سے خارج کر دے۔

ج۔ لاکھوں روپے کا سامان مال خانے اور توشہ خانے کا اور نقد و جنس وغیرہ جن اہل کاروں سے متعلق ہے ان سے ان سب چیزوں کا حساب سمجھا جائے۔
(۵) بادشاہ کے ملازموں میں کئی بد وضع، بد معاملہ، ادا باش اور شک حرام ہیں اور وہی بادشاہ کی بربادی اور بدنامی کا باعث ہیں۔ اس طرح کے لوگ نکال دیے جائیں۔ ملازمین بادشاہ میں صرف ایک شخص ہے جو مجوزہ کمیٹی میں شرکت کے قابل ہے یعنی دیانت الدولہ جو واقعی اسم باسے، یک رنگ اور ایمان دار ہے۔ اور کوئی نہیں۔

منشی صفدر کا ۱۲۸۳ھ (۹) میں انتقال ہوا۔ منشی سید محمد شفیع رضوی نے بادشاہ کی فرمائش پر ایک کتاب اشراق اختصری لکھی۔ اس میں یہ فقرہ لکھا ہے ”بعد آنجہانی گم دیدن ایاز بے وفا محمود الدولہ“ اس میں محمود الدولہ یعنی منشی صفدر کو ”ایاز بے وفا“ اور ان کے انتقال کرنے کو ”آنجہانی گم دیدن“ کہا ہے۔ ان دونوں باتوں سے مصنف کتاب کی اور بالواسطہ بادشاہ کی انتہائی ناراضی کا اظہار ہوتا ہے۔
مٹیا بروج میں شاہی مدرسے

مٹیا بروج میں شاہزادوں اور شاہی خاندان کے لڑکوں کی تعلیم کے لیے بادشاہ نے ایک مدرسہ قائم کر دیا تھا، جس میں مولوی علی حیدر نظم طباطبائی بھی ایک مدرس

تھے۔ انگریزوں کی تحریک سے ایک دوسرا مدرسہ دکنگ آف اودھس اسکول کے نام سے انگریزی تعلیم کے لیے انگریز اساتذہ کی سرکردگی میں قائم ہوا اور بادشاہ اس کے کھیل بنائے گئے۔ لیکن اس اسکول اور انگریزی طرز کی تعلیم سے بادشاہ خوش تھے اور نہ ان کے دوسرے ہم وطن۔

۲۳ جنوری ۱۸۸۷ء کو انجن رفاہ ہند کلکتہ نے مٹیا برج میں ایک مدرسہ انگریزی عربی، فارسی، بنگلہ، اردو کی تعلیم کے لیے بادشاہ کی سرپرستی میں مدرسہ قصیرہ کے نام سے قائم کیا۔ "انجن کے پہلے جلسہ میں اس قدر ڈنیشن آگیا کہ تمام سامان مدرسہ بہت عمدہ طریقے سے تیار کر آیا گیا اور ایک بہت عمدہ وسیع کوٹھی اس کے واسطے لی گئی۔ یہ مدرسہ بہ اعتبار ساز و سامان کے شاہانہ اولوالعزمیوں کے ساتھ قائم کیا گیا تھا اور ہر درجے میں عام طلباء کے لیے بہت عمدہ تکیہ دار قیمتی بچیں اور ڈسک اور نفیس فرش کرچی بچھایا گیا اور ہر درجے میں عمدہ پنکھے اور جس کی ٹٹیاں میسمر گرما میں لگائی گئیں۔

جس جلسے میں مدرسہ قصیرہ کی بنیاد رکھی گئی اس میں منصرم الدولہ بہکادر نے ایک تقریر کی جس سے شاہ معزول کے بعض دوسرے امیر و خیر کا بھی علم ہو جاتا ہے اور ضمناً یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ بادشاہ کی علم دوستی اور ہنر پروری نے مٹیا برج کو مشرقی علوم و فنون کا مرکز بنادیا تھا۔ اس تقریر کے دو اقتباس اوپر مناسب مقامات پر پیش کیے جا چکے ہیں۔

۱۶ فروری ۱۸۸۷ء کو ملکہ کوٹوریہ کے دور حکومت کے پچاس سالہ جشن کے دن اس مدرسے کا افتتاح بادشاہ کی سرپرستی میں بڑی شان سے کیا گیا۔

۱۷ اخبار اسٹیمین کلکتہ۔ ۶ مئی ۱۸۸۶ء ۲ دیکھے مدرسہ قصیرہ پر میرضین۔

ہماری زبان علی گڑھ، یکم دسمبر ۱۹۶۶ء

”کثرت روشنی اور آتش بازی کے سبب سارا مٹیابرج نور و نور
سے رنگ کوہ طور تھا، جس کے شوق دید میں ہزار ہا شاہیقین اور تماشا
کھٹے سے اس نظر فریب عالم کے دیکھنے کے لیے آتے تھے۔ علاوہ اس
پر جوش سامان تہنیت کے بہت کچھ خیرات غرباد مساکین کو تقسیم کی گئی۔
چنانچہ اس مبارک تہنیت کا شکریہ جو کہ تہہ دل سے بہرہ رسانی شاہ
مرہوم مدرسہ قیصریہ کی طرف سے ظاہر کی گئی تھی از جانب گورنمنٹ کلکٹر چوہدری
پرگنہ نے بذریعہ چٹھی ادا کیا ہے

اس مدرسے کے افتتاحی دن بھی ڈھائی تین سو طالب علموں نے رجسٹر داخلہ میں نام لکھا
اور ہر روز طلبہ کی تعداد بڑھتی گئی۔

”حضرت شاہ اودھ نے یہ تمام سامان دیکھ کر بہت بڑی مسرت
ظاہر فرمائی اور وعدہ فرمایا کہ میں اس کے واسطے ایک ایسی رقم متعین ہوں
کہ وہ اس کا جو کہ ہمیشہ کے واسطے اس کی بقا کے لیے کافی ہو سکے“

افتتاح کے عہد بھر کے بعد بادشاہ بیمار ہو گئے اور مرض کی شدت بڑھتی گئی۔ یہاں
تک کہ اسی بیماری میں بادشاہ کا انتقال ہو گیا اور ان کو اپنا یہ وعدہ پورا کرنے کا موقع نہ ملا۔
مٹیابرج کا جانور خانہ

بادشاہ کے زندہ عجائبات میں عجیب عجیب قسم کے پرندے، چوندے، درندے سانپ
اور مچھلیاں کثیر تعداد میں تھیں اور ان کی نگہداشت کے لیے کئی سو جانور باز، کبوتر باز، مار باز
اور ماہی پرور وغیرہ ملازم تھے۔

نجم الغنی رام پوری لکھتے ہیں :

”بادشاہ کو ہر قسم کے جانوروں کا دلی شوق تھا۔ چنانچہ آپ کا

چڑیا خانہ ایسا نادرا اور بے مثل تھا کہ اکثر یورپ کے سیاح اسے دیکھنے آتے تھے اور آپ کے مذاق اور تلاش کو سراہتے تھے۔
مولوی شمس صاحب کا بیان ہے کہ :

”عمار کے علاوہ بادشاہ کو جانوروں کا شوق تھا۔ اور اس شوق کو بھی انھوں نے اس درجے تک پہنچا دیا کہ دنیا اس کی نظیر پیش کرنے سے عاجز ہے۔ اور شاید کوئی شخصی کو شش آج تک اس کے نصف درجے کو بھی نہ پہنچ سکی ہوگی۔۔۔۔۔ صفائی کا اس قدر اہتمام تھا کہ مجال کیا جو کہیں بیٹ یا کسی جانور کا پر نظر آجائے۔“

خواجہ زین العابدین کا بیان ہے کہ بادشاہ کے جانور خانے میں ہزار ہا چاند پرند تھے، جن کے دانے چارے کا خرچ دس ہزار روپے سالانہ تھا۔ بھلیک خاں مخاطب بہ معتبر علی خاں دانہ خوری کے ہتھم تھے۔
عیش لکھنوی کا بیان :

یوسف عہد خویش و جان جہاں	مخترع بھی طبیعت سلطان
ایسے ایسے مکان بنوائے	بلوغت کو جن پہ رشک آئے
جانور خانہ وہ کیا تیار	مثل جس کا جہاں میں ہے دشوار
لوگ آتے ہیں دید کے مشتاق	بے نظیری میں شہرہ آفاق

سو سو ایک ایک کام پر مامور
ہر بہانے سے پرورش منتظر

بادشاہ کو سانپوں سے بڑی دل چسپی تھی۔ ان کے رہنے کی جگہ یوں بنائی گئی تھی کہ ”ایک بڑا سالبا اور گہرا حوض قائم کر کے اس کے کناروں کو چاروں طرف

سے خوب چکنا کر کے اور آگے کی طرف جھکا کے اس کے بیچ میں ایک مصنوعی پہاڑ بنایا گیا تھا جس کے اندر سیکڑوں نالیاں دوڑانی گئی تھیں اور اوپر سے دو ایک جگہ کاٹ کے پانی کا چشمہ بھی بہا دیا گیا تھا۔ اس پہاڑ میں ہزاروں بڑے بڑے دو دو تین تین گز کے لمبے سانپ چھوڑ دیے گئے تھے جو برابر دوڑتے اور رینگتے پھرتے، پہاڑ کی چوٹی تک چڑھ جاتے اور پھر نیچے اتر آتے۔ ... سانپوں کے رکھنے کا انتظام اس سے پہلے شاید کہیں نہ کیا گیا ہوگا۔ اور یہ خاص و اجد علی شاہ کی ایجاد تھی، جس کو یورپ کے سیاح حیرت سے دیکھتے اور اس کی تصویریں اور مشرح کیفیت قلم بند کر لے جاتے تھے۔
آغا محمد مرزا اپنے سفر نامہ کلکتہ میں کلکتہ کے زندہ عجائب خانے کے بیان میں لکھتے ہیں :

”ایک خاص جگہ سانپوں کے لیے بنی ہے۔ اس میں طرح طرح کے سانپ پلے ہوئے ہیں۔ ان میں مٹیا بروج کے سانپ بھی ہیں۔ جن کے محافظ ایک لکھنوی سیر صاحب تھے۔ ... انھوں نے ایک سبز رنگ کا سانپ ہاتھ سے اٹھا کر ہم لوگوں کو دکھایا اور کہا کہ حضرت جاں پناہ (واجد علی شاہ) نے اپنے عجائب خانے میں ہر جانور اور سانپ وغیرہ کا ایک موزوں نام رکھا تھا۔ چنانچہ اس کو تازیانہ زمر دی کہتے ہیں۔
زمانہ سلطنت میں بھی بادشاہ کو سانپوں سے دل چسپی تھی۔ اودھ کے ریڈینٹ سلیم نے اپنے سفر نامہ اودھ میں لکھا ہے کہ بادشاہ نے دو تین سانپ پالنے والے ملازم رکھے ہیں جو انتہائی زہریلے سانپوں کو اپنی گردن اور ہاتھ پاؤں میں لپیٹ لیتے ہیں اور حیرت خیز ہوشیاری کے ساتھ ان کے حملوں سے بچتے رہتے ہیں۔ جب سانپ ان لوگوں کو کاٹ لیتا ہے تو وہ کافی بڑی جگہ پر گہرا زخم لگا کر زہر کو چوس کے پھینک دیتے ہیں۔ ان

سانپوں سے کھیلنے کے بعد وہ اُن سے جانوروں کو کھڑاتے ہیں۔ ہاتھی ان کے کاٹنے سے چند گھنٹوں میں مر گئے ہیں اور چھوٹے جانور بہت جلد۔ بادشاہ کبھی کبھی ان سانپوں کا معائنہ کرتے ہیں اور جانوروں پر اُن کے زہر کا اثر ملاحظہ فرماتے ہیں۔

بادشاہ نے جانور خانے کے جمود احمد علی کے نام ایک ہدایت نامہ ۲۹ ربیع الثانی ۱۲۹۵ھ کو لکھ کر جس میں جانور خانے کے چند شعبوں کا ضمناً نام آگیا ہے یعنی میمون خانہ، طوطا خانہ، خمس خانہ، شیر خانہ، فیل خانہ، مینڈھے خانہ، تازی خانہ، چیتا خانہ، کبوتر خانہ۔ لیکن ظاہر ہے کہ ان شعبوں کی تعداد اس سے کہیں زیادہ تھی۔

بادشاہ کی مالی پریشانیاں

ادھر اس عہد نامے یا راضی نامے کا ذکر کیا جا چکا ہے جس کا مطلب یہ تھا کہ بادشاہ لکھنؤ میں سکونت کے لیے چند محل اور گمراہی کے لیے لاکھ روپیہ ماہانہ منشن قبول کر کے ادھم کا ملک بخوشی انگریزوں کے حوالے کر دیں۔ طرح طرح پر زور ڈالا گیا اور دھمکیاں دی گئیں مگر بادشاہ سلطنت کی واپسی کے دعویدار تھے۔ ان کو انگریزوں کا وظیفہ خوار ہونا منظور نہ تھا۔ انھوں نے کسی صورت سے اس راضی نامے پر ہر نہ کی۔ انگریزی سرکار نے بادشاہ کو معزول کر کے ملک پر زبردستی قبضہ کر لیا اور منشن روک لی۔ جو تقریباً پونے چار سال تک بند رہی۔

۲۶ ستمبر ۱۸۵۹ء (۲۷ صفر ۱۲۷۶ھ) کو ولی عہد بھی بے نیل مرام انگلستان سے واپس آگئے۔ اب بادشاہ کو تخت و تاج ملنے کی کوئی امید باقی نہ رہی اور اپنی موجودہ زندگی پر قناعت کرنے کے سوا کوئی چارہ کار نہ رہا۔ انھوں نے ۱۸۵۹ء تک اپنی بقایا نیشن کے لیے درخواست دی۔ جواب میں ان کو لکھا گیا کہ آج تک شاہ اودھ نے (نیشن) قبول نہ کی، اب اس روپے کے مستحق نہیں ہیں لیکن اس وقت سے ان

سب کو ٹھیسوں کا خدا ہے محصول
 سقوں کے چھڑکنے کا ہمینا
 پانی کی کلوں پہ بھی ہے محصول
 احکام عدالت اس پہ جاری
 قزقی میں کھسی محل کا اسباب
 افسوس ہمارے پر شکستہ
 شاہین ہے زیر دام و تاج
 خدام نے میسر پائی املاک
 اس خاک پہ بھی ہے ٹیکس باندھا
 چھوڑا تھا جو لکھنؤ میں اسباب
 چونچ رہا تھا گیا وہ لندن
 دریا ہی میں پڑا وہ جواہر
 پھر اس پہ زمین کا بھی معمول
 تنخواہ پولس کی بے قرینہ
 دریاے خدا پہ بھی ہے معمول
 سمن ہیں سینے بھاری بھاری
 ہرقت تعب میں یار و احباب
 صد حیف ہے باز بال بستہ
 مال و دولت ہوئی ہے تاراج
 مجھ غم زدہ نے نہ پایا جز خاک
 سو شکر عجب ہے میرا کاندھا
 پایا وہ باغیوں نے نایاب
 نذر ملکہ کو اسے سمن تن
 حصہ ہوا بٹ گیا وہ یک سر

پہنچا ہی نہ وہاں نہ مجھ تک آیا
 کیا کیا فلک ستایا

ایک مرتبہ ۱۵۵۷ء کے بعد انگریز حاکموں نے بادشاہ کے کچھ جواہرات واپس کر دیے
 جن کی مالیت پچیس لاکھ تھی یہ ایک مرتبہ بادشاہ کو خرچ کی بہت تنگی ہوئی تو گورنر جنرل نے
 دو لاکھ روپے عنایت کیے، جس کے شکرے میں بادشاہ نے ایک طویل نظم کہی ہے۔ اس نظم کو
 دیکھ کر میر کا یہ شعر یاد آتا ہے
 جان غیور پر ہے ستم ستم کہ میر : بگڑا جھوٹ سے چاہیے ان سے بنائے

لے ملک اختر ۱۵۲ - ۱۵۷ لے آفتاب آودھ قلی ۱۵۵

”بادشاہ کو صاحبات محل کا فساد میں لٹنا معلوم ہو چکا تھا۔ وہ روپیہ لکھنے مع تحائف بھیجا اور حسب الحکم ہر ایک کو ملا یہ ایک جگہ بادشاہ نے اپنے حالات میں لکھا ہے ”۱۲۹۱ھ ہجری سے بہ اعانت گورنمنٹ میں ہزار روپوں میں دو دختریں کا عقد کر دیا۔ سنا جاتا ہے کہ اسی حساب سے بارہ دختریں سن آئندہ میں بہ اعانت گورنمنٹ منعقد ہوں گی یہ ممکن ہے کہ اسی طرح بادشاہ کو وقتی امداد ملتی رہتی ہو۔

سٹیا برج میں آتش زدگی

”۸ اپریل ۱۸۵۷ء کو شاہ اودھ کے مکانات واقع گارڈن رتج کلکتہ میں آگ لگی اور بہت سا مال و اسباب جل کر خاک سیاہ ہو گیا۔ سننے ہیں کہ جو جواہرات تھوڑا ہی عرصہ گزرا سرکار سے ان کو واپس ملے تھے وہ بھی جل کر خاک ہو گئے۔

”حضرت شاہ اودھ کے خیام دولت میں ایسی آگ لگی کہ تین چار کروڑ روپے کا مال متاع خاکستر ہوا۔ اگرچہ حضرت کو کچھ تردد نہیں، مگر بیگمات بالکل تہی دست ہو گئیں۔ شرف شاگرد آتش نے اس واقعہ کا ذکر یوں کیا ہے :

سنو آتش افزیزیوں کا بیاں	نیل سوز و جاں سوزے داستاں
برابر وہ سب بنگلے جلنے لگے	سب اپنے پرانے بنگلے لگے
سب اسباب تادیر برابر جلا	جواہر جلا ایک اک گھر جلا
ہم ہر طرف تھے دھوئیں کے پہاڑ	ہوا جاتا تھا موچی کھولا اُجاڑ
ہزاروں ہی اس کو بجھا یا کیے	وہ دل سوزی اپنی دکھایا کیے
جہازوں پہ انگریز آئے چلے	برابر لگائے بہت دم کھلے
خدا کے کرم سے وہ جب گل ہوئی	قیامت پہ موقوف بالکل ہوئی

۱۔ فیصل التواریخ جلد دوم ص ۳۷۷ سے صفحہ ۳۷۸ کوہ خود، لاہور، ۵ مئی ۱۸۶۰ء
 ۲۔ کوہ خود، لاہور، ۲۳ جون ۱۸۶۰ء بحوالہ تحریر، دہلی، شمارہ ۲ ص ۱۲۱

ہزاروں کو انعام ملنے لگا عنایت کا گلزار کھلنے لگا
خداوند نعمت کا اثر اے طرفت کرداروں رپے آپے کے صرف
بہت جلد بنوائے پختہ مکان خریدیں برابر کئی کو ٹھکیاں
ہوئیں پھر سے سر سے تیاریاں لگیں ہونے ہر سمت گل کاریاں

گلوں سے وہ میدان پھر بھر دیا
اس اُجڑی زمیں کو ارم کر دیا

بادشاہ بیتیں برس مٹیا برج میں رہے، مگر غربت یعنی پردیس کی زندگی سے
ہمیشہ نکلے رہے۔ اور اپنے کلام میں غربت سے نیراوی اور کھنڈ کا اشتیاق ظاہر کرتے رہے۔
کہتے ہیں:

ملک و مال و زن و فرزند ریاست سے چھٹا مجھے مظلوم بھی کہتے ہیں درائے غربت
مرض، سحر، وطن کی نہ ہوئی کچھ تدبیر خضر عشق بتائے گا دوائے غربت
جبے چھوٹا ہے وطن پھر سر مقصد نہ ملا پائیں گے راہ عدم میں کہیں پائے غربت
زلفِ تممت سے پھنسنے آن کے کلکتے میں ہم نے زنداں کو بھی دکھائے سوائے غربت
شہر کس کا ہے وطن کس کا مرا نام یہ ہے بندہ درگاہ اللہ گدائے غربت
یہ تمنائے رہے زلیت میں اے بارِ خدا پھر مجھے کھنڈ دنیا میں دکھائے غربت
یاد آتا ہے وطن دامنِ صحرا سے مجھے جنگلوں میں مجھے بھاتی ہے بولے غربت
ہاں وطن دیکھوں تو شاواں ہو دل زار مرا یہ بھی ممکن ہے کہ رد توں کو ہنسائے غربت
وسعتِ خلد سے بڑھ کر ہے کہیں حبِ وطن تنگی گور سے بدتر ہے فضا کے غربت
ظلمِ ظالم سے نہ بھلس کوئی بے گھر ہوئے کسی مظلوم کو یا رب نہ ستائے غربت

یوں تو شاہانِ جہاں پر ہے پڑا وقت، مگر

ختم ہے اخترِ بیکس پر جفا کے غربت

بے جرم بے گناہ چھنا میرا تخت و تاج
گلشن عجب بہار کے ہر قصر رشک خلد
مہجے بے خطا کو کیوں نہ ہڑ دھواے لکھنؤ
اور گو متی غضب کی ہے دریاے لکھنؤ
مرنے کے بعد بھی نہ مٹے گا جگر سے دلغ
جنت میں ہم کو ہونے گی پرزائے لکھنؤ
ہٹتا نہیں تصور اسباب ملک و مال
کانوں میں بج رہی ہر دہ شہنائے لکھنؤ

ہر چند لاکھ طرح بھلاتا ہوں یاد کو
اختر بیکار اٹھتا ہے دل ہائے لکھنؤ

وہ وطن یاد ہے غربت میں وہ سائے احباب
ہائے کب مجھ سے ملیں گے مرے پیارے احباب

وہ باغ کیا ہوا وہ گل کہاں کہاں بلبل
پتا چمن میں نہیں ہے سہم زبانوں کا

سر و گرد گر گئے نوائے لہو روتے ہیں
خاک اڑی باغ میں کیا کیا نہ ہوا میرے بعد

یہی تشویش شب و روز ہے بنگالے میں
غریب الوطنی کے ذمہ دار انگیز تھے
لکھنؤ پھر بھی دکھائے گا مقدّم میرا
ذیل کے شعروں میں ان کی شکایت مضمر ہے:

چمن سے پھینک دیا میرا آشاں کیا خوب
نہال مجھ کو کیا آئے باغیاں کیا خوب

زر گل بھی جو تھا وہ پھین لیا
باغیاں کہ چکے نہال مجھے

بادشاہ کی وفات

۱۳۰۲ھ کے آخر میں بادشاہ سخت بیمار ہو گئے۔ لکھنؤ کے حاذق طبیب محمد عبد العلی

اور شیخ علی محمد بلائے گئے۔ ان کے علاج سے بھی کچھ فائدہ نہ ہوا۔ ۲۰ ستمبر ۱۸۸۶ء اور

۲۰ ستمبر ۱۸۸۴ء اور ۲۰ محرم ۱۳۰۵ھ کا دن گزرا کہ رات کو ۲ بجے بادشاہ نے انتقال کیا۔ اس الم ناک واقعے سے متاثر ہو کر ”شعرانے صدہا قطعات تاریخ اپنی لیاقت کے موافق تصنیف کیے ہیں۔ ان میں پچیس قطعات سوانح شاہ اودھ کے مصنف نے اس تمہید کے ساتھ نقل کیے ہیں :

”اس موقع پر ہم صرف چند تاریخیں لکھتے ہیں جو... حیثیت شعری کے لحاظ سے بھی عمدہ ہیں۔ یہ قطعات تاریخ کے ساتھ اس کتاب میں بادشاہ کی وفات پر شیخ فدا علی عیش کشنوی کی مثنوی ’اشک سلسل‘ بھی درج کر دی گئی ہے۔ یہ بہت سے قطعات تاریخ دوسری کتابوں میں بھی ملتے ہیں : ہمارا حاجے گویاں ثاقب کے طیلائی قطعے میں یہ پانچ شعر بھی ہیں۔

سال ثنیت و ہفتم و یک ماہ ہم بست و سہ روز

از سنین عمر اشرف و انمودہ انقضا

از ستمبر بود اس تاریخ بستم آشکار
نصف شب از چار شنبہ ثالث از ماہ عزا
کرد و روح پر فتوحش عزم فردوس بریں
شد بلند از شش ہمت بس نعرہ و احسرتا
بہ سہ تاریخ مسیحی بے سر آمد در نظر
فر و شان و تاج و تخت و سک و چتر و لوا
وقت فکر سال ہجرت گشت اس ہر نقیشت
حسرت و یاس و الم و رج و عنایف و بکا
چو تھے شعر میں دو کے مصرعے کے خط کشیدہ الفاظ کو بے سر کر کے یعنی ان کا پہلا
حرف پھوڑ کے باقی حرفوں کے اعداد سے عیسوی سن ۱۸۸۴ء نکلتا ہے اور پانچویں شعر کے
دو کے مصرعے کے خط کشیدہ لفظوں کے اعداد سے ہجری سال ۱۳۰۵ء نکلتا ہے۔ اس
طرح معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ نے ہر سطر میں ایک مہینا تیس دن کی عمر میں ستمبر کی بیویں
اور محرم کی تیسری تاریخ کو چار شنبہ کی آدھی رات کو انتقال کیا۔ عیسوی سن ۱۸۸۴ء تھا
اور ہجری ۱۳۰۵ء۔

فاضل جلیل مفتی میر محمد عباس نے کئی قطعے کہے۔ ان میں سے ایک یہ ہے :
 چو داجد علی شاہ رفت از جہاں پے خلق جائے پناہے مناند
 از عزتے یافت ہر مرد و زن کنوں خلق راعزہ جاہے مناند
 چناں رفت برباد باغ اودھ کہ برگ گل دپڑ کاہے مناند
 چناں سوخت دہا از ناز غمش کہ در سینہ ہا دود آہے مناند

بتاریخ از جود سر کردہ گفت

کہ ”در شہر اسلام شاہے مناند“

آخری شعر کا پہلا مصرع بتاتا ہے کہ مادہ تاریخ کے جو عدد نکلتے ہیں یعنی ۱۳۰۲۔
 ان میں لفظ جود کے سر یعنی پہلے حرف ج کے عدد ۳ جوڑ دیے جائیں تو سال وفات ۱۳۰۵
 نکل آئے گا۔

منشی سید رضا علی کی قلمی بیاض سے ان کے قطعہ تاریخ کے صرف دو شعر نقل کیے
 جاتے ہیں :

واقعہ ہے شہ کا از بس جان گزار و دل خواش بخت دل جس سے نکل آتے ہیں اشک کے ساتھ
 سال رحلت جان عالم کا ہے منقوط و سیح ”حیف اودھ کی روشنی سب جل بسی اختر کے ساتھ“
 دو کسر شعر کا دوسرا مصرع مادہ تاریخ ہے اور پہلا مصرع بتاتا ہے کہ صرف
 نقطہ دار حروف کے عدد دیے جائیں تو عیسوی سن ۱۸۸۷ نکل آئے گا۔

سید مظفر علی ہنر ملازم سرکار شاہی مقیم ٹیپا بروج نے کئی قطعے کہے ہیں۔ ایک
 قطعے کا آخری شعر یہ ہے :

بہر تاریخش ہستہ وقتے کہ بنویم حساب
 شوکت و شان و بقا و صولت آمد بے نشان

۱۔ تجلیات باب نم ۱۱۱۱ چغتایان بلاغت ۳۱۱ جان عالم داجد علی شاہ کا عرب تھا۔
 ۲۔ اختر داجد علی شاہ کا تخلص تھا۔

دوسرے مصرعے کے خط کشیدہ لفظوں کے عدد جوڑ کر ان میں سے لفظ نشان کے عدد گھٹانے سے سال ہجری ۱۳۰۵ نکلتا ہے۔

ہنتر کے دوسرے قطعے کا آخری شعر حسب ذیل ہے :
 منکر کی تاریخ کی میں نے تو یہ دل نے کہا بے سرو پا ہو گئے اقبال و قبل بخت و تخت
 دوسرے مصرعے کے خط کشیدہ لفظوں کو بے سرو پا کر کے یعنی ان کا ہپسلا اور
 آخری حرف چھوڑ کے باقی حرفوں کے عدد ۱۳۰۵ نکلتے ہیں جو بادشاہ کے انتقال کا ہجری
 سال ہے۔

ہنتر کا ایک قطعہ آگے چل کر نٹیا برج کی تباہی کے حال میں لکھا جائے گا۔
 بادشاہ کی بھینر و تکفین

بادشاہ کے انتقال پر شیخ ذرا علی عیش لکھنوی نے کئی قطعات تاریخ کے
 علاوہ ۱۴ اشعار کی ایک مثنوی اشک و مسلسل کے نام سے کہی، جس کے اشعار ذیل
 ذیل توجہ کے قابل ہیں :

یوں تو مدت سے تھے علیل حضور	پر ہوا ان دنوں مرض کا دُور
تیسری رات تھی محسوس کی	چار شبنے کی شب شب غم تھی
ساعت موت جب قریب آئی	ہنس کے سب یہ بات فرمائی
ہے طبیعت مری فقیرانہ	کچھ نہ ہو کر تو فرستادہ
قبر پر سائے کا نہ نام رہے	میری تربت رہے تو خام رہے
نصف شب پر جو ڈوبے اس آن	ہوئے بے چین حضرت سلطان
کلمہ پڑھ کے سو گئے جلدی	جان شیریں سپرد خالق کی
درِ دولت پہ تھا جو جسمِ غفیر	لاش اٹھانے کی پھر ہوئی تدبیر
ہو گئی بے چراغ کاشانہ	لاش اٹھی باجلوس شاہانہ
لے چلے جب جنازہ اظہر	لب تالاب رشک کوثر یار

دد محل شہ کے زیر خاک ہوئے
 کہتے ہیں جب یہ حشر تھا برپا
 جب سنی انتقال شہ کی خبر
 کھینچ کر ایک نالہ جانکاہ
 پڑھتے جاتے تھے لوگ سب اس آن
 کر دیا بعد غسل زیب بدن
 آئے ہم نام حضرت عباس
 کچھ صفوں کا نہ تھا حساب شمار
 جب جنازہ لحد تک پہنچا
 بحر شاہی کا جب در کنون
 حصن دلیم سے سر ہوئیں تو ہیں
 اسی مثنوی کے اشعار ذیل سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل لکھنؤ کو بادشاہ کے انتقال کا کتنا
 صدمہ ہوا۔

فی الحقیقت یہ حال ہے جانکاہ
 شہر بارہ دگر ہوا دیراں
 چرخ سے یکسی بستی ہے
 روز روشن ہوا ہے غیرت شب
 جس قدر غم کریں بہت کم ہے
 لکھنؤ پھر ہوا خراب و تباہ
 جب سے اس شہر میں ہے انگریزی
 ہائے وہ اس آج ٹوٹ گئی
 رنج و غم سے بدل گئی شادی
 کیا غضب ہو گیا معاذ اللہ
 لکھنؤ ہو گیا ہے ہو کا مکان
 بے شہنشاہ اجاڑ بستی ہے
 لکھنؤ والے پیٹتے ہیں سب
 شاہ واجد علی کا ماتم ہے
 راست کہتا ہوں اشد بانڈ
 تھی کچھ امید بادشاہی کی
 شہر کو فوج یاس لوٹ گئی
 اب نہیں کچھ امید آبادی

عیش لکھنؤی کی مثنوی اشک مسلسل سے بادشاہ کی تجہیز و تکفین کا کچھ حال معلوم ہو چکا ہے۔ اب سوانح شاد اودھ سے کچھ مزید تفصیلات درج کی جاتی ہیں :-

”مٹیا برج میں ہنگامہ محشر بپا تھا۔ شور و فغاں سے گنبد گردوں گونج اٹھا تھا۔ پشتہ سلطان خانہ پر ہزاروں ملازمین کا ہجوم، ہر ایک گریبان و مغموں۔ تین بچے صاحب ایجنٹ بہادر اور صاحب ڈپٹی کمشنر سپرنٹنڈنٹ پولیس بھی پہنچ گئے۔ پہلے لاش دکھی، حسرت و افسوس کیا۔ پھر تمام ایوانات اور ابواب دفاتر شاہی اور مکانات اہل کاران شاہی پر حجاب پولیس کے پہرے مقرر فرمائے۔۔۔ صبح تک محلات خاص اور شاہزادگان والا تیار بھی خبر پا کر سلطان خانے پہنچے۔ صفت ماتم کبھی۔ ہنگامہ فوج و فریادوں بھر گرم رہا۔ دو پہر کو پھر صاحب ایجنٹ بہادر آئے نواب خاص محل صاحبہ منوہر شاہی اور بعض شاہزادگان نے تجہیز و تکفین اپنے اہتمام اور صرف سے لینا چاہی۔ مگر صاحب ایجنٹ نے مناسب نہ جانا اور اجازت نہ دی۔ خاص مصارف شاہی سے بذریعہ نواب نصیر الملک بہادر و عطاء الدولہ بہادر ہند و بیت کرایا۔ شام تک سب سامان درست ہو گیا اور نوبت رات کو غسل دیا گیا۔ اس وقت پھر صاحب ایجنٹ بہادر آئے اور حکم گورنمنٹ دو کمپنیاں بنگال انفنٹری کی بطور کارڈ آف آئز ہمارا ہی جنازہ کے لیے ساتھ لائے۔ دس بجے رات کو سلطان خانے سے جنازہ مبارک بڑے تزک و احتشام کے ساتھ برآمد ہوا۔ جملہ شاہزادگان اہل کاران و ملازم شاہی باچشم نمناک و گریبان چاک بلباس ماتمی ہمراہ تھے۔ قصر البیضا سے تا امام باڑہ سلطین آباد، جہاں حسب استخارہ شمس العلماء مفتی میر محمد عباس صاحب مدفن خاص قرار پایا تھا، پہلک روڈ پر وہ ہجوم تھا کہ کہیں تل رکھنے کو جگہ نہ تھی۔ دورویہ دوکانوں اور ان کی چھتوں پر

ہزار ہا زن و مرد، ہندو مسلمان، پیر و جوان، مصروف نالہ و فغاں تھے۔
 ہزار ہا ساکنین کلکتہ و حوالی کلکتہ جنازے کے ساتھ فریاد کیاں تھے۔
 آگے آگے گاڑ ڈاٹ آڑا اس کے بعد جلوس ملازمان شاہی بلیاس ماتی مع
 نوبت خاں وغیرہ رواں تھا... جب جنازہ امام باڑہ بسطین آباد کے پاس
 آیا کمپنیوں نے سلامتی لی اور ماتی باجا بجایا۔ بارہ بجے تھمیز و کھنیں سے فراغت
 پائی۔“

جب سے کلکتہ ہو گیا مسکن
 ہائے اے قسمت تباہ اودھ
 پھر نہ دیکھی ہبا رِ صبح وطن
 خاکِ کلکتہ اور شاہ اودھ
 عیش لکھنوی

مٹیا برج کی تباہی

”۱۸۵۷ء میں شاہ کا انتقال ہو گیا اور چند ہی سال
 کے بعد مٹیا برج افسانہ بن کر رہ گیا۔ خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ
 تھا، جس کی حالت دیرانی لکھنے سے قلم کا جگر شق ہوتا ہے۔ اب بھی یاد آ رہا
 کہ یہ مٹیا برج عبرت کد ہے یہ“

ہترنے بادشاہ کے انتقال پر ایک قطعہ تاریخ میں مٹیا برج کا حال یوں بیان کیا ہے:
 حضرت سلطان عالم جا بے زیر زمین
 نار و نالان و سزین و مضطر و اندوہ گین
 سینہ و سر پٹیتے تھے غش کے ہمراہ لوگ
 الفت فردوس منزل سب کو لائی تھی یہاں
 جس کے دم سے پرورش پائیں گے اہل کھنوں
 تھی یہ آخر مجرّمش افلاک مٹیا برج میں
 مرد و زن سب تھے گریباں چاک مٹیا برج میں
 خاک بر سر تھا ہر اک غم ناک مٹیا برج میں
 در نہ ہے کس شخص کی املاک مٹیا برج میں
 کون اب ایسا ہے نل چالاک مٹیا برج میں

ساغر زہرِ غم داندوہ کا ہے سامنا
 چار دن میں دیکھیے تو ہنگامہ ہو، کا مکان
 نام کو بھی ڈھیر پھیلوں کے نہ آئیں گے نظر
 نام کو باقی نہیں تریاک مٹیا بروج میں
 کیا کہیں گے صاحبِ دراک مٹیا بروج میں
 ہو گا انبارِ خس و خاشاک مٹیا بروج میں

مطلع سال سیحی مخبر حالات ہے
اب اڑے گی چار جانب خاک مٹی ابرج میں

۱۸۸۶ عیسوی

ہنر کی یہ پیشین گوئی بالکل صحیح ثابت ہوئی۔ لیکن ہنر کیا کسی کو بھی یہ امید نہ ہوگی کہ حکومت اس تیزی سے اس کا رخانے کو الٹ پلٹ کر دے گی جسے واجد علی شاہ نے اپنے اکتیس برس کا یادگار چھوڑا تھا۔ خواجہ زین العابدین کا چشم دید بیان ہے کہ بادشاہ کا انتقال ہوتے ہی تمام ساکنان مٹیاء برج نظر بند کر دیے گئے اور شاہی محل سراپہ پہرہ بٹھا دیا گیا۔ یہ حالت تین دن رہی۔ واجد علی شاہ کے انتقال کے تیسرے دن تین دفعات پر مشتمل ایک ایکٹ پاس ہوا کہ واجد علی شاہ کی تمام املاک پر قابض اور متصرف ہونے کا حق صحت گورنر جنرل اور ان کی کونسل کو ہے۔ اور عام اس سے کہ کوئی وصیت نامہ یا وارث ہے یا نہیں جو احکام وہ اس سلسلے میں نافذ کریں گے ان کے خلاف کسی عدالت میں کوئی چارہ جوئی نہ ہو سکے گی۔

گورنر جنرل لارڈ ڈیفرن کے احکام کے مطابق بادشاہ کے ایک لاکھ کی جگہ چھتیس ہزار
تین سو اکاسی روپے ماہوار بادشاہ کے بیس ماندگان اور قدیم متوسلین کا وظیفہ مقرر ہوا۔ بادشاہ
کی ذاتی املاک بھی نیلام کر دی گئی۔ سرسر لکھنوی لکھتے ہیں :

۱۷ سواخ شاہ اودھ ص ۲۷ ۱۸۸۷ء کا ایکٹ ۱۹ ۱۹ شٹیس میں کلکتہ ۲۴ ستمبر
۱۸۸۷ء ۱۹ اودھ نیشنل میگزین ص ۱۷۱ قدیم متوسلین سے وہ ایک سو تیس آدمی مراد ہیں جو
زمانہ شاہی سے واحد علی شاہ کے ساتھ تھے

”مٹیا برج مٹی میں مل گیا۔ کلکے۔ کادہ کو نالار ڈڈرن کی بے ہری پر
 قربان ہو گیا۔ نہ اب وہ سر پہ فلک کو ٹھیاں باقی ہیں نہ وہ مینو سودا باغ
 اور چمن۔ نہ وہ زندہ مخلوق کا عجائب خانہ نظر آتا ہے نہ وہ بہشت آئین مرغزار
 رمنہ۔ نہ وہ محلوں کی ڈیوڑھیاں ہیں نہ وہ شعرا و ادبا کی نکھری صحبتیں سب
 خواب و خیال ہو کر دامن فنا میں پہنچ گئیں۔ مگر میری آنکھوں کے سامنے
 آج بھی اسی طرح پھر رہی ہیں۔ میں نے دنیا میں آنکھ کھول کر اس مشہور
 لکھنؤ کو تو نہیں دیکھا جو تہذیب کا مرکز، شائستگی کا منبع اور علمی و ادبی برکتوں
 کا خزانہ بنایا جاتا ہے۔ مگر مٹیا برج کو دیکھنے جو شمع اودھ کا آخری شمع دان
 اور دراصل اس زمانے کا زندہ لکھنؤ تھا۔ لکھنؤ کڑکڑاتا تھا مگر اس کے منتخب
 صاحبان کمالی دہان پہنچ کے گلشن اللہ جہاں پناہ کے سایہ عاطفت میں
 دریائے بھاگیرتی کے کنارے بس گئے تھے۔ مٹیا برج نہ تھا بلکہ دربار مغلیہ
 دربار اودھ اور ہندوستان کے اسلامی تمدن کی آخری شمع بنگلے کے ایک
 کونے میں روشن ہوئی تھی اور چونکہ کہنے کو تھی لہذا اکثر اوقات چراغ سحر
 کی طرح بھڑک بھڑک کر زیادہ نورانیت دکھا دیتی تھی ۛ

(۲)

”اگر کوٹھیوں اور مکانون کو اسی حالت میں تقسیم کر دیا جاتا تو بھی
 وہ شاید قائم رہ جاتیں۔ مگر انگریزوں کو اس میں زیادہ انصاف نظر
 آیا کہ کل کوٹھیاں اور سامان فروخت کر دیا جائے اور نقد روپیہ درہ میں
 تقسیم ہو۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ سب کوٹھیاں کھود ڈالی گئیں، باغ اور
 رمنے دیران ہو گئے۔ غرض واحد علی شاہ کے زمانے کے مٹیا برج کا انبام

نشان بھی باقی نہ رہا

مٹیابرج کی تباہی کے بارے میں مولانا شمس لکھنوی کے دو بیان پیش کیے جا چکے ہیں۔ انھوں نے وہاں کی شاہی معاشرت اور درباری شان و شوکت اپنی آنکھوں سے دیکھی تھی۔ وہ جب وہاں کی بربادی اور ویرانی کا حال لکھتے ہیں تو ان کا قلم خون کے آنسو بہانے لگتا ہے۔ فرماتے ہیں کہ:

”آہ یہ خوبصورت اور دل فریب نقش تو مٹنے کے قابل نہ تھا۔ مگر ہاے

زمانے نے مٹا ہی دیا اور ایسا مٹایا کہ گویا تھا ہی نہیں۔ ۱۳۱۶ھ محمدی

(۱۸۹۷ء) میں یکایک بادشاہ کی آنکھ بند ہوئی اور معلوم ہوا کہ خواب

تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا۔ سب باتیں خواب و خیال تھیں ایک

طلسم تھا کہ یکایک ٹوٹ گیا۔ اور وہ خوبصورت بقعہ جس کی زیارت کی

متنا یورپ کے سلاطین اور ہندوستان کے دلیان ملک کو رہا کرتی تھی؛

آج ایک وحشتان فنا اور عبرت کدہ ہے، جہاں کچھ بھی نہیں۔ جس

نے اس اگلے رنگ کو کبھی دیکھا تھا اب وہاں کے ستارے کو دیکھ کے

ہواے اس کے کہ کمال حسرت و اندوہ کے ساتھ ایک ٹھنڈی سانس

بھر کے کہے رہے نام اللہ کا، اور کیا کر سکتا ہے

”برٹش گورنمنٹ کی عدالت گسٹری نے واجد علی شاہ کا ترکہ تقسیم

کرنے اور ان کے ورثا کی داد رسی میں یہ شان عدالت دکھائی کہ ساری

جائداد اور سارا گھر بار بیچ کے حصہ رسدی سب میں تقسیم کر دیا جائے۔

اس کا لازمی نتیجہ تھا کہ مٹیابرج کی اینٹ سے اینٹ بچ گئی۔ لاکھوں

کا سامان کوڑیوں کو بیگ گیا۔ اور وہی بقعہ جو چند روز میں باغِ ارم بن

گیا تھا حنیض ادب کا جہنم ہو کے رہ گیا۔ اب تم وہاں جہاں کے خاک
 اُڑاؤ کچھ نظر نہ آئے گا۔ اگر آنکھیں اگلی رفتی اور پیل پیل کو ڈھونڈ سکتی
 ہوں تو کسی امرِ افسانہ کو بلاؤ جو آسو بہاتا جائے اور تمہیں بتاتا جائے
 کہ یہاں مرصع منزل تھی، یہاں نور منزل تھی، یہاں سلطان خانہ تھا اور
 یہاں اسد منزل تھی، وہاں مشاعرے ہوتے تھے، وہاں علمائے باکمال
 کی مجلس تھی، وہاں یارانِ باصفا کی بذلہ سنجیاں تھیں اور وہاں نفسِ عالی
 جادو بیان کی سحر ازیں تھیں یہ

— :: —

۱۔ جاہلیت عرب کا ایک نلیت مشہور شاعر جس نے اپنے قدیم عشرت کلمے کی دیرانی اور تباہی کی تصویر
 نہایت ہی سوز و گداز کے الفاظ میں دکھائی ہے۔ شہر
 ۲۔ گزشتہ لکھنؤ ۴۳-۴۴

ضمیمہ

ضمیمہ الف - واجد علی شاہ کی تاریخ ولادت

ضمیمہ ب - دستورات واجدی - چھیا سٹھ دستور

ضمیمہ ج - بادشاہ اور گورنر جنرل کی ملاقات

ضمیمہ د - ایکٹ ۸ ۱۸۶۲ء

ضمیمہ ۵ - انگریزوں کی زیادتیاں، نا انصافیاں اور زعمہ خلافیاں - بادشاہ کے قلم سے -

ضمیمہ ۶ - اودھ اور اودھ والوں کے بارے میں ریڈیڈنٹ سلیمین کی رائے - محکمہ انسداد ٹھگلی و ڈکیتی کی رپورٹ کے چند اقتباسات -

ضمیمہ الف

واجہ علی شاہ کی تاریخ ولادت

واجہ علی شاہ کی تاریخ ولادت میں بہت اختلاف ہے۔ مختلف تاریخیں ماخذوں کے حوالے کے ساتھ ذیل میں درج کی جاتی ہیں۔

۱۰ رذی قعدہ ۱۲۳۷ھ ہجری۔ روزِ شنبہ۔ سادون سدی ۱۲ ۱۸۷۹ء ذکر می
۲۲۹ھ فصلی۔ ۱۸۲۱ء
(قیص التواریخ جلد دوم ص ۷)

۱۰ رذی قعدہ ۱۲۳۸ھ۔ روزِ شنبہ۔ سادون سدی ۱۲ ۱۸۷۹ء ذکر می

تقدیم بیت السلطنت لکھنؤ، ۱۲۶۲ھ ۱۸۴۸ء ص ۲۳

۱۲۶۵ھ ۱۸۴۹ء ص ۶۸

۱۰ رذی قعدہ ۱۲۳۸ھ۔ روزِ شنبہ۔ (تاریخ اودھ حصہ پنجم ص ۲۶)

۱۲۳۳ھ۔ منبذہ الکوائف از ہمارا جرجے گوپال ثاقب

قدیم جتروں کی مدد سے ان مختلف سنوں اور تاریخوں کی تطبیق میں بہت سادقت صحت کرنے کے بعد یہ نتیجہ نکلا کہ واجہ علی شاہ کی ولادت کی تاریخیں مختلف سنوں کے اعتبار سے یہ ہیں۔
۱۰ رذی قعدہ ۱۲۳۷ھ۔ ۲۰ جولائی ۱۸۲۲ء۔ ۲۶ سادون ۱۲۲۹ھ فصلی۔

ساون سدی ۱۲ ۱۸۷۹ء ذکر می۔

سب سے زیادہ غلط فہمی ثاقب کے بیان سے پیدا ہوئی، مگر انھوں نے بادشاہ کے انتقال پر جو طولانی قطعہ لکھا تاریخ کہا ہے اس سے یہ غلط فہمی دور ہو جاتی ہے۔ اس

قطع کے مندرجہ ذیل پانچ شعر خاص طور پر قابلِ لحاظ ہیں :

سالِ شصت و ہفتم دیک ماہِ بہم بست نہ رود
از ستمبر بود آن تاریخ بستم آشکار
از ستین عمر اشرف و انمودہ انقضا
نصف شب از چار شنبہ ثالث از ماہِ عزرا
شد بلند از پیش جہت بس نعرہ و احسرتنا
فرز و شان و تاج و تخت و سکہ و چتر و لوا
ہر تاریخ مسیحی بے سر آمد در نظر

وقت فکر سالِ ہجرت گشت این ہر ہفت پیش

حسرت و یاس و الم رنج و عنایت و ہکا

چوتھے شعر کے دو سہ مصرعے کے خط کشیدہ لفظوں کو بے سر کر کے یعنی ان کا پہلا حرف پھوڑ کے باقی حرفوں کے عدد ۸۸۷ نکلتے ہیں اور پانچویں شعر کے دو سہ مصرعے کے خط کشیدہ لفظوں کے عدد ۱۳۰۵ نکلتے ہیں۔ اس طرح معلوم ہوتا ہے کہ ۲۰ ستمبر ۱۸۸۷ء مطابق ۳ محرم ۱۳۰۵ء کو چہار شنبہ کے دن آدھی رات کے وقت واجد علی شاہ کا انتقال ہوا اور انتقال کے وقت ان کی عمر ستر سٹھ برس ایک مہینا تیس دن کی تھی۔ اگر اس مدت کو ان کی تاریخ وفات ۳ محرم ۱۳۰۵ء سے گھٹا دیں تو ان کی ولادت کی تاریخ ۱۰ ذی قعدہ ۱۲۳۷ء نکلتی ہے۔ اس تاریخ کی تائید ہمارا جارتن سنگھ زخمی کے مندرجہ ذیل بیان سے بھی ہوتی ہے :

”بروز شنبہ عاشور ذی قعدہ ۱۲۳۷ء ہزار و دویسہ صد و سی و

ہفت ہجری مطابق ثلاثین من شہر جولائی ۱۸۲۲ء ہزار و ہشت صد و

بست و دو عیسوی بعرض اقدس و اعلیٰ رسید کہ نجم الدولہ مرزا امجد علی

خان بہادر خلف رشید نواب نصیر الدولہ بہادر صاحب فرزند ازبند

شدند کہ اسم مبارک آن مولود مسعود مرزا واجد علی بہادر

لہ 'اقدس' اعلیٰ سے مراد ہے بادشاہ وقت غازی الدین حیدر

مگر ہشتند

اب اس میں کسی شرک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ واجد علی شاہ ۱۰ ارذی قعدہ ۱۲۳۷ھ مطابق ۳ جولائی ۱۸۲۲ء کو پیدا ہوئے۔

بادشاہ کا حافظہ بہت قوی تھا، لیکن انھوں نے اپنی عمر کو مختلف مقامات پر بتائی ہے، اس میں بہت اختلاف نظر آتا ہے۔ اس اختلاف کے اسباب سے بحث کرنا ضروری نہیں۔



۱۔ سلطان التواریخ قلمی ص ۳۸۲ ۲۔ حزن اختی مطبع سلطانی ص ۵، مثنوی عشق بنی
ص ۱۹-۲۵، بنی ص ۲۳۱-۲۳۲، عشق نامہ فارسی ص ۵-۹، مثنوی حیات القلوب قلمی۔

سن اب تیرہ سو ہجری آیں لے لیس : تو ترپن برس کا ہے سن بے مہر

ضمیمہ - ب

دستورات واجدی، ۶۶ دستور

دستور یہ ہر چھوٹے بڑے کی بھلائی اور کثیر فائدے پر مشتمل ہے۔ دستور سرکشوں کی سرکوبی اور ظلم و فساد کی سرکوبی۔ دستور۔ مقدمات کے تصفیے میں عجلت کے بارے میں عالموں اور داروغوں کے نام حکم۔ دستور۔ مستغنیوں یا مخصوص انگریزوں کے مقدمات کے تصفیے کے بارے میں امینوں کے نام حکم۔ دستور۔ تفصیل شدہ اور غیر تفصیل شدہ مقدمات کی فہرستوں کی طلبی۔ دستور۔ تعلقداروں سے شاگون سے زیادہ روپیہ وصول کرنے اور رسید لکھنے کی ممانعت۔ دستور۔ امینی تحصیل داروں کا تقرر اور ان کے لیے قانون۔ دستور۔ بلاروغا مقدمات کے تصفیے کے لیے امینوں کو اور مفتیوں کے نام حکم۔ دستور۔ فوج اور نظامت کے آدمیوں کی زیادتیوں کو دور کرنے کے لیے فوج کے افسروں کے نام حکم۔ دستور۔ عدالت عالیہ کے سوا کسی محکمے سے قبائلوں کی ممانعت۔ دستور۔ رشت کی ممانعت اور دوسری انتظامی ہدایتیں۔ دستور۔ بولی کے قانون اور نہر اور بیہودہ گوئی کی ممانعت۔ دستور۔ ہندو عورتوں کے سستی ہونے کی ممانعت۔ دستور۔ عام رعایا کی آسائش کے بارے میں سلطنت کے کارکنوں کے نام حکم۔ دستور۔ رعایا کی آسائش اور عرضیاں گزارنے میں سہولت کے لیے ارکان دولت کے نام حکم۔ دستور۔ شاہی فوج کی حالت کے اظہار کے لیے وزیر اعظم کے نام حکم۔ دستور۔ معروضات کی تکمیل اور غیر ضروری اخبار موقوف دستور۔ انگریز مستغنیوں کے عذر دہن کو دفع کرنے کے لیے متوسط کے نام حکم۔ دستور۔ دربار شاہی کے آداب کو ملحوظ رکھنے کے لیے داروغہ دیوان عام کے نام حکم۔ دستور۔ غلے کی اور زانی اور اطراف سے بنجاروں کی طلبی۔ دستور۔ نوواردوں کے بارے میں کوتوالوں

وغیرہ کے نام حکم۔ دستور ۲۲۔ احکام کی تعمیل میں عجلت اور جوابات کی وصول یابی کے لیے
 میعاد کا تعین بالخصوص انگریزی مقدمات میں۔ دستور ۲۳۔ زمینداری اور ناتکار کی بغیر حکم
 خرید و فروخت کی ممانعت۔ دستور ۲۴۔ سررشتے کی خلاف ورزی اور بغیر روپیہ وصول کے
 ہوئے رسید لکھ دینے کی ممانعت۔ دستور ۲۵۔ دختر کشی کے بارے میں راجپوتوں کو تنبیہ
 دستور ۲۶۔ میلے کا انتظام اور غیر واجبی حصول کی ممانعت۔ دستور ۲۷۔ سزا دلی اور رعایا
 کی ہیود کے بارے میں شرف الدولہ کے نام حکم۔ دستور ۲۸۔ دن اور رات کے چوروں کا
 تدارک۔ بیت السلطنت لکھنؤ کے شعبہ کے نام حکم۔ دستور ۲۹۔ بخشی گری کا انتظام
 فوج والوں کی ہیود اور رشوت کی ممانعت۔ دستور ۳۰۔ ہرکاروں اور چیراسیوں کے ہاتھوں
 سے مسافروں کی حفاظت کا انتظام۔ دستور ۳۱۔ صیغہ داروں کو تاکید اور عالموں کو حکم
 کہ امور دولت خواہی میں فردگزاشت نہ کریں۔ دستور ۳۲۔ واردات کی تفتیش اور احتیاج
 سے مطابقت۔ دستور ۳۳۔ کوٹوال کے نام حکم کہ کوئی مکان خالی نہ رکھا جائے تاکہ چور
 اس میں چھپ کر نہ بیٹھ سکیں۔ دستور ۳۴۔ زمینداروں اور گنڈہ باتوں کی بدعتوں کو
 دفع کرنے کے بارے میں۔ دستور ۳۵۔ جدید باغوں کا محصول اور نئے درخت لگانے کی
 ممانعت۔ دستور ۳۶۔ بیوپاریوں کی تکلیفیں دور کی جائیں اور ان کو اجازت ہو کہ وہ
 جس گج کو بہتر سمجھیں وہاں جائیں۔ دستور ۳۷۔ ہرکاروں کی بابت ریڈنٹ کی شکایت
 دور کی جائے۔ دستور ۳۸۔ جھوٹے مستغیثوں اور ناحق لڑنے والے مفتریوں کے بارے میں۔
 دستور ۳۹۔ کمپنی انگریز بہادر کی عمل داری کے تھانے داروں سے تعرض کی ممانعت۔
 دستور ۴۰۔ رشوت لینے کی ممانعت اور فوج کا انتظام۔ دستور ۴۱۔ عشرہ محرم کے انتظام
 اور ادا داری کی بابت ہدایت۔ دستور ۴۲۔ مطابق مضمون بالا۔ دستور ۴۳۔ سرحدی امینوں
 کے لیے قانون بارہ دفعات پر مشتمل۔ دستور ۴۴۔ نظم و نسق کے بارے میں عالموں کے نام
 حکم۔ دستور ۴۵۔ رعایا کی ہیود کے بارے میں عالموں کو ہدایت۔ دستور ۴۶۔ مستغیثوں کو
 جلد جواب بھیجنے کے بارے میں۔ دستور ۴۷۔ قید کے بعد آبروریزی اور اعضا کاٹنے کی ممانعت

کے لیے عالموں کے نام حکم۔ دستور۔ رعایا کی بہبود اور داری کے بارے میں۔ دستور^{۴۹}
 حضور تحصیل کے معاملات کی تحقیق کے بارے میں۔ دستور۔ ہتھیار باندھنے اور مسلح
 سپاہیوں کی آمد و رفت کی روش کے بارے میں۔ دستور۔ فوج کے انتظام کے لیے
 میزبانی کے نام حکم۔ دستور۔ بے بنیاد نالشوں کو ختم کرنے کے بارے میں۔ دستور^{۵۲}
 سرحد کے امینوں کے قوانین جو چند فصلوں پر مشتمل ہیں۔ دستور۔ اقرارنامے کے بارے میں
 دستور۔ عالموں کے لیے ہدایت نامہ۔ دستور۔ ملک کے انتظام کے لیے ناظموں کے نام
 حکم۔ دستور۔ دستور ۵۵ کا ضمیمہ قبولیت اور اس کی تحریر کے بارے میں۔ دستور^{۵۶}
 نزاعوں کا سرسری طور پر فیصلہ کرنے کے بارے میں۔ دستور۔ اخبار اور اخبار نویسوں کے
 بارے میں۔ دستور۔ میلے کے حال اور انتظام کے بارے میں مع دیگر کیفیتوں کے۔
 دستور۔ سلطانی رہن نامہ و بیع نامہ اور تین ماہ کی قید کے ساتھ اشتہار۔ دستور^{۶۲}
 سال دوم جلوس مطابق ۱۲۶۵ھ کا ہدایت نامہ۔ دستور۔ نادہند مال گزاروں کے
 بارے میں۔ دستور۔ پوشاک اور لباس کے آداب و قواعد۔ دستور۔ دکانوں کے
 سامنے سائبان لگانے کی ممانعت۔ دستور۔ کبیر خوانی اور آبروریزی کی ممانعت۔
 (وزیر خاں ص ۱۳۷-۱۵۲)

ضمیمہ ج

واجد علی شاہ اور گورنر جنرل کی ملاقات

حضرت سلطان عالم کے جلوس کے پہلے سال میں گورنر جنرل لارڈ ہارڈنگ
صوبہ لاہور کا فساد فرود کرنے کے لیے ملک پنجاب میں وارد ہوئے۔ وہاں سے واپسی میں
بادشاہ اودھ سے ملاقات کا ارادہ کیا۔ یہ خبر سن کر چائے پانی کا سامان نعمت خانہ سلطانی
کے داروغہ قنبر علی خاں کے اہتمام میں روانہ کیا گیا۔ جب یہ خبر آئی کہ وائس رے قریب
پہنچ گئے ہیں تو شاہی فوجیں بڑی شان سے آراستہ کی گئیں۔ نئی نئی خوش نما پوشاکیں
تیار ہوئیں۔ سواروں اور پیادوں کے گردہ کوئی رنگاری لباس پہنے ہوئے کوئی اور خانی،
کوئی نیلا، کوئی رنگ بنگی۔ ہاتھیوں پر لال جھولیں گویا آسمان پر شفق، کوتل گھوڑوں کے
ساز ویراق کی چمک، ماہی مراتب کی نور پاشی، بسادلوں اور قراڈلوں کی سرخ قبائیں، برگ
سواروں کی رنگین پوشاکیں، تلنگوں کی رنگ بنگی دروہیاں، بخیبوں کی نیلی قیائیں اور آبی
پگچیاں، شتر سواروں اور لالٹین برداروں کے رسالوں کی آراکش، قوش خانے، سل خانے
اور آتش خانے کی نمائش، کمان داروں، بان برداروں، نیزہ داروں، خاص برداروں
کے فرقے فرقے کی جدا جدا وضع و روش، گھوڑوں، ہاتھیوں اور اونٹوں پر نقادوں کی بلند
آوازیں، غرض کہ شکوہ اور انبوه کا ایک عجائب خانہ تھا اور شان و شوکت کی ایک دنیا۔
پائے تخت (کھنؤ) سے لے کر گنگا کے کنارے تک قدم قدم پر اونچی اونچی بارگاہیں
آسمان سے باتیں کر رہی تھیں۔ جگہ جگہ علویں کے پھر پرے ہوا میں لہراہے تھے۔ شاہی
سواری کی روانگی سے پہلے تمام ارکان و اعوان لشکر شاہی میں داخل ہو کر بادشاہ کی
سواری کا انتظار کر رہے تھے۔ بادشاہ گھوڑے پر سوار ہو کر بیسی باغ تک گئے۔ مسٹر چیٹ
ریڈنٹ اور مسٹر برڈناب ریڈنٹ اور چند سوار ہمراہ رکاب تھے۔ وہاں سے سب گامی
پر بیٹھ کر سات گھنٹے مسلسل سفر کر کے کانپور کے قریب نزول اجلال فرمایا۔ اتفاق

سے اس دن ابراگیا اور ہلکی ہلکی بوندیاں پڑنے لگیں۔ اس کے بعد خوب زور کی بارش شروع ہوئی۔ تین دن سورج دکھائی نہیں دیا۔ بہت ٹھنڈی ہوا چلتی رہی۔ کان پور میں شاہی باغبانوں نے اپنے فن کا یہ اعجاز دکھایا کہ بادشاہ کی دولت سر کے جلو خانے کے صحن میں ایک بہت خوش نما چمن لگا دیا۔ دولت سرا کے ارد گرد قریب سے فوج کی چھاؤنی اُردو بازار، ہیسرو سنگا واقع تھی۔

بادشاہ کی آمد کے بعد ایک دن دائسراے کے سکریٹری سٹریلیٹ نے باریابی کا شرف حاصل کیا اور بادشاہ کی تشریف آوری کا شکریہ بجالانے کے بعد دائسراے کا پیام اشتیاق نیازمندی اور خوش بیانی کے ساتھ ادا کیا۔ قدیم دستور کے موافق پیشکاران سلطنت نے ان کی بہت خاطر اور عزت کی۔ نصرت کے وقت ان کو چاندی کا ہار عطا ہوا۔

دوسرے دن شاہی سواری بہت شان و شکوہ کے ساتھ دائسراے کی قیام گاہ کی طرف روانہ ہوئی۔ بادشاہ ہاتھی پر سوار تھے۔ آگے آگے نقیب بول رہے تھے۔ نقادوں کی آواز آسمان کے پار جا رہی تھی۔ دور باش کی ہیبت سے دل دہل رہے تھے۔ روپوں انٹرنیوں کی بارش ہو رہی تھی۔ جب بادشاہ کی سواری قریب پہنچی تو دائسراے بہادر نے اپنے خیمے سے نکل کر استقبال کیا اور مصافحہ کر کے بادشاہ کی بائیں جانب ہو گئے اور دوستانہ گفتگو کرتے ہوئے اپنے خیمے میں لے جا کر اعزاز و احترام کے ساتھ کرسی پر بٹھایا۔ حضور عالم نواب علی نقی خاں بہادر وزیر اعظم اور شیرالدولہ بہادر دیوان اعلیٰ بھی بادشاہ کے ساتھ تھے۔ کچھ دیر لطف صحبت رہا۔ دائسراے بہادر بادشاہ کی دانش مندانہ گفتگو سے بہت خوش ہوئے۔ چند کشتیوں میں طرح طرح کی چیزیں، ایک ہاتھی مع عماری اور پانچ گھوڑے بادشاہ کی نذر کیے اور حسب دستور وزیر اعظم، دیوان اعلیٰ اور محمد خاں متوسط کو خلعت دیے۔

بادشاہ نے دائسراے سے لکھنؤ تشریف لانے کا وعدہ لیا اور اپنی قیام گاہ پراپس آئے اور وہاں سے کوچ کر کے اپنے دار السلطنت پہنچ گئے۔ اسی دن حکم سلطانی نافذ ہوا کہ چوک بازار کی آئین بندی نئے سرے سے کی جائے۔ گزرگاہ کی دکانیں اور مکان آراستہ

کے جائیں اور ان کی ہچکتوں پر گویے اور گائیں مبارک باد دیں۔
 شاہی لشکر کے پیچھے دائرے ہباد کی سواری کان پور سے چلی اور لکھنؤ سے کچھ فاصلے
 پر ٹھہر گئی۔ صبح کو بادشاہ بڑی شان و شوکت سے دائرے کے استقبال کے لیے روانہ ہوئے۔
 اٹلے راہ میں صاحب مہدوح سے ملاقات ہوئی۔ بادشاہ نے معزز ہمان کو اپنے ہاتھ کے
 زین ہودج میں اپنے برابر بٹھالیا اور چوک کے راستے سے تماشائیوں کے ہجوم میں سے
 گزرتے ہوئے اور اپنے دست کرم سے روپے اشرفیاں لٹاتے ہوئے موتی محل میں داخل
 ہوئے۔ کچھ دیر تک تفریح طبع کے لیے ہاتھیوں کی لڑائی وغیرہ ہوتی رہی۔ اس کے بعد سیر
 لگائی گئی۔ دائرے نے اپنے اصحاب کے ساتھ کھانا کھایا اور رخصت ہو کر ریڈنٹ ہباد
 کے مکان پر قیام کیا۔ چار دن تک بادشاہ کے ہمان رہ کر اپنے دارالامارۃ کلکتے کو روانہ ہو گئے۔
 گورنر جنرل کے اس شاہانہ استقبال کا حال مصنف آفتاب اودھ نے یوں لکھا

ہے :-

” ۱۸۴۸ء میں لاہور دار دنگ بہادر گورنر جنرل ہندوستان جو کہ بعد
 فتح ملک پنجاگ کے ملک اودھ میں تشریف لائے تھے، حضرت واجد علی شاہ
 بادشاہ نے تابہر شہر کاٹھ پور ان کا استقبال کیا۔ یہ سفر بڑی تیاری کا تھا۔
 تمام فوج سلطانی تازہ بہ تازہ در دیوں سے مرتب تھی اور اس قدر کثرت
 لشکر اور بازار وغیرہ کی تھی کہ کوسوں تک شہر عظیم الشان معلوم ہوتا تھا اور ایسے
 ایسے عمدہ اور بڑی تیاری کے خیمہ ہائے بارفت و شان تھے کہ ان کے دیکھنے
 سے عقل تماشائیوں کی دنگ ہو جاتی تھی۔ خلاصہ یہ کہ شہر لکھنؤ سے کناڑہ شہر
 کاٹھ پور تک بہ سبب ہجوم لشکریاں اور آمد و رفت تماشائیوں کے چوبیس کوس

برابر ایک شہر آباد نظر آتا تھا۔ مختصر حال تکلفات لشکر کا یہ ہے کہ لب زریا
گنگا خیم عظیم الشان بادشاہی نصب ہوئے تھے اور گرداگرد ان کے دور دور
تک سراپے اور شالے کی قنائیں استادہ تھیں اور اندرون سراپوں کے دریا
کی ریت پر ایک باغ تیار ہوا تھا کہ ریش اور پٹری سے نہایت بہ تکلف آراستہ
کیا گیا تھا۔ طرہ یہ کہ چمنوں میں تمام میوؤں کے درخت اور پھولوں کے درخت
اس خوبی سے لگے تھے کہ ان میں سب پھول اور میوے لگے ہوئے تھے اور ہر
درخت پر یہ سرسبزی اور طراوت تھی کہ اس فصل تابش آفتاب میں اور اس
میدان ریختان میں یہ معلوم ہوتا تھا کہ ابھی اس باغ میں باران رحمت کی
ابھی طرح بارش ہوئی ہے۔ گویا کہ ایک طلسم کا وہ باغ بنایا تھا جیسے



”ایکٹ نمبر ۸ ۱۸۶۲ء“

”ایکٹ بہ مراد نگہداشت منزلت ذاتی شاہ اودھ کے“

”ہر گاہ بموجب اس اقرار کے جو کہ منجانب سرکار انگریزی شاہ اودھ سے کیا گیا تھا واسطے قائم رکھنے شاہ موصوف کی منزلت ذاتی کے یہ قرین مصلحت ہے کہ شاہ موصوف عدالت ہائے دیوانی اور محکمہ جات مال اور فوجداری کے احاطہ اختیار سے کسی قدر مستثنیٰ ہوں۔ لہذا حسب ذیل حکم ہوتا ہے۔

دفعہ ۱۔ از روئے دفعہ ہذا کے شاہ اودھ اختیار عدالت ہائے فوجداری سے باہر قرار دیے گئے ہیں اور باہر ہیں۔ مگر بحران جو موصوف کے جن کے واسطے بموجب مجبورہ تعزیرات ہند منزلے موت مقرر ہے اور واضح ہو کہ جرائم مذکور کے سوا کوئی عدالت فوجداری یا مختصر اختیار کسی نالاش کی تحقیقات کا جو بنام شاہ موصوف ہو یا صدر کسی حکم نامے کا بنام ان کے نہ رکھے گا۔

دفعہ ۲۔ کوئی انسپریس یا شخص دیگر بلا وارنٹ کے شاہ موصوف کی گرفتاری کا اختیار نہ رکھے گا اور کوئی انسپریس یا شخص دیگر عام اس سے کسی وارنٹ کے اجرا کے واسطے مامور ہو یا نہ ہو مجاز نہ ہو گا کہ بغرض گرفتاری کسی شخص یا تلاش کسی شے کے ایسے مکان کے اندر جو کہ اس وقت سکن شاہ موصوف ہو مگر موجودگی اور اجازت اس عہدہ دار کے جو کہ گورنمنٹ انگریزی کی طرف سے شاہ موصوف کے پاس بطور ایجنٹ مقرر کیا جاوے داخل ہو یا اس سکن میں ٹھہرے۔

دفعہ ۳۔ اگر کوئی نالاش یا اطلاع نسبت شاہ موصوف بابت کسی ایسے جرم

کے جوہراتم متذکرہ دفعہ اول ایکٹ ہذا سے بخارج ہو گئے تو جو عہدہ دار کہ شاہ موصوف کے پاس بعد ازاں ایجنٹ متعین ہوا سے اجازت ہے کہ مقدمے کی تحقیقات کر کے کیفیت اس کی نواب گورنر جنرل بہادر بہ اجلاس کونسل کی خدمت میں بھیجے۔ اور نواب محترم الہیم بہ اجلاس کونسل بروقت پہنچے اس کیفیت کے اس جرم کی تجویز کے واسطے کمیشن مقرر فرمادیں اور اس کمیشن کو کوئی اختیار منجملہ ان اختیارات کے جو کہ ازروئے مجموعہ ضابطہ فوجداری کسی عدالت کو حاصل ہیں اس باب میں عطا کریں۔ مگر ملحوظ رہے کہ در صورت ثبوت کے اہل کمیشن مذکور کو اختیار صدور حکم سزا نہ ہوگا۔ لیکن اپنی رائے سے نواب گورنر جنرل بہادر بہ اجلاس کونسل کو مطلع کرنا چاہیے کہ نواب محترم الہیم درباب حراست ذات یا نیلام جائیداد شاہ موصوف کے یعنی جیسا کہ بحسب صورت مقدمہ ضروری تصور ہو حکم صادر کریں گے۔

دفعہ ۴۔ کوئی ریٹ یا حکم نامہ نسبت ذات یا مال یا جائیداد شاہ موصوف کے کسی عدالت دیوانی یا محکمہ مال، فوجداری سے کسی وقت صادر اور عمل پذیر نہیں ہو سکتا ہے الا اس صورت میں کہ اس کی بابت پیشتر منظوری نواب گورنر جنرل بہادر اجلاس کونسل کی حاصل کر کے منگائی گئی ہو اور وہ منظوری مصدق بہ دست خط سکرٹری گورنمنٹ ہند ہو اور جو ریٹ یا حکم نامہ بلا حصول ایسی منظوری کے شاہ موصوف کی ذات یا مال یا جائیداد پر کسی وقت صادر یا عمل پذیر ہو وہ بالکل باطل اور ناجائز ہوگا۔

دفعہ ۵۔ شاہ موصوف کسی عدالت میں یا درود کسی اہل کمیشن کے جو کسی عدالت سے مقرر ہو واسطے دینے اظہار یا اظہار حلفی کے جب کہ وہ کسی مقدمے یا کاروائی موجودہ عدالت دیوانی یا محکمہ مال یا فوج داری میں مطلوب ہو اصدالت بطور گواہ حاضر نہ کرائے جا دیں گے۔

دفعہ ۶۔ در صورتی کہ شہادت شاہ موصوف کی ایسے مقدمے یا کاروائی میں مطلوب ہو تو عدالت یا وہ شخص جو چاہتا ہو سوالات تحریری واسطے اظہار شاہ موصوف کے مرتب کرے اور جو مقدمہ یا کاروائی اس قسم کی ہو کہ کوئی فریق ثانی قانوناً مستحق سوالات

تردید کا ہو تو وہ بھی مجاز تیار کرنے سوالات تردیدی کا ہو گا اور سوالات مذکور اور اگر سوالات تردیدی ہوں تو وہ بھی ایکٹ حاضر باش شاہ موصوف کے پاس بھیج دیے جائیں گے اور وہ انھیں شاہ موصوف کو دکھلائے گا اور ان کے جوابات بہ اقرار صالح قلم بند کرے گا۔ بعد ازاں سوالات مذکور اور اگر سوالات تردیدی ہوں تو وہ بھی مع جوابات ان کے اسی عدالت میں واپس بھیجے جائیں گے کہ جس میں مقدمہ یا کارروائی مذکور دائر ہو اور اس کے ساتھ ایکٹ مذکور اپنا سائٹیفکٹ بہ اس مضمون کہ جوابات حسب ضابطہ لیئے گئے ہیں مہضوف کرے گا۔

دفعہ ۷۔ جس وقت کہ نسبت اظہار حلفی کے شاہ موصوف کا حلف کسی مقدمے یا کارروائی میں لینا مطلوب ہو تو اظہار اور حلف رد برد ایکٹ مذکور کے لیا جائے گا اور ایکٹ مذکور اس اظہار کو مع سائٹیفکٹ اس امر کے کہ اس کی نسبت حلف حسب ضابطہ لیا گیا اس عدالت یا حاکم کے پاس جس کے رو برو مستعمل ہونے والا ہو بھیج دے گا۔

دفعہ ۸۔ جس وقت شاہ موصوف سے سوالات کے جواب یا حلف نسبت کسی اظہار کے حسب احکام ایکٹ نہ لیا جاتا ہو کوئی دوسرا شخص ججز ایکٹ مذکورہ الصبر کے سوائے اس صورت کے کہ خود شاہ موصوف اجازت دیں مجاز حاضر ہونے کا نہ ہو گا۔

دفعہ ۹۔ جواب سوالات کے یا اظہار حلفی شاہ موصوف کا جو کہ بموجب احکام ایکٹ نہ اقلم بند ہوئے ہوں یا جس کی نسبت حلف کیا گیا ہو بطور شہادت منظور ہوں گے مگر جو اعتراضات کہ جوابات یا حلف مذکور کی نسبت سر اجلاس عدالت یا معرفت کیشن کے ہونے کی صورت میں ہوتے وہی صورت متذکرہ بالا میں بھی ہو سکیں گے۔

دفعہ ۱۰۔ ایکٹ نہ بعد وفات شاہ موصوف کے نافذ نہ رہے گا۔ فقط

ضمیمہ ۵

انگریزوں کی زیادتیاں، نا انصافیاں اور وعدہ خلافیاں۔ بادشاہ کے قلم سے تیار
ہم اور ہمارے بزرگ اور ہمارا پورا خاندان اس وقت تک سرکار برطانیہ کا فرما
اور وفا شعار رہا ہے، یہاں تک کہ سلطنت لے لی اور ہم نے دم نہ مارا۔ ————— استخراج
سلطنت کے بعد ایک لاکھ ماہوار کا جو وعدہ کیا وہ بھی تین سال تک نہ دیا حالانکہ وہ
صریحاً میرا حق ہے اور گورنمنٹ میں جمع ہے۔ ————— رجسٹری کی نگہداشت کے لیے
اس ایک لاکھ کے علاوہ دو لاکھ روپیہ اور پانچ فرسخ آراضی پر بیسے قبضے کا جو وعدہ کیا
تھا وہ بھی پورا نہ کیا۔ ————— ۲۶ تھینے بلا سبب محض اپنے بے بنیاد دہم اور رشک کی پست
پر کلکتے کے فورٹ ولیم میں قید رکھا۔ ————— مسیکے بڑے مجنون بیٹے نوشیرواں قدر کو
سن شباب میں توپ کے گولے سے ہلاک کر دیا۔ ————— ان کی خاطر سے اپنے بیٹے
برصین قدر کو کھینچ ڈیا۔ ————— ترک وطن کے وقت جواہرات، مال، تخت اور دوسرا
اسباب داشا اس وقت کے رزیڈنٹ اور کم کے سپرد کر کے آیا تھا۔ اس میں سے بہت
قلیل مجھ کو ملا جو سو میں ایک حصہ بھی نہ تھا۔ میرے جانوروں اور املاک وغیرہ کو کوڑیوں
میں نیلام کر دیا اور وہ کوڑیاں بھی میرے ہاتھ میں نہ آئیں۔ ————— معذولی سے قبل
بادشاہی کے زمانے کی ڈھائی تقطیں عمال پر اب تک باقی ہیں، حالانکہ ملک کی ملک
قبضے کے وقت سے شمار نہ نا چاہیے۔ ————— ایکسٹری کی تحریر میرے پاس موجود ہے
کہ میرے کل عزیز اور خاندان شاہی نیشن اور تنخواہیں میری وساطت سے پایا کریں گے
اس تحریر کی پابندی نہیں کی گئی۔ ————— میری عزت و حرمت کے بارے میں
لارڈ کلیننگ کا محبت نامہ گواہ ہے اس پر کبھی غور نہیں کیا گیا۔ لارڈ میونس نے مجھ کو نیچے
بٹھایا اور گورنری کے تخت پر جلوہ افروز ہوئے۔ ————— راہ داری کے پردانے اور
گورنمنٹ عالی کے حکم کے باوجود کلکتے میں میری سلامتی موقوف کر دی گئی۔ ————— کانپور

الہ آباد، بنارس وغیرہ میں توپوں کی سلامی ہوئی، مگر معلوم نہیں کھٹکتے تھے
 سے کیا تصور ہوا کہ اس سے بھی محروم کر دیا گیا۔ — کھیری گڑھ جو میرے دادا
 حضرت خلد مکان کا زرخیز تھا وہ بھی ہمالیہ میں شامل کر لیا گیا۔ —
 پانچ ہزار روپیہ مالانہ زبردستی جنت نشین کے نام مقرر کر دیا گیا۔ — قرضے کا فیصلہ
 اپنی رائے کے موافق کر دیا۔ میں نے قبول کر لیا اور اکھلا لٹا ادا کر دیا۔ — میوہ خوری
 کے لیے زبردستی ڈھائی ہزار کی قیمت پہنچی میں نے منظور کر کے بیٹے کو عاق کر دیا اور
 اس کی ماں کی مدت ہبہ کر دی۔ — چونکہ میری ذات صبر کے امتحان اور انگریزوں
 کی رضا جوئی کے لیے خلق ہوئی ہے لہذا صبر کروں گا اور گورنمنٹ کے حکم کی خلاف ورزی
 نہ کروں گا۔
 (ملک اختر صد ۲۰ تا ۲۰۴)

ما تم یک شہر آرزو

میر اکاڈمی کی طرف سے جب میں نے زیر نظر کتاب "سلطان عالم
واجب علی شاہ" کی اشاعت کا بیڑا اٹھایا تو دل میں کیا کیا خواہشیں - کیسے کیسے
خیال - کیسے کیسے خواب کہ یہ کتاب مصنف کی زندگی میں شائع ہوگی تو وہ اپنی برسوں
کی محنت اور جگر کا دی کو صوری پیکر میں دیکھ کر کس قدر خوش ہوں گے - اس کی کامیابی
کی چاروں طرف دھوم سے انھیں کیسی قلبی مسرت اور روحانی سرور حاصل ہوگا -
لیکن ان حوادث و مواعج کے ان نڈیلوں کو کیا کہیے جو ردہ کر اٹھرتے
اور عزم کار کی عمارتوں کو منہدم کرتے رہے یہاں تک کہ برق و خرمین کی یہ داستان
اتنی طویل ہو گئی کہ فاضل مصنف مسعود حسن رضوی ادیب اپنی اس تصنیف کی اشاعت
کی حسرت لیے ہوئے عالم ناپائیدار سے کوچ کر گئے - آج جب کہ اس کتاب کے
اجراء کا وقت آیا ہے تو

اُس قدر بے شکست و آس ساقی ناماند جیسی کیفیت گرد پیش پر چھائی ہوئی
نظر آتی ہے - اس غم ناک فضا میں اطمینان کی روشنی صرف اس یقین کی صورت میں
بھللا رہی ہے کہ عالم فانی میں نقش باقی کے لیے جس سامان کی ضرورت ہوتی ہے اسے
مسعود حسن رضوی اپنی کتاب کی صورت میں فراہم کر گئے ہیں - مجھے یقین ہے کہ ان کی
روح اس کامیابی کو دیکھ کر خوش ہو رہی ہوگی -

مقبول احمد لاری

صدر آل انڈیا میڈیکل اکاڈمی

لکھنؤ

۱۹ دسمبر ۱۹۷۶ء

Danish Mahal
Book Sellers
Aminuddaula Park
LUCKNOW-18

